تاریخ تمدن

یعنی

سرہنری طامس بکل کی مشہور تصنیف "ہسٹری آف سویلزیشن" کا ترجمہ

جسکو

مرحوم ومغفور منشی محمد احمد علی صاحب بی، اے - ایل، ایل، بی - کاکوروی - وکیل بارہ بنکی نے

حسب فرمایش "انجمن ترقی اُردو" نہایت قابلیت سے

باضافۂ دیباچہ وحواشی ودیگر امور ضروریہ

مرتب کیا تھا -

باہتمام اسحاق علی علوی کاکوروی

الناظر پریس واقع چوک لکھنؤ میں طبع ہوئی ۱۳۳۵

بار دوم   سنہ ۱۹۱۷ء   قیمت عہ/۳

مطبوعات انجمن ترقی اُردو

فلسفۂ تعلیم ہربرٹ اسپنسر کے متعلق یورپ و امریکہ کے ارباب علم کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ ارسطو کے بعد اس پایہ کا دوسرا شخص پیدا نہیں ہوا۔ یہ اُسی کی لاجواب کتاب کا نہایت اعلیٰ درجے کا ترجمہ ہے جس کے مطالعے سے مسئلۂ تعلیم پر نہایت صاف روشنی پڑتی ہے اور بڑی حد تک اس منزل میں رہنمائی ہوتی ہے۔ قیمت ۱۲؍

الفوز الاصغر ترجمۂ فوز الاصغر (لابن مسکویہ) اس کتاب میں تین اہم مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا صانع عالم کا ثبوت نہایت فلسفیانہ دلائل سے، دوسرا مسئلہ نفس اور اُسکے ادراکات کے بیان میں، اور تیسرا اثبات نبوت میں ہے۔ اس میں مسئلہ ارتقا جو ڈارون کی تھیوری کہی جاتی ہے، موجود ہے۔ قابل دید کتاب ہے۔ قیمت ۱۲؍

رہنمایان ہند۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہندوؤں کا اصل مذہب کیا ہے اور اس میں ہر زمانے میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اسکے بعد سری کرشن جی، سدھارتھ، گوتم بدھ کی جامع و مقدس سوانحمری فلسفہ آموز تعلیمات و دیگر رہنمایان مثل شنکراچارج، رامانج، رامانند، گورکھ ناتھ، اور کبیر کے مختصر تذکرات و ملفوظات اور رامانند کے سرآوردہ مرید شعرائے باکمال یعنی سورداس، تلسی داس اور جے دیو کے حالات نہایت خوبی کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ قیمت عہ؍

نپولین اعظم۔ قیصر ولیم جو یورپ کی موجودہ مصیبتوں کا بانی سمجھا جاتا ہے اسی نامور فاتح اور شہنشاہ کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتا ہے جس کی مکمل سوانحمری دیکھنے سے انسان کے حیرت انگیز کمالات اور قابلیتوں کا کسی قدر اندازہ کیا جا سکتا ہے قیمت جلد اول عہ؍ جلد دوم ۱۲؍ جلد سوم ۱۲؍ جلد چہارم ۱۲؍ جلد پنجم ۱۲؍

اُمرائے ہنود۔ اس کتاب میں عہد مغلیہ کے ہندو علما، وزرا اکابر و مشاہیر عہدہ داران امرا کے مفصل حالات ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ کیسی مساوات برتی جاتی تھی۔ قیمت عہ؍

القمر میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے چاند کی حقیقت و ماہیت پر علم ہیئت و ریاضی کی رو سے بحث کی گئی ہے۔ جدید معلومات کے لحاظ سے یہ کتاب نہایت قابل قدر ہے۔ قیمت ۱۲؍

مطبوعات جدید

مبادی سائنس۔ اس کتاب میں حیوانات، نباتات، حجریات و معدنیات کے تمام ابتدائی مسائل نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہیں اور مولوی معشوق حسین خاں بی اے (علیگ) کا نام نامی اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ کتاب کے مطالب نہایت آسانی کے ساتھ ذہن میں آ جائیں گے۔ قیمت مجلد ۱۲؍

فلسفۂ جذبات۔ علم النفس کے مضمون پر اُردو کیا معنی عربی فارسی میں بھی کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ حالانکہ معیشت کا یل کے جتنے عناصر و شعبہ جات ہیں سب کے لیے اس علم کی تحصیل لازمی ہے۔ نیز راز ہستی کے انکشاف میں سب سے زیادہ اسی علم سے مدد ملتی ہے۔ یہ کتاب اسی علم کے شعبۂ جذبات کے متعلق ہے جس کے مصنف ملک کے لائق انشا پرداز مسٹر عبدالماجد بی اے ہیں۔ آخر کتاب میں اس علم کے متعلق جس قدر اصطلاحات علمیہ بنائی گئی ہیں اون کی فرہنگ دے دی گئی ہے قیمت عہ مجلد عہ

طبقات الارض۔ مؤلفۂ جناب زاہدی خان صاحب کوکب۔ صاحب موصوف کی کتاب مقدمات الطبیعات کی طرح یہ کتاب بھی علم طبقات الارض میں اُردو کی پہلی کتاب ہے۔ جس میں نہایت وضاحت کے ساتھ اس علم کے تمام اصول و قوانین تازہ ترین تحقیقات کے بموجب لکھے گئے ہیں اور آخر میں نہایت قیمتی فرہنگیں اصطلاحات علمیہ اور ارضی مخلوقات کے اسما کی دی گئی ہیں۔ یہ اصطلاحات اکثر و بیشتر مولف کتاب کی وضع کردہ ہیں۔ قیمت ۱۲؍۔ مجلد ۱۲؍

دارالاشاعت انجمن ترقی اُردو۔ چوک۔ لکھنؤ سے طلب فرمائیے

۱۶۶

تاریخ تمدن

دیباچہ

ترجمۂ بکلز ہسٹری آف سویلزیشن

از شمس العلماء مولانا شبلی صاحب

جدید تعلیم یافتہ فرقہ کی نسبت عام شکایت ہے (اور وہ ناراض نہوں تو غالباً صحیح بھی ہے) کہ انمیں علمی مذاق نہیں پایا جاتا، مُلک میں جس قدر کثرت سے تعلیم یافتہ ہیں، اُس مناسبت سے تصنیفات و تالیفات کہاں ہیں؟ لیکن ہر کُلیّہ میں مستثنیات بھی ہوتے ہیں، اور یہ جو چند ارباب قلم مُلک میں نظر آتے ہیں۔ اُنہی مستثنیات کی مثالیں ہیں، اُنہی قابلِ قدر لوگوں میں ہمارے مرحوم مترجم بھی ہیں جنکی کتاب کا ہم ریویو کر رہے ہیں۔

مرحوم کا نام منشی احمد علی ہے، وہ کاکوری کے اُس مشہور خاندان کے ممبر ہیں جسکی تاریخ ابتداء سے آج تک ہمیشہ روشن اور نمایاں رہی ہے۔ اُنھوں نے بی۔ اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ ابتدا ہی سے وہ علمی مذاق رکھتے تھے، سب سے پہلے اُنھوں نے صحیفۂ زرّیں کی ترتیب میں شرکت کی، علمی مضامین بھی لکھتے رہتے تھے، لیکن ایک مستقل اور مشکل علمی خدمت جو اُنھوں نے اپنے ذمہ لی، وہ بکلز ہسٹری کا ترجمہ تھا، یہ وہ زمانہ ہے جب میں حیدرآباد میں تھا اور انجمن اُردو کا سکرٹری تھا۔ اُنھوں نے مجکو اپنے ارادہ سے اطلاع دی، اور چونکہ مجکو اُنکی

قابلیت پر اطمینان تھا، میں نے بہت مسرت سے اُن کے ارادے کا خیر مقدم کیا اُنھوں نے ترجمہ کا معتدبہ حصّہ میرے پاس بھیجا، اور میں نے اور احباب کی شرکت کے ساتھ اُس کا ایک ایک حرف پڑھا، اور اُن کی اجازت سے کہیں کہیں عبارت میں دخل و تصرف بھی کیا۔

کتاب کا موضوع اس قدر مشکل ہے کہ اسکے مطالب کا اُردو میں ادا کرنا نہایت دشوار ہے۔ اسی موضوع پر گیزو کی جو کتاب ہے اور بکل کی کتاب سے آسان ہے، اُسکا عربی مین ترجمہ ہوگیا ہے ہمنے اُس کتاب کو دیکھا ہے اور ہم کو بے تکلف کہنا چاہیے کہ ترجمہ کے فن مین ہمارے ہندی دوست نے مصری ترجمہ سے علانیہ بازی جیتی ہے۔

کتاب دو جلدوں میں ہے مرحوم نے پہلی جلد کے سات بابوں میں سے چھ کا ترجمہ کرلیا تھا ان میں سے دو باب کا ترجمہ اس وقت شایع کیا جاتا ہے، مرحوم نے کتاب پر ایک نہایت مبسوط مقدمہ لکھا ہے جس سے اُن کی قابلیت علمی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ بھی اس ترجمہ کے ساتھ ہے۔ باقی ابواب میں سے چھ باب کا ترجمہ تو خود مرحوم نے کرلیا تھا، ساتویں باب کا ترجمہ مرحوم کی یادگار میں اُن کے بعض اعزہ کر رہے ہیں، اور یہ سب ایک جُداگانہ حصّہ کی صورت میں شایع ہوگا، بشرطیکہ پہلے حصّہ کے شایع ہوجانے پر اس بات کا ثبوت مل سکے کہ قوم کا علمی مذاق ایسی خشک اور علمی تصنیفات کے خیر مقدم کرنے کے لیے طیار ہے۔

کتاب کے مصارفِ طبع کی مشکل، ہمارے آنریبل سر راجہ علی محمد خاں صاحب رئیسِ محمود آباد نے حل کی ہے جنکی فیاضیاں اس قسم کے کاموں میں ہمیشہ صرف ہوتی رہی ہیں۔

شبلی ۔ ۵ مئی سنہ ۱۹۰۹ء
لکھنؤ

تذکرۂ

ہنری ٹامس بکل مصنف کتاب

ہنری ٹامس بکل ۲۴ - نومبر ۱۸۲۲ء کو بمقام لی واقع کنٹ پیدا ہوا - وہ ایک دولتمند تاجر کا بیٹا تھا - اُسنے کسی قدر تعلیم اپنے گھر پہ پائی اور کسی قدر ڈاکٹر ہالوے کے اسکول گارڈن ہاؤس مقام کنٹش میں - چونکہ اُسکی صحت ناقص تھی اسلیے زیادہ عرصے تک وہ اسکول میں نہ رہ سکا لیکن طالب علمانہ حیثیت سے اُسکے ذاتی انہماک اور انتھک محنت نے جو کہ شوق تحصیل میں وہ کرتا رہا اُسکی ہر طرح کی باقاعدہ تعلیمی کمی کو پورا کر دیا - وہ اُن منتخب انسانوں میں تھا جنھوں نے اپنے ذاتی شوق و محنت سے کمالِ علمی حاصل کرنے میں اُن مزاحمتوں کا جو کہ اس تحصیل میں پیش آتی رہیں دلیرانہ مقابلہ کیا - اُسکے معاصرین میں ایک شخص بھی یورپ میں ایسا نہ تھا جس نے اُسکی سی اعلیٰ درجے کے علمی ذوق کے ساتھ زندگی بسر کی ہو وہ اپنی کمسنی ہی میں اپنے باپ کے کاروبار تجارت میں داخل کیا گیا لیکن اس کاروبار میں اُس نے کسی طرح کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا اور جبکہ اُسکی زندگی کے اٹھارھویں سال اُسکے باپ کی موت نے ایک وافر ذخیرہ دولت کا اُسکے لیے چھوڑا اور اُسے آزادی حاصل ہوئی تو اُسنے اپنی اس آزادی و اطمینان کو ذوقِ علمی کی نذر کر دیا - اُس نے شادی تک نہیں کی -

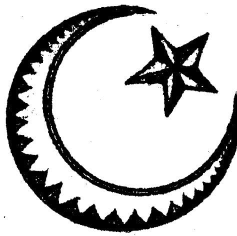
مشاغل تفریح میں سے جو مشغلہ اُسکے انہماکِ علمی میں ہارج ہوتا رہا وہ صرف شطرنج کا شغلہ

تھا جس مین اُس نے یہ قدرت حاصل کی تھی کہ سارے انگلستان میں وہ اسکے بڑے ماہروں میں تسلیم کر لیا گیا جب اُسکو یہ احساس ہوا کہ اسکی بدولت اُسکا وقت عزیز بہت ضائع ہوتا ہے تو اُس نے اُسکو قطعاً ترک کر دیا۔

اُس نے پہلے سے ایک ڈھانچہ اپنے علمی مشغلہ کا بنا لیا تھا وہ سوچے بیٹھا تھا کہ تمدن انگلستان کی تاریخ بالکل فلسفیانہ اصول پر مدون کیجائے اور اس کام کے لیے اُس نے اپنی زندگی کو وقف کر دیا اُس نے پورے طور پر ارادہ کر لیا تھا کہ اس مسئلہ کے تمام جزئیات جو تکملہ تاریخ کے ضروری عنصر ہیں نہایت وضاحت و بسیط سے دکھائے جائیں۔ اور سچ یہ ہے کہ اس اصول کے مدنظر رہنے سے یہ کتاب نہایت ہی مہتم بالشان اور بہت ہی اعلیٰ درجے کی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ وہ فقط دو جلدیں ختم کر سکا پہلی جلد ۱۸۵۷ء میں شایع ہوئی یہ جلد صرف ایک طرح کا توضیحی خاکہ تاریخ تمدن کا ہے۔ دوسری جلد ۱۸۶۱ء میں نکلی اس جلد میں تمدن انگلستان کے علاوہ اسپین و اسکاٹلینڈ کے تمدن سے بھی بحث کی ہے۔ اُسکا ارادہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمدن عامہ کے سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ اُن ممالک کے تمدن زیر بحث لائے جائیں۔ جنمیں موجودہ زمانہ کا تمدن پایا جاتا ہے جیسے انگلینڈ جرمن فرانس۔ اسپین۔ امریکہ۔ اسکاٹلینڈ۔ اُسکا منشاء تصنیف خاص خاص واقعات تاریخی یا حالات شخصی سے قطع نظر کر کے اس بات کا کھوج لگانا تھا کہ کسی قوم کی تاریخ کا ضروری عنصر کیا ہے اور متمدن اقوام کی ترقی یافتہ حالت کا اصلی گر کیا تھا۔ ادھر یہ دونوں جلدیں مطبع سے نکلکر منظر عام پر آئیں اور ادھر اہل علم میں ہلچل پڑ گئی۔ اسکے مطالب پر گو کہ بہت کچھ گفت و شنید ہوئی مگر یہ امر علی الاتفاق تسلیم کر لینا پڑا کہ اس فن کے متعلق اُسنے عجب طرح کا انوکھا دلیرانہ پن دکھایا ہے اور اس سے اُسکے اعلیٰ درجے کے مذاق علمی اور نازک خیالی کا پتہ ملتا ہے۔ ساتھ ہی اسکے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس تعصب سے خود وہ ہمیشہ نفرت ظاہر کرتا رہا اُس سے بھی وہ اپنے کو پورے طور پر محفوظ نہ رکھ سکا۔

اس نے ۱۸۶۲ء میں بمقام دمشق جہاں وہ بغرض حصول تندرستی گیا ہوا تھا انتقال کیا۔

ماخوذ از انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا و چیمبرس انسائیکلوپیڈیا۔



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وصلّی علیٰ رسولہ الکریم

مضامین تمہیدی

زمانۂ حال میں جس قدر کد و کاوش حالاتِ گزشتہ کی تحقیق میں کی گئی ہو اُس نے ایک گروہ کو فن تاریخ سے بدعقیدہ کردیا ہو۔ اس گروہ کی تسکین موجودہ کتبِ تواریخ سے نہیں ہوتی کیونکہ زیادہ سے زیادہ اُن سے صرف دو چار ہزار برس کے واقعات اور وہ بھی نامکمل اور غیر مسلسل طور سے معلوم ہوسکتے ہیں۔ یہ گروہ عالم اور ما فی العالم کی بابت تحریری داستانیں پڑھنا نہیں چاہتا کیونکہ لکھنے والوں کی معلومات ہی کچھ زیادہ اطمینان کے قابل نہیں بلکہ وہ خود اشیاءِ عالم کی زبانِ حال سے اُنکی رام کہانی سُننا چاہتا ہو۔ وہ کرم خوردہ کتابوں کی ورق گردانی کے بدلے بوسیدہ استخوانوں میں اپنی عقل و دانش کی روح پھونک کر اُنکی سرگذشت معلوم کرنے کا آرزومند ہو۔ وہ سلطنتوں کے حالات۔ بادشاہوں کے فتوحات اور وزیروں۔ سپہ سالاروں کے کارنامجات سے مطلق دلچسپی نہیں رکھتا اور اُنکی تحقیق و تفتیش محض تضیع اوقات سمجھتا ہے۔ اُسکے پیشِ نظر تماشاگاہِ عالم رہتا ہو جس میں سب انسان بازیگر ہوتے ہیں۔ اور وہ اس تماشاگاہ اور اسکے بازیگروں کے حال و قال

کا دلدادہ اور تماشائی ہوتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ یہ دنیا کیونکر پیدا ہوئی۔ اُسنے کتنے انقلاب دیکھے۔ انسان اس تماشاگاہ میں کب آیا اور کس حال سے آیا اور اُس نے وقتاً فوقتاً کیسے کیسے روپ بھرے اور کیا کیا کرتب دکھائے۔ ظاہر ہے کہ ان سوالات کے جواب میں مروجہ تاریخوں سے مدد نہیں مل سکتی یہ وہ باتیں ہیں جو تاریخ کی ہدایت سے بھی پہلے کی ہیں تاریخیں صرف عہد تاریخی کے واقعات بیان کرسکتی ہیں نہ کہ مقدم التاریخ کے کارنامے۔ پس۔ ان سوالات کے جواب اگر ملتے ہیں تو صحیفۂ فطرت کے مطالعہ سے۔ صحیفۂ فطرت ہی کا مطالعہ ہمکو اس مقولے کے معنی سمجھاتا ہے کہ "زبانِ حال فصیح تر ہے زبانِ قال سے" صحیفۂ فطرت ہی کی عینک سے ہر ذرے میں آفتاب اور ہر قطرے میں سمندر نظر آتا ہے صحیفۂ فطرت ہی کے مطالعہ نے یہ ہزار در ہزار علوم تجربیہ و حکمیہ کی بنیاد ڈالی ہے اور صحیفۂ فطرت ہی کا مطالعہ کرنے والا درخت کی ایک سبز پتی کو "دفترِ کردگار" کا ایک "ورق" سمجھتا ہے اور کھریا مٹی کے ایک ٹکڑے کو تاریخ کے ہزار صفحوں سے زیادہ معلومات بڑھانے والا ثابت کر دکھا سکتا ہے۔ افکارِ انسانی کی یہ ساری گُل تراشیاں اور بلند پروازیاں دنیا کی تمام بزم آرائیاں اسی صحیفۂ فطرت کے مطالعے کے بدولت ہیں۔ یہ خوش حال اور فارغ البال شہروں کی آبادیاں یہ تہذیب و شائستگی کی رنگ برنگ گلکاریاں ایک ادنیٰ کرشمہ ہیں صحیفۂ فطرت کے مطالعے کا۔ یہ بحر و بر میں بے خطر سیر و سیاحت اور یہ کوہ و جبل کی بے ضرر مساحت آسان ہے اسی صحیفۂ فطرت کے مطالعے سے قوموں نے اسی مطالعے کی مشق بڑھائی اور عروج پر پہونچیں۔ فتح و نصرت ہم رکاب ہوئی۔ اقبال سے بر و مند ہوئیں اور جب اُس سے مُنھ موڑا اقبال نے سازواری چھوڑی۔ تنزل نے مُنہ دکھایا ادبار میں گرفتار ہوئیں۔ تو اب اگر کسی کو نوع انسانی کی ابتدائی سرگزشت دریافت کرنا ہو تو وہ بھی اسی طرف رجوع کرے اور اگر اس کی ہمت یا فرصت نہ ہو تو اُن اہل تحقیق کے تصانیف پر نظر ڈالے جنھوں نے اپنی عمریں صحیفۂ فطرت کے مطالعے میں صرف کر ڈالی ہیں اور مقدم التاریخ عہد میں انسان کی جو حالت و کیفیت تھی۔ پھر جس طرح اُس کے معاملات بڑھتے

اور تعلقات روز بروز پیچیدہ ہوتے رہے۔ جن مدارج کو طے کر کے وہ شائستگی کی منزلِ مقصود تک پہونچا۔ اور جہاں جہاں وہ ٹھوکریں کھا کھا کے گرتا رہا اُن سب مراتب کی مفصل اور مشرح روئداد قلمبند کی ہے۔ آؤ۔ آج ہم بھی ذرا اس دفتر پارینہ کی کچھ ورق گردانی کریں اور اپنے ناظرین کو وہ داستان سُنادیں جو اب تک بہت کم کانوں نے سُنی اور بہت کم لوگوں نے سمجھی ہوگی۔ سب سے پہلے ہم تمدن کے مالہٗ و ما علیہ سے بحث کرتے ہیں۔

تمدّن کی تعریف

واضح ہو کہ یہ اصطلاح عام اُن قوموں کی حالت کے اظہار کے واسطے بولی جاتی ہے جو وحشیوں اور جنگلیوں کی بہ نسبت زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہیں۔ مثلاً ہم یورپ کی سربرآوردہ قوموں کو متمدن کہتے ہیں۔ چینیوں اور تاتاریوں کو کم متمدن سمجھتے ہیں اور امریکہ کے اصلی باشندوں اور اسٹریلیا والوں کو سب سے کم متمدن جانتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کیا شے ہے جو ان میں امتیاز پیدا کر رہی ہے۔ اور تمدن سے کیا مراد ہے؟۔

لفظ تمدن کے دو مفہوم ہیں۔ کبھی تو اُس سے عام طور پر انسانی ترقی مراد ہوتی ہے اور کبھی خصوصیت کے ساتھ بعض قسم کی ترقیاں۔ تمدن کا عام مفہوم یہ ہے کہ جب ہم کسی ملک یا قوم کو زیادہ ترقی یافتہ یا انسانیت اور سوسائٹی کی مخصوص شانوں میں زیادہ سربرآوردہ دیکھتے ہیں یا منزلِ کمال و تکمیل میں بہت آگے بڑھا ہوا۔ زیادہ خوش و خرّم۔ زیادہ پاک و صاف۔ اور زیادہ زیرک و دانا پاتے ہیں تو ہم اُسے متمدن کہتے ہیں۔ اس حالت میں تمدن کی اصلی معیار انسان کی ایک عمومی ترقی ہوتی ہے۔ لیکن تمدن کا خاص مفہوم یہ ہے کہ اُس سے صرف ایک قطع خاص کی ترقی مراد لی جائے جیسے وحشیوں اور جنگلیوں کے مقابلے میں ایک دولتمند اور زبردست قوم متمدن سمجھی جاتی ہے۔ جب اس مفہوم میں یہ لفظ بولا جاتا ہے تب تمدن کو صرف محاسن پر محدود نہیں کرسکتے بلکہ اُس کے مختلف اجزا پر نظر ڈال کے اُس کی خرابیاں اور صعوبتیں بھی بیان کرسکتے ہیں۔ اسی مفہوم کے لحاظ سے یہ مسئلہ زیر بحث ہے

کہ بہ ہیئت مجموعی تمدن کوئی اچھائی ہے یا بُرائی یا یہ کہ اُس کے محاسن اُس کے معائب پر غالب ہیں یا نہیں۔ اور غالباً اب کسی کو اسکے تسلیم کرنے میں تامل نہ ہوگا کہ تمدن خود ایک خوبی ہے اور بہت سی خوبیوں کا سبب اصلی ہو بلکہ کوئی خوبی ایسی نہیں جس سے وہ ربط نہ کھاتی ہو۔

اس موقع پر ہم لفظ تمدن کو صرف اُنھیں محدود معنوں میں استعمال کرینگے۔ یعنی اُن معنوں میں نہیں جن میں کہ وہ ترقی کا مرادف ہے بلکہ اُن معنوں میں جن میں کہ وہ عکس مقابل ہے وحشیانہ پن اور اُجڈپن کا۔ وحشیانہ زندگی کی خصوصیات چاہے کچھ ہی ہوں اُنکے مقابل خصوصیات یا یوں سمجھو کہ وہ صفات جنھیں سوسائٹی اپنے جامۂ وحشت کو اُتار کے اختیار کرتی ہے اُنھیں سے تمدن ترکیب پاتا ہے۔ مثلاً ایک وحشی جرگے میں نفس چند ہوتے ہیں اور وہ بھی) ایک بڑے قطعۂ ارض پر پاخانہ بدوش پھرا کرتے یا پراگندہ رہتے ہیں۔ اور اس وجہ سے غیر متمدن سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن انھیں کے مقابل ایک گنجان آبادی جو اپنے مقررہ مسکنوں میں بود و باش رکھتی اور تعداد کثیر کے ساتھ قصبات یا شہروں میں یکجا رہتی ہو اُسے ہم متمدن کہتے ہیں۔ وحشیانہ زندگی میں تجارت۔ صنعت و حرفت اور زراعت کے مشغلے یا تو ہوتے ہی نہیں یا ہوتے بھی ہیں تو ایسے بے اصول کہ اُنکا عدم و وجود برابر ہوتا ہے اب جو ملک زراعت۔ تجارت اور صنعت و حرفت کے ثمرات سے مالا مال ہو وہ متمدن کہلائیگا۔ وحشی جرگوں میں ہر شخص اپنے واسطے آپ محنت و مشقت کرتا اور اپنے قدحے کی خیر مناتا ہے اور بجز شاذ و نادر جنگ و جدل کے موقع کے (اور اس وقت بھی ناقص طور سے) ہم انھیں متعدد افراد کے باہمی اتحاد و اتفاق کے ساتھ کوئی مشترک مہم سر کرتے یا عام طور سے انھیں ایک دوسرے سے مختلط اور گرم صحبت رہ کے خوش ہوتے نہیں دیکھتے ہیں۔ پس اسکے مقابل جب ہم کو بنی آدم کی ایک بڑی تعداد کسی غرض مشترک کے واسطے مصروف بیکار یا باہمی معاشرت میں ایک دوسرے سے مِل جُل کے بشاش بشاش نظر آتی ہے تو ہم اُسے متمدن کہتے ہیں۔ وحشیانہ زندگی میں کسی قانون۔ نظم و نسق اور داد رسی کا یا تو وجود ہی نہیں ہوتا یا

اگر ہوتا بھی ہے تو بہت ہی کم۔ اور اس غرض سے کہ اشخاص منفرد ایک دوسرے کی آزار رسانی سے محفوظ رہیں سوسائٹی کی متفقہ قوت باقاعدہ طور سے صرف میں نہیں آتی بلکہ ہر شخص اپنے قوتِ بازو یا اپنی چالاکی پر بھروسا رکھتا ہے اور جب اس سے کسی موقع پر اُسکا زور نہیں چلتا تو اُسپر ایک بیکسی کی سی حالت چھا جاتی ہے۔ برخلاف اسکے جس جماعت میں سوسائٹی کا نظم اتنا کامل ہو جاتا ہے کہ اُس جماعت کی متفقہ قوت سے ہر ایک فرد کی جان و مال محفوظ اور امن و امان قائم رہتا ہے یعنی یہ کہ جس سوسائٹی میں اشخاص کی کثیر تعداد اس بات پر تیار رہتی ہے کہ اپنی حفاظت کے لیے صرف معاشرتی انتظامات پر تکیہ کرے اور معمولی حالات اور اکثر اوقات میں اپنے اغراض کی حمایت (خواہ حملہ کرنے یا حملہ روکنے) کے لیے اپنی ذاتی قوت یا شجاعت سے کام نہ لے تو ہم اُس سوسائٹی کو متمدن کہیں گے۔

اب جو ہم تمدن کی جچی ہوئی حد کی تلاش کرتے ہیں تو مختلف خیالات ہمکو آ گھیرتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں بہت سی پیچیدگیاں ہیں۔ حقیقت میں اس لفظ کا اصلی اشتقاق اطوار انسانی کی اُس شائستگی پر دلالت کرتا ہے جو شہر کے رہنے والوں کو اپنے خصائص میں دیہات والوں سے ممتاز کرتی ہے۔ کیونکہ تمدن ماخوذ ہے مدنیت سے۔ لیکن اس لفظ کا استعمال اس حد سے بہت متجاوز ہو گیا ہے۔ گیزٹ نے جو تعریف بیان کی ہے وہ عام طور سے مشتہر ہو گئی ہے اور اُسکا منشا یہ ہے کہ ہم تمدن کے تحت میں اُس ترقی کو داخل کر سکتے ہیں جو انسان نے منفردہ اور متحدہ حالت میں کی ہے۔ لیکن اس میں اصلی دقت یہ ہے کہ لفظ ترقی کی بابت قطعی فیصلہ ہونا چاہیے کہ اُس سے کیا مراد ہے۔ کیونکہ ترقی کے مفہوم میں اسقدر اختلاف آرا ہے کہ اُسکی وجہ سے تمدن کی خوبیوں اور خرابیوں کی دو مختلف جہتیں زیر بحث آ گئی ہیں اور اب یہ مشکل پڑ گئی ہے کہ خوبیوں کو خرابیوں سے کیونکر ممتاز کریں۔

یہ مسئلہ یوں حل ہو جاتا ہے کہ ہم ترقی کے دو درجے قرار دیں۔ ایک وہ جسے انسان اپنے جد و جہد سے طے کرتا ہے اور دوسرا وہ جسکا طے کرنا اُسکے پیش نظر اور مرکوز خاطر ہوتا ہے*

* حاشیہ کے لیے صفحہ ۱۱ ملاحظہ ہو۔

ہمارے کل ایجادات و انکشافات اور ہمارے تمام جدید انتظامات جو زندگی کے ہر شعبے میں ہم نے کیے ہیں اُنکا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمکو وحشیانہ حالت سے بالا اور پھر بالاتر مرتبے پر پہونچا دیں۔ اس مقصد کے وجود سے تو کوئی بھی انکار نہیں کرتا۔ البتہ جو کچھ گفتگو ہو سکتی ہے وہ اس بارے میں کہ جسقدر جدت طرازیاں انسان نے کی ہیں اُن میں سے کوئی ایک بھی اصلی ترقی کی حد تک پہونچی بھی ہے کہ نہیں۔ اب اگر ہم تمدن کے لفظ کو مجملاً اُن انقلابات اور تبدیلیوں میں محدود کر دیں جو انسانی زندگی میں اس غرض سے کی گئی ہیں کہ انسان ترقی کے اوجِ کمال تک پہونچے تو اسکی تعریف ایک حد تک قابل تسکین طور سے ہوئی جاتی ہے لیکن ترقی اور اصلی ترقی کا مفہوم اُسی طرح منشاء نزاع اور محل اختلاف باقی رہا جاتا ہے جیسا کہ تھا۔ بہر نوع سر دست ان اختلافات سے قطع نظر کر کے نفس تمدن کو اسی طرح سمجھا سکتے ہیں کہ سب سے پہلے وہ اشیاء خارجی جنکا کچھ تعلق انسان کی بقاء نسل اور نمو جسمانی یا اُسکی فلاح و شادمانی سے ہے اور جنکے وجود میں انسان کی کسی کوشش و تدبیر کو کچھ دخل نہیں اُنکو تمدن کی تعریف سے خارج کر دینا چاہیے کیونکہ وہ فطری بہبودی (جیسے سرزمین یا آب و ہوا یا کسی نسل کی اذہان و ابدان کی قوت) یا وہ اتفاقاتِ تقدیر جو ہماری کوششوں کے لیے سازوار ہو جاتے

۱۵ قریب قریب کل متمدن قدیمی قوموں کی تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جب اُنھوں نے فلسفہ و حکمت کے خزانوں پر دسترس پا لیا تو اُنھوں نے انسان کی ترقی کی انتہائی منزل یہ قرار دی کہ وہ ملکوتی صفات حاصل کرے اُنکے پیش نظر صرف یہی بات تھی کہ انسان کے اخلاق مقدس پاک و پاکیزہ ہو جائیں کہ اُس میں جو حیوانی خواہشات اور بہیمی صفات ہیں وہ نیست و نابود ہو جائیں اور اُسکی روح ملکوتی صفات سے متصف ہو کے اذیت کے ساتھ مداج تقرب حاصل کرے۔ آجکل کے زمانے میں اہل مغرب کے تمدن کی غایت صرف اسی عالم اجسام میں انسان کی قوتوں کا اس قدر ترقی کرنا ہے کہ عالم و ما فی العالم اُس کا مسخر ہو جائے۔ اس وجہ سے بجاے اخلاق کی ترقی کے صرف علم کی ترقی کا ہر طرف چرچا ہو رہا ہے۔ اگلے زمانے میں تحصیل علم کا مقصد بھی صرف تکمیل نفس تھا۔ آج کل کے زمانے میں سود مندی کا خیال سب سے مقدم سمجھا جاتا ہے۔

ہیں یا اشخاص کی وہ پیدائشی چستی و چالاکی یا ہنرمندی جسے کوئی اپنے میں پیدا نہیں کرسکتا ہرگز تمدن کے اجزا نہیں ہوسکتے اور اسی طرح بداہتہً وہ مسرت وشادمانی بھی تمدن میں داخل نہیں جو بعض اوقات ادنیٰ درجے کے غیر متمدن لوگوں میں پائی جاتی ہے اور اعلیٰ درجے کے متمدن لوگوں میں مفقود ہوتی ہے۔ بلکہ انسان کی زندگی کے سامانوں اور انتظاموں میں خود اسکے قوائے ذہنی کی مدد یا اسکے دست و بازو کی کوشش سے جو پائدار اور مستقل تبدیلیاں کی جاتی ہیں وہی انسانی تمدن کو ترکیب دیتی ہیں تو گویا تمدن اُس فلاح اور مسرت کا جس سے ہم بہرہ اندوز ہوتے یا لطف اُٹھاتے ہیں وہ نصف حصہ ہے جسے ہم نے خود بنایا اور اپنی جد وجہد سے حاصل کیا ہے۔ ہم کو فطرت نے بہت کچھ عطا کیا ہے لیکن ان فطری عطایا میں تصرفات کرکے بہت کچھ نعمتیں خود ہمارے کارگزار قوے ہمارے لیے مہیا کرتے ہیں تو اُس حساب سے ہماری ذہانت اور طباعی سبب ہے اور تمدن اُسکا نتیجہ۔ ہماری سعی و کوشش علت ہے اور تمدن معلول۔

ارکان تمدن جب تمدن کی عام تعریف یہ قرار پائی تو اُسکی حدگانہ شاخوں کا بیان کرنا گویا تمدنی زندگی کے ارکان کا بیان کرنا ہوگا۔ انکو ہم مختصر طور سے مندرجۂ ذیل عنوانوں کے تحت میں بیان کرسکتے ہیں۔

(ا) فنون حرفت و شفقت۔ یعنی وہ حکمتیں جن سے اسلیے کام لیتے ہیں کہ دنیا کے مادی سامان اور کارپردازوں کو ہم اپنے مفید مطلب بنا سکیں۔ غالباً اس بارے میں کسی کو بحث نہ ہوگی کہ ان سے اصلی ترقی کی بنیاد پڑتی ہے۔

(ب) گورنمنٹ یا پولیٹکل بند و بست کا طریقہ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں نہایت زور کے ساتھ اسکا یقین ہوتا ہے کہ تمدن اور ترقی مطلق کوئی امتیازی امر ہے۔ یعنی وہ ترکیبیں جو حصول ترقی کے واسطے اختیار کی جاتی ہیں اُن میں اور واقعی ترقی میں بڑا فرق ہے۔

(ج) باہمی میل جول کے بڑھانے والے فنون۔ جن میں سلسلۂ آمدورفت اور رسل و رسائل اور مجامع عام کے اجتماع کے آئین و ضوابط داخل ہیں اور نیز زندگی کے دیگر آداب۔

(د) تہذیبِ اخلاق کا جو دستور العمل کسی جماعت میں مسلّم ہوتا ہے وہ بھی اُسکے تمدن سے واسطہ رکھتا ہے لیکن اس بارے میں بھی جب ہم مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں اور قرنوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو بڑا اختلاف رہا ہے پاتے ہیں حقیقت میں اخلاق کم وبیش مذہب کا ایک جزو رہا ہے اور مذہب کو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ صرف متمدن گروہوں سے واسطہ رکھنے والا ہے۔ چاہے اُسے لوگوں نے خود ایجاد و اختراع کیا ہو چاہے مافوق الفطرۃ رسالت نے قائم کیا ہو۔ بہرحال کُل مذاہب میں ایک جزو ایسا ضرور شامل ہوگیا ہو جو بالکل انسان کا ساختہ و پرداختہ ہے اور اُسکا معیار یہی ہے کہ وہ کس قدر انسان کی فلاح و بہبود کے ترقی دینے پر سوسائٹی کے دیگر انتظامات کی طرح مائل ہے۔

(ہ) سائنس (علوم تجربیہ) تمدن کا یہ جزو ترکیبی ایسا ہی جسکے بابت بہت ہی کم اختلاف و مناقشہ ہے۔

(و) لٹریچر (علوم ادبیہ) اور فنون لطیفہ۔ یہ بھی انسانی تمدن کے اجزا ہیں۔ لیکن یہ ایک جدید مجموعہ ہے اُن تفریحوں اور مسرتوں کا جو صرف حواسوں کی خستگی مٹانے اور تسکین و تسلی حاصل ہونے کے لیے پر مستزاد کی گئی ہیں اور انکی نوعیت اس طرح ہے کہ اُن سے بڑے بڑے گروہ ایک ساتھ حظ اُٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ ان سے جو نتائج پیدا ہوتے ہیں اُنکا مقصد انسان کے مایحتاج کو فراہم کرنا نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے بجائے رشک و رقابت کے جو کھانے پینے۔ مال و دولت۔ اور اقتدار و قوت کی کوشش اور کشاکش کے لیے لازمی ہیں یہ فنون نفسیہ باہمی معاشرت اور ابنائے جنس میں صلۂ رحم اور ہمدردی کو بڑھانے والے ہیں۔ مثلاً فن تعمیر۔ فن نقاشی و مصوری۔ فن شاعری اور فن موسیقی میں جس قدر اضافہ کیا جاتا ہے وہ نتیجہ ہوتا ہے انسانی ذکاوت طبعی کا اور اُسکا مقصد انسان کو راحت و مسرت پہونچانا ہوتا ہے۔ لیکن اس نتیجے کے لازمی ہونے پر عام اتفاق آرا نہیں ہے کیونکہ بعض اقسام فنون صنعت و حرفت پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ نفس کے گندہ کرنیوالے[1] ہیں۔ سبب

[1] اسی لیے علماے مشرق نے انھیں فنون میں سے بعض کو شریفہ کے ساتھ متصف کیا ہے اور بعض کو کثیفہ کے ساتھ

بہ حالتِ مجموعی یہ رائے صحیح ہے کہ ایسے فنون میں بہت زیادہ انہماک انسانی طبیعت کے اُس ٹھیک موازنہ کو معرضِ خطر میں ڈالدیتا ہو جو زندگی کے اہم مقاصد کے واسطے لازمی ہے۔

مندرجۂ صدر بیان سے یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ تمدن کی تعریف کیونکر کرنا چاہیے اور کن اجزائے ترکیبی سے وہ مرکب ہوتا ہے۔ اب ہم اُن ثمراتِ تمدن پر نظر ڈالتے ہیں جو ترقی کرنے والے تمدن کے نہایت نمودار نتائج ہیں۔

ثمراتِ تمدن تمدن کا سب سے بڑا ثمرہ یہ ہے کہ قوت اور اقتدار اشخاص منفرد اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر جمہور عوام کے ہاتھوں میں پہونچ جائے اور روز بروز عوام الناس کا زور بڑھتا اور افراد واحد کا زور گھٹتا رہے۔ تمدن کی فطری ترقی سے ایک شخص واحد کی قوت۔ دباغت اور اہمیت بمقابلہ جمہور کے بہت یا ذ بے حقیقت ہو جاتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نوعِ انسانی میں اقتدار اور قوت کے حاصل ہونے کے دو ابتدائی سبب ہیں۔ اولاً جائداد اور دولت اور دوسرے نفس کی وہبی قوتیں اور کسبی کمالات۔ اور یہ دونوں تمدن کی بالکل ابتدائی حالت میں صرف چند افراد خاص کے قبضے میں ہوتی ہیں۔ سوسائٹی کے اوائل حال میں جمہور عوام بالکل پستی اور کمزوری میں ہوتے ہیں اور انکی قوت کا وجود بھی نہیں ہوتا کیونکہ دولت اور نیز ذکاوت صرف ایک قلیل حصۂ جماعت میں محدود ہو جاتی ہے اور اُس حلقے کے باہر اُسکا پتہ نشان بھی نہیں ہوتا۔ اگر کہیں طبقۂ عوام میں تھوڑا بہت اُس کا وجود ہوتا بھی ہے تو چونکہ عوام الناس متحد ہو کے کسی کام کے سرانجام دینے کی قابلیت نہیں رکھتے اس لیے اُن لوگوں کے مقابلے میں جو بڑے حصہ کا اجارہ لیے ہوتے ہیں نہ اُنکا بس چلتا ہے نہ وہ سر اُٹھا سکتے ہیں اور اس وجہ سے باوجود تھوڑی بہت دولت یا ذکاوت کے وہ کسی ایسے درجے پر نظر نہیں آتے جس سے اُنکے طبقے والے کچھ عمدہ حالت میں سمجھے جا سکیں۔ اب یہ تمدن کا کام ہے کہ وہ عوام الناس کے زور کو بڑھائے اور بجائے افراد واحد کے عام

جماعت کو قوی و مقتدر بنائے۔

دوسرا بڑا ثمرہ تمدن کا یہ ہے کہ وہ متفرق افراد کا ایک مجموعہ تیار کرے اور اُس مجموعے کو متحد کرکے اُسے با اثر بنائے۔ اگر تم ایک وحشی کی حالت پر نظر کروگے تو تم کو معلوم ہوگا کہ اُسے جسمانی قوت بھی حاصل ہوتی ہے۔ اُس میں دلیری و مردانگی بھی پائی جاتی ہے اور ہمت و عزیمت بھی۔ اکثر اوقات وہ ہوش و گوش بھی رکھتا ہے اور اپنے نفع و نقصان اور سود و زیان سے بھی باخبر رہتا ہے لیکن باوجود اسکے اُسکی اُس حالت میں کوئی خامی اور کوئی کمی ایسی ہوتی ہے کہ جسکے سبب سے کل وحشی جرگے غریب اور کمزور ہوتے ہیں۔ وہ کمی کیا ہے؟ وہی ہے جس کے سبب سے شیر اور بھیڑیے (باوجود قوت و قدرت) ہمیشہ سے نوع انسانی کو نیست و نابود کردینے میں قاصر رہے۔ یعنی اُن میں متحد ہوجانے کی قابلیت کا نہ ہونا۔ یہی ایک کمی ایسی ہے جو اِن وحشیوں کو افلاس میں رکھتی اور زور پکڑنے نہیں دیتی ہے۔ یہ صرف متمدن اشخاص اور مجموعۂ اشخاص کا کام ہے کہ وہ متحد ہو سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر ایک اتحاد میں ایک سمجھوتا ہوتا ہے۔ یعنی ایک غرض مشترک کے واسطے اپنی نفسانی خواہش کے ایک حصّے سے درگذر کرنا ہر ایسے شخص کے واسطے ضروری ہوتا ہے جو باہم سمجھوتہ کرنا چاہتا ہے۔ چونکہ ایک وحشی یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ کسی غرض کے واسطے بھی اپنے حظِ نفس سے درگذر کرے۔ نہ اُسکے معاشرتی جذبات کبھی عارضی طور سے بھی اُسکی نفسانی خواہشات پر غالب آسکتے ہیں نہ اُسکے رجحانات طبعی اُسکی انجام بینی کی وجہ سے گھٹ بڑھ سکتے ہیں۔ عاقبت اندیشی وہ نہیں جانتا۔ جبر نفس کے فوائد کی اسے خبر نہیں ہوتی۔ پس وہ بات جو دوسرے کی رضا جوئی کے واسطے ضروری ہوتی ہے اُسکے دل سے دور رہتی ہے۔ یہی حالت جو فرداً فرداً ہر ایک وحشی کی ہوتی ہے اُن کے مجموعے کی بھی ہوتی ہے۔ پس جس قدر کوئی گروہ وحشت سے قریب تر ہوتا ہے اُسی قدر وہ متحد ہوکے کام کرنے سے دور تر رہتا ہے۔ چنانچہ غیر متمدن قوموں کے حالات سے اُس کا بیّن

ثبوت ملتا ہے۔ کیونکہ غیر متمدن اقوام کبھی جنگ جدل میں متمدن قوموں سے سبقت نہ لیجا سکیں۔ اور ہمیشہ اُنکے مقابلے میں زک اُٹھاتی اور شکست کھاتی رہیں۔ اور سوا متمدن قوموں کے اور کسی قوم میں اتحاد و اتفاق کی شان پیدا نہ ہوسکی۔ دور کی مثالوں کو کیوں لو۔ ہندوستان ہی کی دیسی ریاستوں کو دیکھو کہ اُنھیں منفردہ حالت میں ایک ایک کرکے انگریزی قوم نے (بہ سبب اپنے افضل تمدن کے) فتح کرلیا۔ اور جس وقت فرانس نے ٹرکی پر حملہ کرنا چاہا اُسی وقت ٹرکی نے (جو تمدن کے لحاظ سے فرانس کا ہم پلہ تھا) روس سے صلح کرلی۔ اسی طرح وہ فتوحات جن کے واسطے ایک دوسرے سے آزاد افراد کی جماعت کثیر کے بہ رضامندی متحد ہونے کی ضرورت ہوتی ہے ہمیشہ اُن قوموں کے سوا جو اعلیٰ درجے کی متمدن تھیں اور قوموں کے ہاتھوں ناکام رہیں۔ پس نہ صرف افراد میں بلکہ اقوام میں بھی کسی بڑی مہم کے سر کرنے یا کسی زبردست حریف سے سر بر ہونے کے واسطے تمدن اور اعلیٰ درجے کے تمدن کی ضرورت ہے۔ اور اقوامِ عالم کی تاریخ اسپر شاہد ہے کہ جب دو ملکوں یا قوموں میں باہم مقابلہ یا مجادلہ ہوتا ہے تو فتح کا سہرا اُسی کے سر رہتا ہے جو بلحاظِ تمدن فائق ہوتا ہے۔ یہ ملکی اور قومی مہمیں تعدادِ افراد کے تناسب سے طے نہیں ہوتیں، بلکہ اُن افراد کی نسبتی قابلیت (باہم) میں باہم متحد ہوجانے اور اپنی مشترکہ غرض پر اپنے ذاتی خواہشات کے فدا کرسکنے کی صلاحیت سے تصفیہ پاتی ہیں۔

تمدن کی ابتدا تمدن کی ابتدا بیان کرنے سے پیشتر یہ امر تنقیح طلب ہے کہ خود انسان کی ابتدائی حالت کیا تھی اور اُس نے انفرادی اور مجموعی حالت میں کیونکر رفتہ رفتہ کرکے ترقی کی۔ اس بارے میں اہل یورپ نے جس قدر تحقیقات کی ہے اُسکے بیان کرنے کے واسطے اس مقام پر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ علوم حکمت کی تقسیم میں اس بحث کو کس علم سے سروکار رہے۔

تقسیم علوم

واضح ہو کہ علماے زمانۂ حال نے علوم کی جو تقسیم کی ہے اُس میں انسان کی بدایت کا حال انیتھراپالوجی (علم الانسان) کا موضوع قرار دیا ہے۔ یہ علم وہ ہے جو انسان کی تاریخ طبیعی (نیچرل ہسٹری) سے بحث کرتا ہے اور علوم کی عام تقسیم میں اس کا مرتبہ ذوالوجی (علم حیوانات) کی اعلیٰ ترین شاخ کے طور پر ہے۔ اور ذوالوجی خود بیالوجی (علم اشیاءِ ذی روح) کی اعلیٰ ترین شاخ ہے۔ اب انیتھراپالوجی کو متعدد ایسے علوم تجربیہ سے مدد ملتی ہے جو میدان علم میں برسرِ خود آزادی کا پھریرا بلند کیے ہوے ہیں۔ مثلاً اناٹومی (علم تشریح اعضا) اور فزیالوجی (علم حرکات و خواص اعضا) میں جسم انسان کی وضع و ہیئت اور اُنکے افعال و خواص سے بحث کیجاتی ہے۔ پھر سائکالوجی (علم النفس) کا کام یہ ہے کہ وہ نفس ذہن انسانی کے افعال و حرکات کی تحقیق کرتی ہے اور فائلالوجی (علم اللسان) زبان کے عام اصول اور اُن تعلقات سے بحث کرتی ہے جو مختلف اقوام و ممالک کی لسنہ میں ہوتی ہیں۔ اتھکس (فلسفۂ اخلاق) کا موضوع انسان کے فریضہ اور اپنے ہمجنسوں کے ساتھ معاملت کرنے کے آئین و ضوابط ہیں اور آخر میں سوشیالوجی (علم مجلس یا فن شائستگی) کے تحت میں علوم تجربیہ۔ علوم ادبیہ۔ فنون لطیفہ۔ اراد و خیالات۔ معتقدات۔ مراسم اور آئین و قوانین وغیرہ کی بدایت اور نشوونما پر غور کیا جاتا ہے۔ اور ان سب کی وقتاً فوقتاً ترقی کچھ تو براہ راست تاریخ کی شہادت سے نمودار ہے اور تاریخ کی حد سے آگے بڑھکے ہماری جو کچھ معلومات ہے وہ اُن قیاسات پر مبنی ہے جو زمانہاے قدیم اور قطاع دُور اُفتادہ کی یادگاروں پر لگائے گئے ہیں اور جن میں معنی پیدا نا علم طبقات الارض اور علم مقدم التاریخ آثار قدیمہ (یعنی وہ آثار و یادگار جو عہد تاریخ سے بیشتر زمانہ کی ہیں) کے محققین کا کام ہے۔

بدایت انسان

نوع انسان کی تاریخ لکھنے والے محققین میں جہاں اُسکی ابتداے آفرینش کے مسئلے پر بہید قیل و قال ہے وہاں اس مسئلے پر بھی کچھ اختلاف ہے کہ انسان کس حالت اور کس صورت سے پیدا ہوا۔ کن قواے عقلی و دماغی سے مرتب اور

مستقل ہو کے دنیا میں آیا۔ انسانی جماعتیں جو اب متمدن نظر آتی ہیں انکے تمدن کی تاریخ کب سے شروع ہوتی ہے۔ اور یہ وحشی جرگے جو آج بالکل غیر متمدن ہیں کیا یہ سدا سے ایسے ہی ہیں۔ کیا کبھی یہ اس سے بہتر حالت میں اور متمدن تھے اور اب ادبار میں پڑکے ایسے غیر متمدن ہوگئے ہیں یا یہ ہنوز اپنی بدو فطرت پر ہیں۔ آیا زمانۂ تمدن مقدم ہے یا زمانۂ وحشت اس مسئلہ میں دو فریق ہوگئے ہیں اور وہ اپنی اپنی جگہ پر جداگانہ فیصلے کرچکے ہیں۔ اور جس طرح بدایت انسان کے بارے میں فی الحال مسئلۂ ارتقا پر عام رائے مائل ہو رہی ہے اُسی طرح تمدن انسان کے بارے میں بھی ارتقا کا نظریہ بہت رواج پا رہا ہے۔

مسئلۂ ارتقا

انسان کی ابتدائی آفرینش کے بارے میں حکمائے متقدمین نے جو کچھ رائے قائم کی ہو اُس سے بحث نہیں۔ اُنیسویں صدی کے یورپ میں ڈارون نے جو نظریہ قائم کیا ہے اُسکا ماحصل یہ ہے کہ انسان ایک ترقی کردہ جانور ہے۔ اس نظریہ کو ایوولوشن تھیوری (نظریۂ ارتقا) کہتے ہیں۔ ڈارون اور اُسکے نقشِ قدم پر چلنے والے پروفیسر ہکسلے نے اس نظریہ کو نہایت زور شور اور دھوم دھام سے ثابت کیا ہے۔ اگرچہ ہنوز انکے دلائل تکمیل کو نہیں پہونچے ہیں اور سلسلۂ استدلال کی بہت سی کڑیاں علم انسانی کی موجودہ حالت کے لحاظ سے ثبوتِ مزید کی محتاج ہیں لیکن مدعیوں کو یہ دعویٰ ہے کہ جسوقت سائنس میں ترقی ہوگی اور انسان کا علم بڑھے گا اُسوقت وہ کڑیاں بھی ثبوت مزید کے ملجانے سے مضبوط ہوجائیں گی۔ سردست جسقدر دلائل پیش کیے گئے ہیں اُنکی آب وتاب نے اہل نظر کی نگاہیں خیرہ کردی ہیں اور عام طور سے یہی رائے مقبول ہو رہی ہے۔ اور نہ صرف بدایت انسان بلکہ تمدن کی ابتدائی نشوونما کے بارے میں بھی ترقی اور روزافزوں ترقی کا ہر شخص قائل ہو رہا ہے۔

تمدن کی ابتدا پر اختلاف

تمدن انسان کے بلے میں اہل تحقیق کے باہمی اختلاف نے جو مختلف دلائل وبراہین پیش کیے ہیں اُنپر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے تاکہ کوئی صحیح رائے قائم ہوسکے۔ اہل تحقیق میں ایک گروہ کی یہ رائے ہے کہ انسان کی ابتدائی

حالت جہالت و وحشت کی تھی۔ اور یہ کہ مرور ایام سے اُس نے ۔ رفتہ رفتہ تمدن کے مدارج طے کیے۔ اُنکے نزدیک انسان کی کُل تاریخ اُسکی ترقی کا ایک دَور ثابت کر رہی ہے اور اگرچہ بعض اوقات قرنوں اور صدیوں تک بعض قومیں ایک حالت پر ٹھہری رہیں یا پستی میں گرتی چلی گئی ہیں لیکن بحالت مجموعی نوع انسانی کی رفتار ہمیشہ ترقی کی جانب مائل رہی ہے۔ یہ گروہ نظریہ ہبوط کا مدعی ہے اور بجائے ترقی کے انسانی رفتار کو تنزل کی جانب مائل سمجھتا ہے۔ اسکے برخلاف محققین کے ایک گروہ کا خیال ہے کہ انسان ابتدائی حالت میں بھی بالکل ویسا ہی تھا جیسا اب ہے اور اگرچہ اُسوقت اُسے علوم حکمیہ اور فنون نفسیہ کا بالکل علم نہو لیکن اُسکے قوائے ذہنی و عقلی کسی طرح سے کمتر درجے کے نہ تھے اور اسی وجہ سے وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ زمانۂ موجودہ کے وحشی لوگ اپنے سے زیادہ متمدن لوگوں کی بگڑی ہوئی یادگار ہیں۔ چنانچہ اس فریق کے ایک بڑے حامی ڈیوک آف ارگائل کی یہ رائے ہے کہ "انسان اپنے نہایت اعلیٰ درجۂ تمدن اور شائستگی کی حالت میں بھی نہایت پستی اور تنزل میں پہونچنے کی استعداد رکھتا ہے۔ اُسکا علم زائل ہو سکتا اور اُسکا مذہب چھوٹ سکتا ہے" لیکن سرجان لیوبک (لارڈ آبری) دوسرے فریق کے زبردست وکیل کی رائے ہے کہ "بیشک شخصی حیثیت سے یہ رائے قابل قبول ہے لیکن نوعی یا جنسی حیثیت سے ہرگز تسلیم نہیں کی جاسکتی"۔ اُنکے نزدیک یہ رائے کہیں زیادہ معقول اور صحیح ہے کہ "اگر انسان کی پوری گذشتہ تاریخ پر ہم غور کریں جو آثار قدیمہ کی تلاش و تجسس اور تحقیق و تفحص کا نتیجہ ہے تو ہم اس بات کے دیکھنے میں قاصر نہ رہیں گے کہ اس سب سے یہی بات منکشف ہوتی ہے کہ ترقی کا ایک بہت بڑا منصوبہ تھا جو پورا ہوا ہے اور باوجود جزئی زوال اور انحطاط کے اُسکا مآل کار ایک دائمی و ابدی ترقی کُن تمدن اور انسان کے اعلیٰ اور پاکیزہ قویٰ کا بتدریج نشو و نما پا رہا ہے اور خدائے برتر کی قوت و شوکت۔ جبروت و عظمت اور حکمت و مصلحت کی ایک صورت مثالی ہمیشہ اُسکے پیش نظر رہی ہے"۔

بہرکیف نظریہ ہبوط کے حامی اس بات کو بہت بڑی دلیل سمجھتے ہیں کہ وحشیوں میں از خود ترقی کی جانب مائل ہونے کی کوئی خاص قوت نہیں ہوتی۔ اور نہ اس بات کا کوئی بین ثبوت ملتا ہے کہ اُنھوں نے کبھی از خود ترقی کی ہو۔ بعض قوموں کی ٹھہری ہوئی حالت دیکھتے ہوئے یہی سلسے صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اُن میں ترقی کا مادہ ہی نہیں۔ لیکن یہ ٹھہری ہوئی حالت نہ ترقی کا میلان ثابت کرتی ہے نہ تنزل کا۔ البتہ اسکے مقابل دوسرا فریق یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ جن مقامات پر وحشی قومیں آباد ہیں وہاں آثار قدیمہ کے محققین نے شدید کدوکاوش سے بھی کوئی ثبوت گذشتہ تمدن کا نہیں پایا۔ طبقاتِ زمین کھودے گئے۔ لیکن نہ وہاں ایسے حیوانات کی ہڈیاں ملیں نہ ایسے نباتات کا نشان نظر آیا جنھیں انسان اپنی تمدنی حالت میں پالتا پرورش کرتا یا بوتا لگاتا ہے۔ نہ وہاں ایسے ظروف نکلے جن سے پچھلی متمدن حالت کا کچھ کھوج ملتا۔ اور یہ ممکن نہیں معلوم ہوتا کہ کوئی قوم اپنے تہذیب و تمدن کے ساتھ برتن بنانا۔ درختوں کا لگانا اور جانوروں کا پالنا بھی بھول جائے۔ کیونکہ یہ ایسی روزمرہ ضرورت کی چیزیں ہیں جن کی ہمیشہ حاجت ہوا کرتی ہے۔ اور اُنکی ضرورت کا تقاضہ یہی ہے کہ وہ برقرار رہیں۔ اسی طرح سُوت کاتنا۔ کپڑے بُننا اور تیر و کمان استعمال میں لانا بھی ایسے کام ہیں جنکو کبھی کوئی قوم بھول نہیں سکتی۔ لیکن بہت سی وحشی قومیں ان کاموں سے ناواقف ہیں۔ اسی طرح بہت قومیں ایسی ہیں جن میں تعمیر عمارات کا کچھ خیال ہی نہیں اور بہت وہ ہیں جو بالکل لامذہب ہیں اور جنکی لامذہبی ایک قوی دلیل اُنکی اصلی اور جبلی وحشت کی ہے کیونکہ یہ کبھی خیال ہو نہیں سکتا کہ کوئی قوم مذہب ایسی دلکش اور دلنشیں چیز کو کبھی دل سے فراموش کردے۔ مذہب ہی وہ شے ہے جس سے انسان کے دل میں بیم و رجا کا مستحکم خیال پیدا ہوتا۔ نجات دائمی کا سبز باغ ہمیشہ پیش نظر رہتا اور نکوکاری کی طرف دل مائل ہوتا ہے۔ اُسکے عقائد دلنشیں ہوتے ہیں اور دکھ درد میں اُسکی تسکین کا مرہم اکسیر صفت ثابت ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اُسکی اسی دلکشی اور حیات بخشی کے سبب سے ایک گروہ ایسے لفظوں مددگار

حماقتیوں کا پیدا ہو جاتا ہے جو اُسکے نام پر اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے پھرتا اور اُسکے پیروؤں کی تعداد بڑھانے کے لیے سر کا پسینہ پانوں تک لاتا ہے۔

اب دیکھنے کی یہ بات ہے کہ آیا وحشی قوموں میں ترقی کی کچھ علامتیں ملتی ہیں یا نہیں۔ یہ بھید ہم کو مختلف سیاحوں اور دنیا کی سیر کرنے والوں کے اسفار و مشاہدات سے کھلتا ہے۔ ہمکو اسکی متعدد مثالیں ملتی ہیں کہ مختلف وحشی جرگے نئی نئی کارآمد باتیں سیکھنے لگے ہیں۔ بہتیرے جو فلزات کے استعمال اور قدر و قیمت سے ناواقف تھے اور جنکی ناواقفیت کو ایک سیاح نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا ایک زمانہ کے بعد فلزات کی قدر پہچاننے اور اُنھیں کام میں لانے لگے اور زمانہ مابعد میں دوسرے سیاحوں نے اسے معائنہ کیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہی کہ وہ ترقی کی جانب مائل ہیں۔

پھر مختلف وحشیوں کی زبانوں سے بھی اُنکی اصلی اور جبلّی وحشت اور استعدادِ ترقی کا ثبوت ملتا ہے اور اسی طرح اُنکے مختلف امور کی بابت اُنکی معلومات سے بھی۔ مثلاً اعداد و شمار کے معاملے میں بعض وحشی قبائل ایسے ہیں جنکے یہاں دس تک کی گنتی کے نام نہیں اور اکثروں کے یہاں بہتیری اشیا کا کوئی جنسی نام نہیں۔ جیسے مختلف جانوروں۔ رنگوں پھولوں اور پھلوں کے نام جُدا جُدا تو ہیں لیکن سب کو مِلا کے ایک لفظ سے نہیں پکارتے یعنی جانور۔ رنگ۔ درخت۔ پھول۔ پھل کے مقابل الفاظ نہیں جنسے مفہوم کلّی ادا ہو سکے۔

اب یہ بات بھی غور طلب ہے کہ بنی آدم میں بعض مراسم ایسے عالمگیر ہیں جن سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسانی طبیعت اُنھیں اضطراراً اختیار کیے ہوئے نہیں ہے بلکہ چونکہ وہ سب ایک مبدأ سے ظہور پذیر ہوئے ہیں اسلیے اُن مراسم کی پابندی اُنکی سرشت یا جبلت میں ہے مثلاً کسی کی چھینک پر یرحمک اللہ یا اسی کے ہم معنی الفاظ بولنے کی رسم بہت قدیم ہے اور نہایت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس سے کم از کم یہ بات تو ضرور ثابت ہوتی ہی کہ متمدن قومیں بھی کبھی اُس جہالت و وحشت میں رہ چکی ہیں جسمیں اُنکے بہتیرے ہمجنس اب تک مبتلا ہیں۔

صرف یورپ ہی میں نہیں بلکہ ارض یہودا۔ شام۔ مصر۔ اور ہندوستان تک میں عہد حجر[1] کی بہت سی نشانیاں اب تک قائم ہیں اور پتھر کے برتن اور چھری چاقو وہاں ہنوز مروّج ہیں مصریوں اور یہودیوں کے رُہبان و قسیس اب بھی پتھر کے چھری چاقو استعمال میں لاتے ہیں۔ اور یہ صرف اس وجہ سے کہ ایک زمانے میں یہی چیزیں اُنکے آبا و اجداد استعمال کرتے تھے کیونکہ اُسوقت فلزات کے ظروف و آلات کے تیار کرنے کا کسی کو خیال ہی نہ تھا۔ اب مرور ایام سے قدامت نے اس رسم کو تقدس کا لباس پہنا دیا ہے اور مقتدایانِ مذہبی کو اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ اس رسم دیرینہ کو چھوڑکے کسی بدعت کے مرتکب ہوں۔ اسی طرح عورتوں اور مردوں کے تعلقات اور رشتے ناتے کے خیالات کو ترقی ہوئی ہے جس قدر وسعت شایستہ قوموں نے ان معاملات کو دی ہے اور جیسی کچھ اصلاح اور ترمیم وقتاً فوقتاً اس بارے میں کی گئی ہے وہ خود کافی شہادت اس بات کی ہے کہ متمدن قومیں کسی بہتر حالت میں ترقی کرکے آئی ہیں۔

نظریۂ ہبوط کے حامی ڈیوک آف ارگائل کی رائے ہے کہ انسان کی ابتدائی حالت تہذیب و تمدن کی تھی۔ اُنکے نزدیک یہ قومیں جو آج وحشی اور غیر متمدن نظر آتی ہیں یہ اُن ذات برادری سے خارج کیے ہوے لوگوں کی اولادیں ہیں جنکو بوجہ اُنکے ادبار و نکبت کے لوگوں نے اپنے سے جدا کرکے جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف ہنکا دیا تھا۔ لیکن اس رائے پر یہ بہت صحیح اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اول تو عہد تاریخی کے شروع ہونے سے بھی کچھ مدت پیشتر تک یہی لوگ جو خارج البلد کہے جاتے ہیں تمامی امریکہ شمالی و جنوبی۔ شمالی یورپ۔ افریقہ کے ایک بڑے حصے۔ برِ اعظم اسٹریلیا۔ ایشیا کے ایک بڑے حصے اور بحرالکاہل کے خوشنما جزائر میں آباد تھے۔ یعنی دنیا کی آبادی میں بہت بڑا حصہ ایسے ہی وحشیوں سے بسا ہوا تھا اور بہت ہی تھوڑے حصے میں جا بجا آثار تمدن پائے جاتے تھے۔ جس سے ہرگز یہ قیاس نہیں ہو سکتا کہ متمدن لوگوں نے ان کو ذات برادری سے خارج کرکے نکال باہر کردیا اور انھوں نے جنگلوں اور پہاڑوں کو اپنا مسکن بنا لیا۔ دوسرے۔ یہ برِ اعظم جنکو اب انسان نے بنا سنوار کے آباد کیا ہی اُسوقت

[1] عہد حجر کا بیان آگے آویگا۔

بالکل اپنی بدو فطرت پر چھوٹے ہوئے تھے اور اُن میں کھلے میدانوں اور مرغزاروں کے رہنے والے زیادہ سے زیادہ زراعت و فلاحت کے درجہ تک ترقی کر سکتے تھے - برخلاف اس کے جنگلوں اور پہاڑوں کے بسنے والوں نے بہت کچھ بلند پروازی دکھائی ہے - امریکہ ہی کو دیکھو کہ سواحل امیزن اور مسیسپی کے باشندوں نے (با وجودیکہ وہ شاداب و سرسبز وادیوں میں رہتے تھے) کیا کیا اور مکسیکو اور پیرو کے جنگلوں اور پہاڑوں پر بسنے والوں کی ترقی کے سامنے اُن کا نام لیتے شرم آتی ہے - یورپ میں بھی اسکاٹ لینڈ کے دشت و جبل میں تمدن کی وہ چہل پہل رہی ہے جو کسی اعلیٰ سے اعلیٰ تمدن کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہے -

سر جان لیوباک لکھتے ہیں کہ میرا تو یہ یقین ہے کہ بڑے بڑے بر اعظم ایک نہ مانہ میں ایسے انسانوں سے رچے بسے ہوے تھے کہ جو زمانۂ حال کے بدترین غیر متمدن قوموں سے بہتر حالت میں نہ تھے اور اگرچہ مجھسے یہ بہت بعید ہے کہ میں اسکو تسلیم کر دوں کہ تمدن کے یہ مختلف مدارج جو پیش نظر ہیں اُنکی توجیہ و تشریح اسباب خارجی سے ہو سکتی ہے باانہمہ اتنا ضرور کہوں گا کہ جس قدر اختلاف و تنوع مختلف قوموں کی ترقی و تمدن میں نظر آتا ہے اُسکی کُنہ اس سے معلوم ہو سکتی ہے " اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ اُنکے نزدیک اس اختلاف مدارج سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نوعِ انسانی نے کس طرح بتدریج تمدن حاصل کیا اور اعلیٰ درجے کی متمدن قومیں کن کن درجات میں ہو کے عروج و سربلندی کی منزل تک پہونچی ہیں - پھر اسی مختلف قوموں کی حالت کے باہمی تقابل سے یہ بات بھی منکشف ہوتی ہے کہ کون قوم کس درجے سے کس درجے میں آئی ہے اور ترقی کر کے کس درجے میں پہونچنے والی ہے - یعنی یہ اختلاف مدارج تمدن کے اصلی اسرار سے ہم کو مطلع کرتا ہے اور قوموں کا ماضی و استقبال ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے -

اسکے مقابل میں فریق مخالف کے لوگ اُن غیر متمدن قوموں کو مثلاً مثالاً پیش کرتے ہیں جو دور دراز جزائر میں آباد ہیں اور اس سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ انکا ایسے مقام پر آباد ہونا ہی ایک دلیل اس بات کی ہے کہ وہ کسی زمانے میں مہذب اور متمدن تھیں - کیونکہ

اُن کا سات سمندر اُس پار ایسے مقامات پر جا کے رہنا اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ کسی وقت میں وہ جہازرانی کی کسی خاص صورت سے واقف و باخبر اور سمندروں کے پار اُترنے کے وسائل رکھتی تھیں۔ اس دلیل کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قطع نظر اسکے کہ زمین کی حالت میں جو تغیرات ازروے جیالوجی (علم طبقات الارض) ثابت ہوے ہیں اُنکے دیکھتے اس بات کے اور بھی بہت سے سبب نکل سکتے ہیں اور یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے انقلابِ عظیم یا تغیر ارضی سے وہاں پہونچ گئے ہوں یہ بات بہت زیادہ قابل لحاظ ہے کہ ایسے دُور افتادہ مقامات پر پہونچ کے وہ اس کارآمد فن (جہازرانی) کو کیسے بھولے اور کیوں اُنھوں نے اپنے تمدن کو خیرباد کہکے قطع علائق پر کمر باندھی اور اپنے کو بالکل سب سے الگ تھلگ اور بیواسطہ کر لیا اور کیوں ایک جزیرے کی سنسان اور وحشت خیز سرزمین کے ہو رہے۔ اور اب جو اُن میں جہاز چلانے یا اچھی کشتیاں بنانے تک کا رواج نہیں رہا ہے یہ حالت کیسے پیدا ہو سکی۔ حالانکہ اُنکی ضروریاتِ زندگی کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ اگر ان فنوں سے واقف تھے تو انھیں کبھی نہ بھولتے۔ پس اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اپنی کوشش اور تدبیر سے نہ سمندر پار اُترے نہ دُور افتادہ جزیروں میں از خود جا کے آباد ہوے۔

آخر میں ایک بہت زبردست دلیل نظریۂ ارتقا کے حامی یہ پیش کرتے ہیں کہ بالعموم غیر متمدن قوموں کے عادات و خیالات اور حرکات و سکنات بچوں کے سے ہوتے ہیں اور اس سے وہ یہ ثابت کرتے ہیں کہ نوعِ انسانی کی حالت طفولیت یہی ہے جسمیں ہم ان وحشیوں کو دیکھتے ہیں۔ مثلاً بعض وحشیوں اور جنگلیوں پہاڑیوں کا بچوں کی طرح کسی چیز کے سمجھنے کی زیادہ کوشش نہ کرنا بلکہ بہت جلد گھبرا کے اس کوشش سے باز رہنا یا زمانۂ موجودہ کے تھوڑے فائدہ کے آگے زمانۂ آیندہ کی بڑی امیدوں سے دست بردار ہو جانا۔ یا بے سوچے سمجھے اور بے عقل لڑائے محض خطرات قلب اور خواہش نفس پر کام کر بیٹھنا۔ ذرا میں ڈر جانا اور گھبرا اُٹھنا۔ یا ادنیٰ سے نقصان میں رو دینا یہ سب باتیں وہی ہیں جو عقل والے کے خام ہونے اور پختہ نہ ہونے کی نشانیاں ہیں

اور جس طرح بچوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جتنی زیادہ اُن کی عقل پختہ اور معلومات وسیع ہوتی جاتی ہے اُسی قدر یہ باتیں چھوٹتی جاتی ہیں ویسے ہی سوسائٹی کے عالمِ طفولیت میں غیر متمدن لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جتنا زیادہ حقائق دحواس اشیاء کا علم اُن میں بڑھتا ہے اُسی قدر اُن کی معاشرت اور تمدن میں ترقی ہوتی ہے۔ اور جس قدر اُن کے تجربہ کو وسعت ہوتی ہے اُسی قدر اُن کے باہمی معاملات اور تعلقات میں پختگی پیدا ہوجاتی ہے۔

تمدن کی بابت قطعی فیصلہ

مندرجۂ بالا دلائل سے بخوبی واضح ہے کہ جہاں تک قیاس کو دخل ہے یہی رائے بہت مدلّل اور مضبوط معلوم ہوتی ہے کہ نوعِ انسانی کی رفتار ترقی کی جانب ازل سے مائل رہی ہے اور اسی رائے پر زمانۂ حال کے محققین کا غلبہ ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا کے مؤلفین کی بھی یہی رائے ہے اور چونکہ وہ بکثرت ایسے دلچسپ واقعات ثبوت میں پیش کرتے ہیں جنکا پڑھنا فائدہ سے خالی نہیں اس لیے ہم اُنکا اقتباس ذیل میں درج کرتے ہیں۔

برٹانکا انسائیکلوپیڈیا کا خلاصہ

ابھی تھوڑا زمانہ ہوا جب تک یہ رائے بہت مقبول تھی کہ زمانۂ قدیم میں سوسائٹی کی حالت اب کے بہ نسبت کہیں زیادہ مہذب و شایستہ تھی اور جو لوگ اس رائے کے ماننے والے تھے وہ آفرینش انسان کی بدایت کو اُس وقت سے منسوب کرتے تھے جو تاریخی رودادوں اور آثاروں سے کچھ ہی پیشتر کا زمانہ تھا مگر فی الحال یہ رائے زیادہ دائر وسائر ہے کہ دنیا کا تمدّن ابتداءً ایک عہد حجر کے دورے سے ترقی پاکے بتدریج بڑھا ہے۔ اس رائے کے ماننے سے یہ لازم آتا ہے کہ مصر بابل۔ اور چین کے قدیم تمدن کے چار پانچ ہزار برس پر ایک معتدبہ زمانہ کو المضاعف کردیں کیونکہ یہ تو وہ زمانہ تھا جب ان ممالک کی واقفیت۔ فن کی صنائع وبدایع۔ اور اُن کے علوم وفنون نہایت ممتاز درجے پر بلند ہوچکے تھے۔ اس رائے کی صحت اُس وقت معلوم ہوتی ہے[1]

[1] واضح ہو کہ یہ مضمون انسائیکلوپیڈیا کے مختلف مقامات سے ماخوذ ہے۔

جب مختلف السنۂ عالم کا تقابل کیا جاتا ہے۔ مثلاً زبان عربی اور زبان عبرانی میں بہت قریبی تعلق ہے اور ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی ماخذ نہیں ہے بلکہ یہ دونوں کسی اور زبان کی دو شاخیں ہیں کہ جو دونوں کے بہ نسبت قدیم تر تھی۔ تو اب یہ سمجھنا چاہیے کہ عبرانی زبان کی جو تاریخیں اور سرگزشتیں ہیں اُن سے جس زمانے تک کے حالات کا پتہ چلتا ہے اُس (زمانہ) سے پیشتر کوئی ایک زبان ایسی موجود تھی جس سے صدیوں میں جا کے عبرانی زبان مشتق ہوئی ہوگی۔ اسی طرح اہل ہند۔ اہل میڈیا۔ اہل فارس۔ اہل یونان۔ اہل روم۔ اہل جرمن وغیرہ بھی نہایت قدیم زمانے میں صفحۂ ہستی پر یکے بعد دیگرے اسی طرح نمودار ہوے جیسے اُنکی زبانیں پیدا ہوئیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ اُس سے بھی قدیم تر زمانے میں یعنی اُس سے پیشتر کہ جب یہ قومیں جدا ہوئیں اور آریا قوم کے انتشار کے سبب مختلف اقطاع یورپ و ایشیا میں پہونچیں کوئی اور وحشی قوم موجود تھی جو ایک جُداگانہ زبان بولتی اور پولیٹکل اقتدار میں سربلند تھی اور اسکی آریا قوم قائم مقام ہوئی تھی کہ جو (فی الحال معدوم) آریا زبان بولتی تھی۔ پھر۔ اسی آریا زبان سے سلسلہ کے ساتھ ایسے رد و بدل سے جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا وہ زبانیں پیدا ہوگئیں جو تاریخ کے شروع زمانے تک باہم کر غیر مانوس تھیں اور جن کے درمیان ایسا نازک تعلق ہے کہ اُسے نہایت ترقی یافتہ علم اللسان کا ماہر ڈھونڈھ نکال سکتا ہے۔

تہذیب و تمدن کی جس قدر اعلیٰ اور ادنیٰ سطحیں معلوم ہوئی ہیں اُن میں انسان کے حالات نہایت عظیم تفاوت رکھتے ہیں۔ لیکن اُنکے مدارج درمیانی جو معلوم ہوے ہیں وہ اس تفاوت کو اس طرح سلسلہ وار گھٹاتے چلے جاتے ہیں کہ پست ترین حالتِ وحشت سے لے کر بلند ترین تمدن تک ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا ہے جو کہیں بھی نہیں ٹوٹتا۔ وحشیانہ زندگی پر تفصیل وار نظر ڈالنے سے نہ صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ نہایت درجہ وحشی انسان اور اعلیٰ درجے کے حیوان میں بے حد فرق ہے بلکہ نہایت کم متمدن لوگ بھی اُس ادنیٰ درجے کی اخلاقی اور عقلی حالت

سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں جس میں انسانی قبائل کا بسر کرنا موافق حالات (جیسے گرم آب و ہوا۔ افراط غذا۔ اور مہلک و جاں ستاں امور سے محافظت کی حالت) میں ممکن سمجھا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ لوگ بھی تمدن کی اکثر مخصوص شانوں کے ابتدائی درجے تک پہونچ گئے ہیں۔ وہ ایسی زبان بولتے ہیں جو اُن کے خیالات کی مظہر ہوتی ہے۔ اُن کے آلات و اَوزار اور ہتھیار (جیسے ہتوڑا۔ کٹیا۔ برچھا۔ چاقو۔ دھاگہ۔ جال۔ ڈونگی وغیرہ) ایسے ہیں جن کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہایت متمدن قوموں کے یہاں جو اشیا، اس قسم کی مروج ہیں اُن کی نہایت اَن گھڑ اور بھدی نقلیں ہیں۔ اُن کی تعمیرات۔ جھوپڑے۔ احاطے۔ کٹہرے اور کھوئیں اگرچہ بھدیسل اور غریبانہ ہوتے ہیں لیکن اُنھیں کا چربہ ہوتے ہیں جو متمدن لوگ بناتے ہیں۔ اسی طرح سیدھے سادے ہنروں میں جیسے گوشت کے اُبالنے یا بھوننے۔ کھالوں اور سموروں سے تن پوشی کرنے۔ چٹائیاں اور ٹوکریاں بنانے۔ شکار کھیلنے کی ترکیبوں یعنی پھندا لگانے یا کٹیا سے مچھلی پکڑنے میں اپنے بدنوں کے سنوارنے کی مسرت میں اور جو اشیا، روزانہ استعمال میں آتی ہیں اُن پر نقش و نگار کھینچ کے اُنھیں خوشنما بنانے میں ایک وحشی اور ایک متمدن گروہ کے درمیان جو کچھ فرق ہے وہ کمیت کا ہے کیفیت کا نہیں ہے۔ یعنی دونوں کے افعال و حرکات کی شان ایک ہی ہے۔ فرق جو کچھ ہے وہ زیادتی یا کمی اور نفاست یا سلیقہ کا ہے۔ پھر تعلقاتِ خانگی و انتظاماتِ خانہ داری میں۔ معاشرتی اُنس و محبت میں۔ بچوں اور بوڑھوں کی شفقت آمیز نگہداشت میں۔ والدین کی اطاعت و رضا جوئی میں۔ قبیلہ کی باہمی حفاظت کے فریضہ میں بزرگوں کے اقتدارات میں۔ اسلاف کی وضعِ قدیم کے نباہ میں۔ اور بزرگوں کے دستورات و مراسم کو اپنی زندگی اور فرائض کے رہنما بنانے میں وحشی سے وحشی بھی (جو نکبت میں گرفتار ہو کے ذلیل و خوار یا بالکل مسخ نہیں ہو گئے ہیں) کم و بیش اچھی طرح ممتاز نظر آتے ہیں۔ اور بالآخر ان ادنیٰ درجے کے لوگوں میں معمولاً غیر مرئی قوتوں کے عالم پر محیط اور مسلط ہونے کا عقیدہ پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان قوتوں کی پرستش کسی نہ کسی شکل سے کی جاتی ہے۔ پھر۔

اس حالت سے ترقی کیے ہوے، وحشیوں میں زیادہ صحیح اور باقاعدہ (بلکہ مالامال) زبان۔ نوامیں فطرت کا زیادہ علم۔ زیادہ کارآمد اور عمدہ آلات و اوزار۔ زیادہ کامل اعمال صنعت و حرفت۔ زیادہ جنچی ہوئی ترتیب اور ترکیب حکومت۔ زیادہ باقاعدہ اور فلسفیانہ طریقہ کا مذہب اور زیادہ وسیع اور باشان وتجمل طرز عبادت سے اُن کے تمدن اور ترقی کا ثبوت ملے گا۔ اور ان دونوں کے درمیانی درجات میں نئے نئے فنون صنعت اور جدید خیالات حکمت ملیں گے۔ جیسے زراعت اور گلہ بانی مٹی کے برتن بنانا۔ فلزات کے آلات و اوزار کا استعمال کرنا۔ تصویروں کے ذریعہ سے واقعات کی روئدادیں لکھنا اور دوسروں تک پہونچانا۔ انھیں مدارجِ ترقی کے برابر برابر وحشی اور غیر متمدن لوگوں کے نشوونما کے درمیان جو مسافت ہوتی ہے وہ طے ہوجاتی ہے اور جب یہ مسافت طے ہوجاتی ہے اُسکے بعد تمدن کے مدارج کا بقیہ سلسلہ عام طور سے انسانی معلومات کے دائرے میں آجاتا ہے۔ اس طرح سے ہم کو تمدن کی ابتدا اور انتہا اور اُس کے درمیانی درجات کا حال اس ترتیب سے معلوم ہوجاتا ہے کہ ہم اُسکا کامل سلسلہ قائم کرلیتے ہیں۔

تین چار ہزار برس تک کے تاریخی واقعات قلمبند کیے گئے اور محفوظ ہیں۔ اُن سے سبق حاصل ہوتا ہے کہ مدت ہاے مدید میں تمدن نے رفتہ رفتہ ترقی کی ہے۔ اس طور پر کہ اُنکا دائرۂ علم وسیع ہوتا گیا اور حقائق اشیاء کی واقفیت روز بروز جنچی ہوئی اور ٹھیک ٹھیک ہوتی گئی۔ پہلے کچھ صنائع و بدائع ایجاد ہوے۔ پھر اُن میں جدید اختراعات کی گئیں اور پھر اُنھیں ترقی دی گئی۔ اور سوشل اور پولیٹکل حرکات وخیالات میں جمہور کی فلاح و بہبود کا تصور زیادہ پیش نظر رہنے لگا۔ اگلے زمانے کے یہودیوں۔ یونانیوں۔ اور جرمنیوں کے حالات اُن کے پُرانے کارناموں سے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اُن کی شاعری اور اُن کی قدیم داستانیں جو اُن کے کارناموں کی سرگزشتوں سے زیادہ گران قدر ہیں وہ اُن کو اُس وقت کی سوسائٹی کی تفصیلی کیفیت ہمارے سامنے پیش کرتی ہیں۔ اور یہ سب ایک سلسلۂ ترقی کی خبر دیتی ہیں اور ثابت کرتی ہیں کہ کیونکر ترقی کرتے کرتے اس حالت تک نوبت پہونچی ہے جو اب ہے۔ اس میں جابجا زوال اور تنزل بھی ہے اور وہ

ایک حد تک عقلی نشوونما کے آثار و نتائج کو تباہ کرنے والا ہے لیکن اس سے تحقیقاً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ زمانۂ حال کی متمدن قوموں کے اسلاف غیر متمدن تھے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تاریخ کے احاطہ سے باہر جو نسلیں گزری ہیں اُن کی بھی یہی حالت ہوگی اور اُن سے اوپر کی نسلوں کی حالت قریب قریب ویسی ہوگی جیسی اب کے زمانے کے وحشیوں کی ہے۔ اور چونکہ وہ لوگ اتنے ترقی یافتہ نہ تھے کہ اپنے زمانے کے حالات کی روئدادیں چھوڑ جاتے۔ تو اُنسے اسکی کیا امید ہوسکتی ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے آثار و یادگار تلاش کرتے یا اُنھیں آیندہ کے لیے محفوظ رکھ جاتے۔

جو لوگ اس ترقی کے نظریہ (یا نظریۂ ارتقا) کے مخالف ہیں وہ اُس عہد زریں یا سَت جُگ کے کارنامے پیش کرتے ہیں جس کی سرگزشتیں بعض قوموں کے پاس موجود ہیں اور جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں انسانی جماعت اُس سے زیادہ ترقی کیے ہوے تھی جتنی ترقی اب اُس نے کی ہے۔ اور یہ کہ اُنکے اسلاف بلحاظ تنومندی۔ درازی عمر۔ اخلاق و آداب معاشرت اور نیز بلحاظ اپنے عقل و فہم اور جودت و ذکاوت کے اپنے اخلاف سے کہیں بڑھ چڑھ کے تھے۔ اُنکا بیان ہے کہ انسان میں فی الحقیقت حالت وحشت و جہالت سے حالت تمدن میں آنے کی استعداد و قابلیت ہی نہیں ہے۔ انکے نزدیک انسان کی ترقی صرف ما فوق الفطرۃ فیضان سے ہوسکتی ہے اور اُنکی رائے میں یہ جو اب وحشی اور غیر متمدن قومیں ہیں یہ اعلیٰ درجے کی متمدن قوموں کی مسخ شدہ اور نکبت زدہ اولادیں ہیں۔ لیکن ان دلائل کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو آلات حجر طبقاتِ ارض سے برآمد ہوے ہیں جب اُن کا مقابلہ آج کل کے وحشیوں کے آلات سے کیا جاتا ہے تو صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم صنعت و حرفت کے لحاظ سے اخلاف بہ نسبت اپنے اسلاف کے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں دنیا کے قریب قریب ہر آباد حصہ میں زمین کے اندر سے پتھر کے آلات و اوزار اور برتن برآمد ہوچکے ہیں اور انھیں آباد حصوں میں اگلے تمدنوں کے مرکز و مستقر جیسے مصر۔ بابل۔ شام۔ ہندوستان چین۔

اور یونان شامل ہیں۔ پس۔ ان آلات سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان سب ملکوں میں بھی ایک عہدِ حجر گزرا ہے جس میں وہاں کے باشندے فلزات کے استعمال سے ناواقف اور پتھروں سے اپنا کام نکالتے تھے۔

ماورا سکے علوم و فنون اور صنائع و بدائع کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ انسان کی کُل سرگزشت ایک سلسلۂ ترقی ہے۔ مثلاً۔ ایک وقت میں لوگ صرف کسی چیز سے آفتاب کا سایہ ناپتے اور وقت بتاتے تھے۔ اس نے ترقی کی اور سنڈیل بنی۔ ترکل کی پیپری نے ترقی کی اور ارگن (ارغنون) تک نوبت پہونچائی۔ مقناطیسی سوئی نے قطب نما سے نکل کے تار برقی میں جگہ پائی۔ یہ تو وہ حالتیں تھیں جن میں ایک وقت کی بنی ہوئی چیز کو دوسرے زمانے میں لوگوں نے ترقی دے کے کچھ سے کچھ کر دیا۔ لیکن بعض اوقات انسانی عقلوں کی ترقی سے بالکل نئے نئے امور بھی ایجاد ہوتے ہیں جیسے پنڈولم (لنگر) اور دخانی انجن۔ یہی حال علوم حکمیہ اور فنون تجربیہ کا بھی ہے۔ مثلاً ایک زمانے میں لوگ زمین کو چپٹا اور سطح اور آسمان کو اُس پر ٹھوس گنبد کی طرح چھایا ہُوا مانتے تھے اور صرف یہی نہ تھا کہ آفتاب کو زمین کے گرد گھومتا ہوا سمجھتے تھے بلکہ آفتاب اور ماہتاب دونوں کی بابت یہ عقیدہ تھا کہ اُن کو دیوتا لوگ اپنے حسب مرضی جس طور سے چاہتے ہیں گھمایا کرتے ہیں لیکن بعد چندے زیادہ صحت کے ساتھ غور و فکر کرنے سے یہ مسئلے اب بہت یقینی طور سے واضح ہوگئے ہیں کہ زمین گول ہے اور اپنے محور پر اور آفتاب کے گرد حرکت کر رہی ہے۔ یہی حالت علم طب و معالجہ کی ترقی کی ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب جنون۔ برص۔ بخار اور دیگر امراض کی بابت یہ سمجھا جاتا تھا کہ دیوی کا سایہ اور جنوں کا پھیرا ہے اور اگرچہ ہنوز یہ عقاید تھوڑی کمی بیشی یا تبدیلی کے ساتھ آدھی دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن تشریح اجسام۔ تشخیص امراض اور علاج معالجہ کے جزئیات کی ترقی ان خیالاتِ فاسدہ کو نقش برآب اور باطل ثابت کرتی چلی جاتی ہے۔

نتیجہ | حاصل کلام یہ کہ اس قدر گفت و شنید سے یہ مسئلہ حل ہوگیا ہے کہ جہاں تک عقل انسانی

کام دیتی ہے ہر ایک طرح سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان جب اس عالمِ رنگ وبو میں آیا تھا اُس وقت اُس کی حالت نہایت سادہ اور طفلانہ بلکہ وحشیانہ تھی اور اُس نے رفتہ رفتہ اتنی ترقی کی ہے کہ بیسویں صدی کا جنٹلمین بنا ہے۔ مسٹر والس انسان کی اس خصوصیتِ نوعی یعنی اُسکی ترقی اور جدت طرازی کے رُجحان (جس نے اُسے دیگر حیوانات پر شرافت اور فضیلت دے رکھی ہے) پر لکھتے ہیں۔

مسٹر والس کی رائے

"اُس وقت سے کہ جب اول اول کوئی کھال اوڑھنے کے لیے استعمال کی گئی تھی جب ایک بے ہنگم برچھا شکار مارنے کے لیے کام میں لایا گیا تھا جب شروع شروع آگ سے کھانا پکایا گیا تھا۔ اور جب سب سے پہلے زمین میں کوئی بیج بویا یا درخت لگایا گیا تھا فطرت میں ایک انقلاب عظیم کر دیا گیا ہے۔ یہ ایسا انقلاب ہے جس کی کوئی نظیر تاریخ ارض میں ازل سے نظر نہیں آتی۔ کیونکہ انسان ہی کی پیدائش سے ایک ایسا وجود معرضِ ظہور میں آیا تھا جو زمانے کے انقلاب کے ساتھ منقلب ہو جانے والا نہ تھا بلکہ وہ ایسا وجود تھا جو ایک حد تک فطرت پر اس لحاظ سے غالب تھا کہ وہ فطرت کے حرکات کو سمجھتا۔ اُسے قابو میں کر لیتا اور اپنی راہ پر لگانا جانتا تھا۔ اور نہ صرف جسمانی تغیرات سے بلکہ اپنے نفس کی ترقی سے اپنے آپ کو فطرت سے سازوار بنا سکتا تھا۔

طریقہ تحقیقات

اب ہم صرف یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ نوع انسان کی تاریخ لکھنے والوں نے جو تحقیقات کی ہے وہ کیونکر کی ہے اور اُس سے کیا ثابت ہوا ہے۔ یہ کُھلی ہوئی بات ہے کہ دُنیا کی نہایت قدیم قوموں کے حالات تاریخوں سے بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔ جو قومیں تاریخی ذخیرہ رکھتی بھی ہیں وہ بھی بہت زیادہ قدامت کی خبر نہیں رکھتیں اور اُنپر نکتہ چینی کی نگاہ ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اُن سے چار پانچ ہزار برس کے حالات صرف چند ملکوں اور قوموں کے دریافت ہو سکتے ہیں۔ دوسرے ملکوں اور قوموں کے حالات اتنے زمانے کے بھی نہیں معلوم ہو سکتے۔ اس لحاظ سے اہل تحقیق نے

تاریخِ انسان کے دو دَور قائم کیے ہیں۔ ایک عہد تاریخی کہلاتا ہے جس کے حالات و واقعات تاریخوں میں محفوظ ہیں گو کہ وہ ناقص اور نامکمل ہی کیوں نہ ہوں دوسرا عہد وہ ہے جو مقدم التاریخ کہلاتا ہے یعنی جس وقت کے بابت کوئی رُوداد لکھی ہوئی موجود نہیں۔ اور اس عہد کا جو کچھ بھی حال تحقیق ہُوا ہے وہ آثارِ قدیمہ کی چھان بان اور طبقاتِ ارض کی کھود کھاد سے تحقیق ہُوا ہے۔ یعنی پُرانی یادگاروں اور زمین کے نیچے دبی ہوئی چیزوں سے ہم کو نہایت قدیم زمانے کے انسانوں کے افعال و حرکات کا پتہ لگا اور ہم نے اُن چیزوں پر قیاسات جما کے ایسے نتائج نکالے جن سے تاریخ کا ایک سلسلہ مرتب ہو گیا۔ یہ قیاسات اُسی طرح قابلِ قبول ہیں جس طرح کسی زندہ قوم کے افعال و حرکات سے اُسکی عقل و فراست اور اُسکی معاشرت پر قیاس لگائے جا سکتے ہیں۔ ان قیاساتِ تاریخی کی تفصیل تو ہم آگے چل کے بیان کریں گے۔ سردست ہم مقدم التاریخ عہد کے بابت جو کچھ انکشافات ہوئے ہیں اُنکو مختصراً بیان کرتے ہیں۔

قیاساتِ تاریخی کی تفصیل

واضح ہو کہ اہلِ تحقیق نے انسان کی بدایتِ حال میں تمدن کے چار دَور قائم کیے ہیں۔ پہلا دَور وہ ہے جس میں انسان دیگر حیوانات کے ساتھ گُھلا مِلا رہتا تھا۔ اُسکے گِرد و پیش نہایت عظیم الجثہ اور بہت ہی زبردست جانور تھے کہ جن کا اب صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ بعض مقامات پر نہایت نیچے کے طبقاتِ ارض میں اُن کے ڈھانچے نکلے ہیں۔ اُس وقت انسان کی حالت محض چارپایوں اور درندوں کی سی تھی۔ اور غالباً اُسکی زندگی اور ایک جانور کی زندگی میں کوئی فرق نہ تھا۔ اُسکی کھانے کے واسطے جنگلی میوے اور کمزور جانور موجود تھے۔ اور اُسکے رہنے کے لیے پہاڑوں کی کھوئیں اور درختوں کی سایہ دار شاخیں کافی تھیں۔ پھر ایک دَور ایسا آیا جس میں انسان نے چقماق اور دیگر پتھروں کے سڈول ہتھیار اور اوزار بنانا اور اُن سے کام نکالنا شروع کیا۔ یہ دور عہد حجر کہلاتا ہے۔ اس لیے کہ اُس وقت انسان کے کُل کام یا تو خود اُسکے قوتِ بازو

سے نکلتے تھے یا پتھروں سے۔ پتھر ہی اُس کے آلات حرب و ضرب تھے۔ پتھر ہی اُس کے ظروف اکل و شرب۔ پتھروں ہی میں وہ رہتا تھا اور پتھروں ہی سے اُس کے سب کام نکلتے تھے۔ یہ عہد حجر تمام اکنافِ عالم میں مشترک ہے۔ اور ہر حصۂ دنیا میں زمین کے طبقاتِ زیریں سے ایسے ظروف و آلات برآمد ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں ہر جگہ انسان نے پتھروں سے کام لیا ہے اور جہاں کہیں وحشی لوگ اب بھی پائے جاتے ہیں وہاں اس عہد کا سلسلہ اب بھی قائم ہے۔ بلکہ جن مقامات پر فلزات کا استعمال شروع بھی ہو گیا ہے وہاں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس دوسرے دور میں انسان کو فلزات (بہ استثناء طلا جو بعض اوقات زیورات میں استعمال ہوا) کا علم نہ تھا نہ اُن سے کوئی کام لیا گیا۔ پھر تیسرا دور وہ ہوا جس میں مسی و برنجی آلات و اوزار بنائے گئے اسے عہد مس و برنج کہتے ہیں۔ اس عہد کا پتہ زیادہ تر ایشیا اور یورپ کی قدیم قوموں میں ملتا ہے اور انھیں کے یہاں صدیوں تک یہ عہد قائم رہا۔ لیکن پالینیشیا۔ جنوبی افریقہ۔ اور وسطی امریکہ (باستثناء مکسیکو اور پیرو کے) میں عہد حجر کے بعد یہ عہد نہیں ہوا بلکہ چوتھا دور (جسے عہد آہن کہتے ہیں) شروع ہو گیا۔ یعنی وہاں تین ہی دور ہوئے۔ چوتھا دور وہ ہوا جس میں لوہے کا چلن چلا اور لوہے کے آلات و اسلحہ سب پر فوق لے گئے۔ اس لیے اسے عہد آہن کہتے ہیں۔ اگرچہ اس عہد میں بھی مسی زیور بنا کیے۔ اور اوزاروں ہتھیاروں کے قبضے اور دستے مس و برنج کے بنتے رہے لیکن اُن کے پھل لوہے کے سوا اور کسی دھات کے نہ بنے۔ اس مقام پر یہ بات خیال میں رکھنا چاہیے کہ مسی اور آہنی دوروں میں بھی پتھر کے ہتھیار اور برتن استعمال میں آیا کیے ہیں اور اس وجہ سے کسی قوم میں پتھر کے کچھ اوزاروں یا ہتھیاروں یا برتنوں کے ملنے سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ہنوز عہدِ حجر میں ہے۔

تمدن انسان کی یہ ایک عارضی جہت ہے لیکن اس سے بنی آدم کے کل مشاغل کا پتہ نہیں لگتا۔ اس لیے ایک اور صورت سے بھی ترقی کے مدارج بیان کیے جاتے ہیں۔ پہلا دور وہ تھا جب انسان جنگل کا ایک شکاری تھا کہ وہ مختلف درندوں و پرندوں کو مار کے اپنے لیے قوتِ لایموت مہیا کرتا تھا۔ پھر ترقی کر کے اُس نے ماہی گیری شروع کی اور دریا سے مچھلیاں مارنے کے واسطے

جال وغیرہ بنائے۔ پھر میوہ برداری پر توجہ کی اور درختوں کے پھل پھلاری کے مزے سے اُس کے کام و دہن آشنا ہوئے۔ اس حالت میں اُسے درختوں کی موقت فصلوں کا علم ہوا اور بالآخر اُس پر تجربہ سے ایسے رموز منکشف ہوئے جن سے اُس نے خود درختوں کا بونا اور لگانا سیکھا اور کاشت کاری اور کاشتکاری ہی میں اُسے اتنی فلاح اور ایسی فرصت اور فراغت نصیب ہوئی کہ مختلف فنونِ حرفت و مشقت میں اُس نے قدم رکھا۔ اور سوشیل خیالات اور پولیٹکل معاملات کا چرچا شروع ہوگیا۔ مثلاً اسی ترقی کے سلسلے میں شخصی انتقام کی خواہش کی جگہ یہ خیال پیدا ہوا کہ ہر جُرم اس وجہ سے سزا کے قابل ہے کہ اُس سے سوسائٹی کے امن میں خلل پڑتا ہے۔ اسی طرح قبیلہ کی حکومت ایک شیخ قبیلہ کے ہاتھوں سے نکل کے متعدد گھرانوں کا ایک مجموعہ بنا اور پھر یہ دائرہ بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھا کہ ملکوں اور قوموں کی حکومت کے لیے ریاست و بادشاہت معرض وجود میں آئی۔ علیٰ ہذا القیاس مذہب کا تخم جو پہلے سے بویا گیا تھا روز بروز بڑھ کے پھل پھول لانے لگا یعنی پہلے طفلانہ اعتقادات اور اچھے بُرے کی تمیز بزرگوں کے ذریعے سے ہوئی۔ پھر دیندار اور پرہیزگار لوگوں نے بذریعہ وعظ و پند اخلاقی اصول کی تعلیم دی اور مذہب کی پیروی میں مکارم اخلاق دلنشیں کیے یعنی جو باتیں تجربہ سے مفید و بہتر معلوم ہوئیں اُن کے رواج دینے کے واسطے مذہب کے نام سے یہ ظاہر کیا گیا کہ وہ سعد و مبارک ہیں اور جو باتیں تجربہ سے مضر اور بُری ثابت ہوئیں اُن سے بچنے کے واسطے یہ اظہار کیا گیا کہ ازروے مذہب وہ بد اور نحس ہیں رفتہ رفتہ کرکے ان دیندار واعظوں نے اپنی ایک جماعت بنالی اور عوام الناس کو اپنا اسقدر گرویدہ و معتقد کرلیا کہ انکے اقتدار کے سامنے دنیاوی فرماں رواؤں اور جلیل الشان بادشاہوں تک کی گردنیں خم ہونے لگیں۔

اس مقام پر ہم انسانی مذاہب پر بھی ایک تحقیقی نظر ڈالنا چاہتے ہیں کیونکہ بنی آدم کا تمدن متعدد حیثیتوں سے اُن کے مذاہب سے وابستہ ہے۔ اور اکثر قوموں کے عروج یا زوال میں اُن کا مذہب بہت کچھ دخیل ثابت ہوا ہے۔ حتیٰ کہ سلف سے اس وقت تک تمدن اور مذہب کی بابت یہ امر زیر بحث رہا ہے کہ کون سبب ہے اور کون نتیجہ۔ اگلے زمانے کے اہل تحقیق اور نیز اہل مذاہب

اسی کے قائل تھے کہ مذہب سبب ہی اور تمدن اُس کا نتیجہ۔ لیکن آج کل یورپ کے اہل تحقیق اسی کے قائل ہیں کہ تمدن سبب ہی اور مذہب اُس کا نتیجہ۔ ہرکیف چونکہ اس وقت ہمارے مرکوز خاطر یہ امر ہے کہ ہم اہل یورپ کے نتائج تحقیقات کو اختصار کے ساتھ بیان کریں اس لیے اُن نتائج کی صحت یا غلطی کے ہم ذمہ دار نہیں۔ اور وہ لوگ جن کے کان اب تک یہی سنتے ہے ہیں کہ مذہب من جانب اللہ ہوتا ہے اور خدا ہی اپنے کسی برگزیدہ بندے کو ہدایت کے لیے نبی یا رسول بنا کے بھیجتا ہے اور وہ نبی یا رسول جو خود معصوم ہوتا ہی ایک شریعت لاتا ہے اور خدا کی مخلوق کو اپنا نمونہ دکھاتا اور اُنھیں اخلاق حسن کی تلقین کرتا اور اُن سے اپنی پیروی کراتا ہی وہ ہماری تحریر پڑھ کے ہم سے مکدّر نہ ہوں۔ اہل مذاہب کے پہلو بہ پہلو دنیا میں لامذہبوں[1] کا بھی ایک گروہ موجود ہے۔ یہ گروہ مذاہب کے اُن کرشموں کا منکر ہو نہیں سکتا جو اُنھوں نے قلوب انسانی کی تسخیر میں دکھائے ہیں اور عالم کی تاریخ سے اُن اہم واقعات کو مٹا نہیں سکتا جو مذاہب کے سبب سے پیدا ہوے ہیں۔ لیکن وہ رسالت اور نبوت کا تو کیا ذکر خود خدا ہی کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا اور اس وجہ سے اُسے ان تمام اہم واقعات وحوادث کی ایک نہ ایک توجیہ کرنا ضروری تھی۔ اس نظر سے اُس نے بطور خود عالم اور ما فی العالم پر

[1] یہ لامذہبی بھی دو طرح کی ہے ایک تو یہ ہی کہ جو قومیں حد درجہ وحشت وجہالت میں پڑی ہیں وہ معاش ومعاد دونوں سے بے خبر ہیں۔ اُنھیں نہ آغاز کی خبر ہی نہ انجام کی۔ نہ وہ دین جانتی ہیں نہ دُنیا۔ جہالت بحت میں ڈوبی ہوئی ہیں اور نکبت وادبار میں گرفتار ہیں۔ اور دوسری یہ کہ جو لوگ تمدن اور شایستگی میں حد درجہ ترقی کیے ہوے، علوم وفنون کی اعلی منزلوں میں پہونچے ہوے ہیں، حکمت اور فلسفہ میں پایہ بلند رکھتے ہیں اور عقل آرائی اور بلند پروازی کے زور میں ہر شے کو علم ہندسہ کے حقائق کی طرح دلیل وبرہان اور خیال وقیاس سے جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ جب خدا کی بے چون وبے چگوں ہستی کو جو عقل وحواس اور وہم وخیال کی رسائی سے باہر ہے اور حس کے ادراک سے انسانی اذہان وافہام قاصر ہیں اس طرح سمجھ نہیں سکتے تو سرے سے اُس کے وجود سے منکر ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ دہریہ اور ملحد کہے جاتے ہیں۔ اور یہاں انھیں لوگوں کی طرف اشارہ ہے ۱۲۔

غور کیا تاکہ تخلیق عالم کی بابت کوئی دوسرا نظریہ قائم ہو سکے - اس کوشش کا جو کچھ نتیجہ نکلا ہو اُس کا اجمالی تذکرہ اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ ناظرین کو اُن بیانات کے سمجھنے میں دقت نہ پڑے جو آگے آئیں گے -

اہل تحقیق اسے تسلیم کرتے ہیں کہ دُنیا میں انسان مذہب لے کے پیدا ہوا ہے (یعنی باستثنائے اُن لوگوں کے جو بالکل ہی وحشت وجہالت میں پڑے ہوے ہیں اور سب لوگ ایک نہ ایک مذہبی خیال یا عقیدہ ضرور رکھتے ہیں) اور عالم کی تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ نوع انسانی کے افعال و حرکات میں مذہب ایک زبردست محرک رہا ہے - مذہب نے قوموں کو متفق اور پراگندہ کیا ہے سلطنتوں کو متحد اور منقسم کیا ہے - مذہب نے نہایت جابرانہ و وحشیانہ افعال کو جائز - نہایت ظالمانہ اور مکروہ مراسم کو روا رکھا ہے - مذہب نے نفس کشی اور ریاضت شاقہ اور شجاعت و مردانگی کے کاموں کی ایسی زبردست تحریک کی ہے کہ جس سے بڑی بڑی پُر شوق لڑائیاں اور باجوش وخروش معرکہ آرائیاں - بغاوتیں اور خوں ریزیاں واقع ہوئی ہیں - اور مذہب ہی کی بدولت قوموں کو فلاح و شادمانی - آزادی اور امن وامان نصیب ہوا ہے - کبھی تو مذہب کی یہ شان دکھائی کہ اُس نے ظلم و جفا کا ساتھ دیا اور کبھی اس نے اُس کا قلع قمع کیا - کبھی تو اُس کے سبب سے ایک نیا اور نہایت عمدہ تمدن پیدا ہوا - بڑھا اور پھولا پھلا - اور کبھی وہ ترقی اور علوم وفنون کا سخت حریف و عدو ثابت ہوا

ل یہ اہل مغرب کا خیال ہے - اہل مذاہب کے نزدیک کوئی سچا مذہب ایسا نہیں جس کی بنیاد کسی بداخلاقی پر ہو - کیونکہ جہاں تک بلاد مشرقیہ (جو مذہبی خیالات کے مولد ومنشاء رہے ہیں - اور جہاں سے ایسے زبردست مذہب پیدا ہوے ہیں جنھوں نے سارے عالم پر اثر ڈالا ہے) کی تاریخوں اور وہاں کی مذہبی کتابوں سے پتہ چلتا ہے - مذہب کی غرض و غایت صرف اسی قدر سمجھی گئی تھی کہ بندوں کو خالق کی معرفت اور حسن معاشرۃ کی تلقین کرائے - اور یہ جو مذہب کی آڑ میں بعض قوموں نے کسی کسی وقت کوئی جبر یا ظلم کیا ہے یہ درحقیقت اُس کے پیرووں کی ضلالت اور گمراہی کے باعث ہوا ہے - سچا مذہب وہی ہے جو اپنے بندوں کو کشادہ دل - بے تعصب - نکوکار - اور بافیض بنائے - اور اُن کو عالم کے تسخیر کرنے - حقائق اشیاء کے جاننے اور اپنی ظاہری اور باطنی قوتوں سے کام لینے پر مستعد کرے ۱۲

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہب کی ابتدا کیونکر ہوئی؟ قبل اس کے کہ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جائے چند اُمور کا ذہن نشین کر لینا ضروری ہے۔ مذاہب عالم پر غور کرنے کے بعد اُنھیں اگر مقررہ اُصول کے تحت میں لانا چاہیں تو اُن کی تقسیم اس طرح ہو سکتی ہے کہ کُل مذاہب یا مذہب فطرت کے تحت میں آتے ہیں یا مذہب حُسن معاشرۃ کے پہلے گروہ میں اُن سب مذہبوں کو داخل کر سکتے ہیں جن میں اعلیٰ معبود (یا دیوتا) فطرت کے زبردست قوی ہیں۔ چاہے وہ عفریت کہے جائیں یا ارواحِ خبیثہ یا انسانی صورت مخلوقات کی شکل میں ظہور کرتے ہوں یا اس سے بھی کچھ بلند درجے پر سمجھے گئے ہوں۔ اور دوسرے گروہ میں وہ کُل مذاہب داخل ہو سکتے ہیں جن کا اصلی مقصد انسان کو مکارم اخلاق کی تلقین کرنا اور حُسن معاشرت کی راہ پر لگانا ہوتا ہے اور جن کی بدولت انسان کو حق و باطل۔ نیکی و بدی اور حقوق و فرائض کا علم ہوا۔ مذاہب فطرت مقدم ہوتے ہیں مذاہب حُسن معاشرت پر۔ یعنی نوع انسانی نے مذہب کی

لہ انسان کی ترقی پر عمومی حیثیت سے جب نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے مذاہب اُن کے تمدن کے پہلو بہ پہلو رہے ہیں۔ یعنی جس قدر کوئی قوم زیادہ شایستہ اور متمدن نظر آتی ہے اُسی قدر اُس کے مذہبی خیالات و معتقدات بھی معقول اور درست ہوتے ہیں۔ اور غیر متمدن قوموں کے مراسم و اعتقادات و عبادات سے جب اُنکا مقابلہ کیا جاتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ کس درجہ ترقی کردہ حالت میں ہیں۔ چنانچہ مختلف سیاحوں نے غیر متمدن قوموں کے حالات دیکھ کر جو کچھ اس بارے میں لکھا ہے اُس کا اقتباس یہاں درج کیا جاتا ہے۔

غیر متمدن قوموں کے معبود علے العموم بد ہوتے ہیں نیک نہیں ہوتے اُنھیں انسان اپنی خواہشوں اور حاجتوں کے پورا کرنے کے واسطے مجبور کر سکتے ہیں اُن کے لیے خوں ریزی درکار ہوتی ہے۔ اور انسان جو اُن کے نام پر قربانی کرتا ہے اُس سے وہ راضی اور خرسند ہو جاتے ہیں۔ وہ فانی ہوتے ہیں سدا باقی رہنے والے نہیں ہوتے۔ وہ خالق فطرت نہیں ہوتے بلکہ فطرت ہی کا ایک جزو ہوتے ہیں۔ اُن کے یہاں دُعا اور عرض مدعا سے تقرب نہیں ہوتا۔ بلکہ رقص و سرود سے ہوتا ہے اور وہ اکثر اوقات حسنات کے عوض سیئات کو پسند کرتے ہیں۔ درحقیقت ان ادنیٰ درجے کی قوموں کے مذاہب کو اعلیٰ درجے کی قوموں کے مذاہب سے وہی نسبت ہے جو علم ہیئت سے نجوم کو یا علم کیمیا سے کیمیا گری کو ہے۔ واقع میں نجوم ماخوذ ہے

جادہ پیمائی میں پہلے مذاہب فطرت کی منزل میں دم لیا ہے اور پھر مذاہب حُسن معاشرت کی سرحد میں قدم رکھا ہے۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ آثار قدیمہ کے محققین نے اور اُن لوگوں نے جن کو اقوام عالم کے آثار و یادگار کی تفتیش و تفحص کا ذوق تھا یہ قرار دیا ہے کہ جب پہلے پہل انسان نے

ہیئت سے لیکن وہ اسکے علی الرغم چلتا ہے۔ اسی طرح علم کیمیا ہی سے مھوسی نکلی ہے لیکن جداگانہ راہ پر چلی ہے۔ بالکل یہی حالت دونوں طبقات کے مذاہب کی بھی ہے۔ متمدن قوموں میں خدا خیر محض اور غیر متمدن قومیں اُسے شر محض سمجھتی ہیں وہ اپنے خدا کی اطاعت اور بندگی کرتے ہیں، یہ اُسے اپنا مطیع بنانا چاہتے ہیں وہ اپنے گرد و پیش جن چیزوں کو دیکھتے ہیں انھیں خدا کی رحمت سمجھتے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ نعمتیں اور برکتیں تو خود بخود آئی ہیں۔ البتہ جو کچھ خرابیاں پیدا ہوئی ہیں وہ شریر موجودات کی وجہ سے ہوئی ہیں۔

مذہبی تصورات کی ابتدائی تحقیقات کی ترتیب یوں قرار دے سکتے ہیں۔ (۱) لا مذہبی۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ خدا کے وجود ہی سے انکار کیا جائے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ خدا کی بابت کوئی خاص خیالات ہی نہ ہوں۔ اس حالت میں ایک مبہم تصور بعض محققین ارواح خبیثہ کے وجود کا اور ایک عام عقیدہ جادو ٹونے کا ہوتا ہے۔ زمانۂ حال کے بعض محققین کا خیال ہے کہ اگرچہ یہ مخصوصات نہایت ادنیٰ درجے کی وحشی قوموں کے ہیں لیکن فی زمانہ جو شایستہ اور تہذیب یافتہ قومیں ہیں اُن میں بھی ان امور کا کچھ کچھ اثر باقی ہے۔ مثلاً بعض اہل مذاہب کا یہ عقیدہ کہ چند الفاظ و اصوات کے مُنھ سے ادا کرنے سے کوئی خاص

اثر پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ انسان کے رنج و مسرت یا غربت و امارت یا مرض و صحت پر کچھ تاثیر دکھاتے ہیں۔ اسے کسی مذہب کے اصل اصول سے کوئی واسطہ نہیں اور یہ محض انسان کی ایجاد و طبع زاد ہے۔ مذہب نے اگر کہا ہے تو یہی کہا ہے کہ فلاں حالت میں فلاں عبارت و الفاظ کا ورد کیا جائے اور اس سے اگر کچھ مطلب ہو سکتا ہے تو یہی کہ ان الفاظ کے معانی و مفہوم سے قلب پر کوئی خیال منقش ہو جائے نہ یہ کہ اُن الفاظ ہی کو مشکل کشا مان لیں اور یہ محض انسان کی جدت ہے کہ وہ الفاظ ہی کو بجائے خود حلال مشکلات ماننے لگتا ہے۔ بہر کیف جو قومیں اس لا مذہبی میں پڑی ہیں اُن میں نہ تخلیق عالم کی بابت کوئی خیال ہوتا ہے۔ نہ اخلاق سے کچھ واسطہ۔ حق و باطل کو وہ نہیں سمجھتے۔ خیر و شر کو وہ نہیں جانتے۔ ارواح خبیثہ کی ایک ہیبت البتہ اُن کے دل میں سما جاتی ہے اور اُس کا بھی زور رات کو زیادہ ہوتا ہے جس کے سبب سے لوگ راتوں کو گھروں سے باہر نہیں نکلتے۔ ان میں سے بعض لوگ نہ قانون قاعدہ جانتے ہیں نہ حکومت و معدلت۔ نہ وہ بت رکھتے ہیں نہ بتخانہ بناتے۔ توحید کے قائل ہیں نہ شرک میں مبتلا۔ رُوح یا روحانیت کے متعلق وہ بالکل نابلد ہوتے ہیں اور سوا کھانے پینے کے

اپنی ابتدائی حالت میں آنکھ کھولی اور اپنے گردوپیش فطرت کی زبردست قوتوں کو عمل کرتے دیکھا اور اپنے آپ کو خطرات و بلیات میں گھرا ہوا پایا تو اُس کے دل میں آثار فطرت سے بیم و رجا کے خیالات پیدا ہوئے اور اپنے سے کسی زبردست قوت پر تکیہ و اعتماد کرنے پر اُس کی طبیعت

اور خوشیاں منانے کے اُنھیں معاش و معاد کی کچھ بھی فکر نہیں ہوتی وہ اگر مانتے بھی ہیں تو جادوگروں اور شعبدہ بازوں کو جن کے بابت اُن کا یہ خیال ہوتا ہے کہ اُن میں یہ قدرت ہے کہ امراض پر قابو رکھتے ہیں - چیچک اور قحط کو بلا سکتے ہیں اور اسی سبب سے وہ اُن سے ڈرتے رہتے ہیں - اُنھیں غیر مرئی قوتوں کا ادراک نہیں ہوتا - وہ جو کچھ سمجھتے ہیں اسی قدر سمجھتے ہیں کہ اجسام فانی کو ایک تعلق بعد فنا بھی باقی رہتا ہے - چنانچہ - جن عزیزوں سے زندگی میں ناراض اور کشیدہ ہوتے ہیں اُن کی بابت یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ آسیب بلا ہو کے لپٹ چمٹ جاتے ہیں اور وہی بیماری بن کے آدمی کی جان لے ڈالتے ہیں - یہ بھی عجیب بات ہے کہ وہ ان اجسام فانی میں اور کوئی قوت بجز موجب علالت ہونے کے نہیں سمجھتے - یعنی یہ عزیز صرف اُنھیں بیمار ڈال سکتے ہیں مگر فلاح کے سامان بہم پہونچا نہیں سکتے - اس حالت کو بزرگ پرستی بھی کہہ سکتے ہیں - کیونکہ اکثر اوقات ارواح جیسے مقید اور بری بھی کردی جاتی ہیں - یہ مذہب کی ابتدائی اور نہایت پست حالت ہے - جن میں خبیث موجودات کا ہونا مانا جاتا ہے - جو انسانوں کی طرح مادی نہیں ہوتے لیکن فانی ہوتے ہیں

اور اگرچہ بعض اوقات وہ انسانوں سے زیادہ پُرزور اور قوی مانے جاتے ہیں لیکن بعض اوقات اُس سے ضعیف اور سحر و افسوں کے ذریعے سے اُس کے قابو میں آنے والے سمجھے جاتے ہیں -

(۲) فیٹش پرستی - یہ وہ درجہ ہے جس میں انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ خدا کو اپنی خواہشات کی تکمیل کے واسطے مجبور کر سکتا ہے - اس درجہ کی حقیقت میں مذہب سے بالکل بیگانہ اور محض سحر و افسوں کے عقیدے کو اصل اصول سمجھنا چاہیے - اسی درجے میں انسان کا یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ایسی ضرر رساں مخلوقات کو اپنا تابع کر سکتا ہے کہ جو اُس کے قابو میں آکے دوسروں کو ایذا پہونچا سکتے ہیں - اس حالت میں سب سے بڑا خیال مؤکلوں وغیرہ کا ہوتا ہے - اس عقیدے والوں کے یہاں نہ معبد ہوتے ہیں نہ بت نہ پُجاری - نہ قربانیاں نہ دعائیں ان میں تخلیق عالم یا حشر و نشر یا عذاب و ثواب کے بابت کچھ خیالات ہی نہیں ہوتے - اور تلقین اخلاق سے بالکل بیگانہ رہتے ہیں - اگرچہ اس قسم کے خیالات سے کوئی قوم اور کوئی نسل انسانوں کی بالکل خالی نہیں ہوتی لیکن زیادہ تر یہ طریقہ اہل حبش وغیرہ سے مخصوص ہے اور اس طریقے میں سب سے بڑھ کے یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ایک فیٹش کے

مائل ہوئی۔ اُس کی کمزوری اور قاصر نگاہ آثار فطرت کے حرکات کو احاطہ نہ کر سکی اور اُن کا رعب اُس کے دل پر طاری ہوا اور چونکہ وہ ان آثار فطرت کو قابو میں کرنے کی قابلیت سے ناواقف تھا اور خود اپنی قوتوں کا علم نہ رکھتا تھا اس لیے اُس نے آپ کو ایک کمزور حریف سمجھا اور

ہ کے ذریعے سے وہ اپنے دیوتا کو دھمکا یا قابو میں لا سکتا ہے اور یہ گویا محض جادو ٹونے کا عقیدہ ہے۔ تمام عالم میں جادوگروں کا یہ پندار ہے کہ اگر وہ اپنے مخالف کی کسی شے کو پا جائیں تو اُس پر اُن کا بس چل سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اُس کے لباس کا بھی اگر کوئی ٹکڑا مل جائے تو اُس سے کام نکل سکتا ہے بلکہ اگر کوئی تصویر بھی بنائی جائے (جیسے ہندوستان میں موٹھ میں یا چوراہے پر ماش کے پتلے بنا کر رکھے جاتے ہیں) تو اُس کے ذریعے سے بھی گزند پہونچ سکتا ہے۔ یعنی اگر اُس نقل یا شبیہ کو کچھ ایذا پہونچائی جائے تو اُس سے اُس شخص کو ایذا پہونچے گی جس کی وہ شبیہ ہے۔ فیٹش پرستی اور بُت پرستی میں فرق یہ ہے کہ ایک بُت خود ہی قابل پرستش ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے فیٹش محض ذریعہ مان لیا جاتا ہے کہ اُس کے ذریعہ سے معبود انسان کے قابو میں ہو جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ خیال صحیح ہے کہ مذہب کے اصلی خصوصیات سے فیٹش پرستی بالکل بیگانہ بلکہ مخالف ہے۔ فیٹش کے واسطے یہ کچھ ضروری نہیں کہ وہ کوئی خاص شے ہو۔ مثلاً جوار کا ایک بھٹا بھی فیٹش ہو سکتا ہے۔ اکثر یہ صورت ہوتی ہے کہ جب کوئی وحشی اس قصد سے نکلتا ہے

کہ کسی عمدہ شے کو اپنے واسطے انتخاب کرے تو وہ اپنے سود و بہبود کے واسطے ایک معبود کی تلاش میں نکلتا ہے جب وہ اس ارادے سے گھر سے باہر قدم رکھتا ہے تو جو شے سب سے پہلے اُس کے پیش نظر ہوتی ہے چاہے وہ کتا ہو یا بلی یا اور کوئی نہایت قابل نفرت جانور وہ اُسی کو اپنا معبود ٹھہرا لیتا ہے۔ بلکہ اگر کوئی پتھر یا لکڑی کا ٹکڑا یا ایسی ہی کوئی بے جان شے بھی نظر آتی ہے تو اُسی کو اُٹھا لیتا اور اُسی سے اپنا دل باندھ لیتا ہے اب اُس کے اوپر نذر و نیاز چڑھائی جاتی ہے اور اُس کی عظمت و بزرگ داشت کی جاتی ہے۔ لیکن اُس وقت یہی نیت ہوتی ہے کہ اگر اپنے مقاصد میں کامیابی ہوگی تو خیر ورنہ اُس سے قطع نظر کی جائے گی۔ پھر اگر وہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو اُس کی شان دوبالا ہو جاتی ہے ورنہ وہ پھر اپنی اصلی حالت پر آ جاتا ہے اور اُس کی عظمت و بزرگی تشریف لے جاتی ہے۔ اس قسم کے عقائد عالمگیر ہیں مثلاً بعض مقامات پر بعض جانوروں کو لوگ طلسماتی قوتوں سے آراستہ و پیراستہ مانتے ہیں اور اُن کی یہ قدر کرتے ہیں کہ چاندی سونے کی ڈبیوں میں بند کر کے اُنھیں م

اور آثار فطرت کی بابت اُسے یہی تصور بندھا کہ وہ سب ذی رُوح اور ذی شعور ہیں۔ اُن میں وہ قوتیں پنہاں ہیں جو نہ دکھائی دیتی ہیں نہ انسان کی سمجھ میں آتی ہیں۔ اور اُن کو عالم و ما فی العالم پر اتنا اختیار و اقتدار حاصل ہے کہ جس کا حصر ہو نہیں سکتا۔

و اپنے پاس رکھتے گلے میں لٹکاتے یا بازو پر باندھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی وجہ سے وہ آزار سے محفوظ رہیں گے بیمار یا تلوار بندوق سے زخمی نہ ہوں گے۔ اہل ہندوستان اپنے بچوں کے گلے میں بعض جانوروں کے ناخن یا ہڈیاں پہناتے ہیں۔ کیا عجب ہے اس کی بھی علت یہی کچھ ہو۔

(۳) ٹوٹم پرستی۔ یا پرستش فطرت جس میں شجر و حجر دریا اور جانوروں کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس حالت میں پہونچ کے ایک وحشی فیٹش پرستی کو لازمی طور سے ترک نہیں کر دیتا کیونکہ فیٹش پرستی کا رواج دُنیا کی قریب قریب ہر قوم میں تھوڑا بہت ہے۔ بلکہ جب انسان ترقی کر کے اس درجے میں آتا ہے تو زیادہ اعلیٰ اور کم مادی مخلوقات کے ماننے کے عقیدے کو مستزاد کر دیتا ہے۔ اس حالت میں شجر و حجر۔ دریا اور پہاڑ۔ اجسام ذی روح اور اجرام فلکی سب کی پرستش ہونے لگتی ہے۔ البتہ ایک بات یہ ہوتی ہے کہ اعلیٰ معبودوں کی بابت یہ خیال باقی نہیں رہتا کہ اُنھیں جادو منتر کے زور سے قابو میں لاسکتے ہیں۔ تاہم وہ معبود خالق نہیں مانے جاتے۔ نہ وہ نیکیوں کی جزا یا گناہوں کی سزا دے سکتے ہیں۔ فیٹش پرستی اور ٹوٹم پرستی میں فرق یہ ہے کہ ایک میں معبود انسانی صفات سے متصف ہوتے ہیں۔ دوسرے میں مافوق انسانیت سے۔ ایک میں صرف فرد واحد کی پرستش کی جاتی ہے دوسرے میں اُس کی پوری جنس کی یہ مختلف ملکوں کے علم الاصنام میں جو آثار فطرت کے معبود و مسجود ہونے کا خیال نظر آتا ہے وہ اسی عہد کا پتہ دیتا ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض آثار فطرت جیسے نیند۔ خواب۔ دُکھ۔ درد اور موت نے وحشیوں کے دل میں چند غائب اور غیر مرئی قوتوں کے وجود کا خیال پیدا کیا۔ اور اسی خیال میں قومی معلومات کی ترقی سے تخیل نے نئی نئی گلکاریاں کیں اور شاعرانہ مضمون آفرینی سے طرح طرح کے برگ و بار پیدا کیے۔

(۴) شاماں پرستی۔ ٹوٹم پرستی سے شاماں پرستی صرف اس بارے میں جُدا ہے کہ اس میں معبود ہماری اسی زمین پر رہتے ہیں لیکن اُس میں وہ عام طور سے اپنے ایک جُداگانہ عالم میں رہتے ہیں اور وہ اس سے کم سروکار رکھتے ہیں کہ اس عالم میں کیا واقعات ہو رہے ہیں۔ اس طرز کا اشتقاق سائبریا سے ہے۔ جہاں شاماں لوگ اس کے مدعی ہوتے ہیں کہ اُن میں کوئی رُوح حلول کرتی ہے و

اور جس کے مقابلے میں انسان ضعیف البنیان سر اُٹھا نہیں سکتا۔ اس حالت میں کہ انسان اپنی باطنی قوتوں سے بے خبر دوسری مخلوقات کی قوتوں کے بارے میں ایک مبالغہ آمیز اور پُر اسرار تصور میں مبتلا۔ اور غور و فکر اور استدلال کی مشق نہ رکھتا تھا اُس کے

جس کے نام سے وہ بات چیت کرتے ہیں اور جس کے ذریعہ سے وہ سوالات کے جوابات دے سکتے ہیں زمانۂ آیندہ کے بابت پیشینگوئی کر سکتے ہیں۔ اب تک جن ملل عقائد پر ہم نے غور کیا ہی اُن میں جو معبود تھے وہ ہر شخص کو نظر آتے تھے اور ہمارے درمیان میں موجود ہوتے تھے لیکن اب اس درجے میں پہونچ کے مذہب کا کسی قدر بلند تصور ہمارے پیش نظر اور مرکوز خاطر ہوتا ہی۔ اگرچہ یہ نام سائبریا سے نکلا ہے لیکن یہ طرز خیال بہت دور تک پھیلا ہوا ہی اور معلوم ہوتا ہی کہ مذہبی ترقی کے مدارج میں یہ ایک ضروری درجہ ہی۔ اس حالت میں انسان کو یہ تصور ہوتا ہی کہ اُس میں ربانیت سرا کر جاتی ہی اور اُس کے منہ سے جو کچھ نکلتا ہی وہ ایزدی پیغام ہوتا ہی۔ کیونکہ اُس وقت وہ نہ اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے نہ اپنے کانوں سے سنتا ہی نہ اپنی زبان سے بات چیت کرتا ہی یہ حالت قریب قریب وہی ہے جو ہمارے یہاں اکثر لوگوں میں (جن پر جن پری کا سایہ ہوتا ہی یا جو آسیب زدہ کہلاتے ہیں) پائی جاتی ہی۔ اُنھیں میں سے اکثر لوگ یہ لاف و گزاف کرتے ہیں کہ اُن میں خدا اس طرح سما جاتا ہے کہ وہ اُن کو نہایت مخفی خزانوں اور غیب کی باتوں سے مطلع

کر دیتا ہے۔ اور انھیں یہ قوت دیتا ہے کہ وہ جہاں چاہیں خلق کی نگاہوں سے پوشیدہ چلے جا سکتے اور اپنی آواز کو نہایت درجہ بعید فاصلہ پر پہونچا سکتے ہیں۔

(۵) بُت پرستی۔ انسانی ترقی کی ایک شان یہ بھی ہے کہ اُس نے مذہب کی ایک یہ صورت قرار دی کہ کچھ معبود مقرر کرکے اُن کی شکلیں اختراع کیں اور اُن کے آگے سر تسلیم خم کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ سب سے زیادہ وحشی ہیں اور جنھوں نے کچھ بھی ترقی نہیں کی ہے اُن میں بتوں کے پوجنے کا چلن نہیں ہے۔ بلکہ وہ فٹیش پرستی ہی میں پڑے ہوے ہیں۔ فٹیش پرستی میں معبود کا تصور اتنا باعظمت و جلال نہیں کہ انسان اُس کے سامنے سر جھکائے۔ اُس میں تو انسان اتنا زبردست ہوتا ہے کہ اپنے معبود پر اپنا سکہ بٹھا سکتا ہی علی العموم ایک بُت انسانی شکل میں متشکل کیا جاتا ہی۔ اور بُت پرستی کو نہایت قریبی تعلق مذہب کی اُس صورت سے ہے جس میں اسلاف کی پرستش کی جاتی ہے۔ اسکی علت یہ معلوم ہوتی ہے کہ انسانوں کے خیال میں موت اور نیند میں نہایت درجہ مشابہت و مماثلت ہوتی ہے اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح سونے کی حالت میں انسان ع

تخیئل نے انھیں آثار فطرت کو مہیب جانوروں - عفریتوں - دیوزادوں اور پراسرار مخلوقوں کی ڈراؤنی شکلوں میں متشکل کرکے اس کے سامنے پیش کیا -

یہ اصلی تخم ریزی ہے مذاہب کی اور انسان کی ابتدائی زمانہ کی جہالت و وحشت

بے حس و حرکت ہوتا ہے مگر بے جان نہیں ہو جاتا موت میں بھی اس کی کچھ ایسی ہی حالت ہوتی ہوگی اسی وجہ سے اکثر لوگ اپنے مرے ہوئے عزیزوں کو روٹی (یا پنڈے) دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بعد مرنے کے بھی کھانے اور پینے کی خواہشوں میں گرفتار ہیں اور جو کھانا پانی انکے نام پر دیا جاتا ہے وہ بجنسہ انھیں پہونچ جاتا اور ان کے کام آتا ہے - بلکہ بہت لوگ یہ بھی خیال رکھتے ہیں کہ فصل کی چیز جو مرنے والے کو زندگی میں مرغوب تھی وہ ضرور اسکے نام پر نکالی جائے - اور بہت لوگ اپنے عزیزوں کے نام پر پہننے اوڑھنے کے سامان - زیور اور سواریاں اور خانہ داری کی چیزیں بھی نذر کرتے ہیں - اور یہ سب اس لیے کہ مرنیوالے کو دوسرے عالم میں ان سب چیزوں کی ضرورت ہوگی اسی طرح بہت لوگ مردوں سے منتیں مانتے اور دعائیں مانگتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد انکی قوتیں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ جو کام جیتی زندگی وہ نہیں کرسکتے تھے وہ مرنے کے بعد کرسکیں گے - اسی اسلاف پرستی میں بعض قوموں نے اپنے اسلاف کی یاد تازہ رکھنے کے واسطے انکی تصویریں کھنچوائیں اور مجسمے بنوالئے - اور انکو چندے محبت اور شوق کی نگاہوں سے دیکھا - پھر بزرگوں کی عظمت و تقدس کے خیال نے انکی شبیہوں اور مورتوں کو بھی تعظیم و تکریم کا لباس پہنا دیا - اور رفتہ رفتہ یہ عظمت و تقدس کا خیال اخلاف کو اسلاف کی پرستش کے دھرے پر لے آیا - پھر - انسانی ترقی میں جس قدر حکومت و اختیار کے مرکز حاکم اور بادشاہ ہوتے گئے اور جس قدر خودمختاری اور قہاری کی شان ان میں بڑھتی گئی اسی قدر زیادہ ان کے ظل اللہ بلکہ معبود و مسجود ہونے کا خیال مضبوط ہوتا گیا - انکے رعب و جلال سے طبائع ہیبت زدہ اور مرعوب ہوئے اور انکے ادب آداب کا خیال بڑھتے بڑھتے پرستش کی حد تک پہنچ گیا اگرچہ اس اسلاف پرستی کی ابتدا ٹوٹم پرستی کے زمانے سے ہو جاتی ہے مگر یہ اسکے بعد بھی باقی رہتی ہے اور بت پرستی سے لگ بھگ معلوم ہوتی ہے - کیونکہ بت پرستی میں شجر و حجر کی پرستش یا کواکب پرستی کی بہ نسبت عقلی ترقی زیادہ معلوم ہوتی ہے - بڑی بات یہ ہو کہ بت پرستی میں آکے انسان کی عبدیت و معبودیت کا خیال ذرا صاف اور واضح نظر آتا ہے اور اس سے پیشتر بالکل ایک کورانہ اطاعت ہوتی تھی

پر نظر کرکے یہ کچھ بعید از عقل نہین معلوم ہوتا کہ اُس نے اُس نئے عالم مین آکے فطرت کے شکوہ و شان کے سامنے سر نہوڑا یا ہو۔ بہر نوع۔ اس طور سے مذاہب فطرت کی بنیاد پڑی اور اگرچہ متعدد مذاہب فطرت کے تقابل سے یہ بات واضح ہوتی ہی کہ اُن میں باہم کیسا بڑا تفاوت ہی۔ لیکن باایں ہمہ اُن مین جو جزو قدر مشترک ہے وہ اُن سب کو ایک نرمہ مین

بادشاہون کی اطاعت میں سب سے پہلا خیال یہ تھا کہ لوگون نے اپنے بعض ابنائے جنس کو غیر محدود طاقت اور قدرت والا مانا اور ادنیٰ درجے کے لوگون نے اُنھین یہ سمجھا کہ وہ نہ صرف زمین پر بلکہ آسمان پر اور سارے عالم پر قدرت رکھتے ہین۔ لیکن اس خیال کا زور اُس وقت تک نہین ہو سکتا تھا جب تک کہ بادشاہ اور سردار لوگ عوام مین ملے جلتے تھے کیونکہ اُس وقت اُن کے صفات و اعیان میں اسرار نہ تھے بلکہ اس خیال کی ترقی جبھی ہوئی جب انھوں نے طبقۂ عوام سے اختلاط کم کیا (کیونکہ جب تک کچھ امور مخفی اور پُر اسرار نہ ہون مذہب کی جھلک نظر نہیں آتی) حتیٰ کہ یہ خیال بھی پیدا ہونے لگا کہ وہ لوگ فانی نہیں ہوتے اور کسی نہ کسی صورت سے زندہ جاوید ہوتے ہیں۔ چنانچہ تبت کے لاماؤں کی بابت یہی خیال ہے کہ وہ سدا جیتے ہین اور اُنکی رُوح ایک کالبد خاکی سے دوسرے کالبد میں چلی جاتی ہے۔

بت پرستی کی سب سے اعلیٰ شان یہ ہی کہ انسان بتوں کو درحقیقت قابل پرستش نہ سمجھے بلکہ محض دھیان گیان اور یکسوئی خیال کے واسطے انکو پیش نظر رکھے۔ اور جن قومون مین حکمت و فلسفہ

کا چلن ہے اُنکے یہاں مورتی پوجن کی علت اسی قدر ہے کہ وہ ایک ذریعہ اور وسیلہ یکسوئی خیال کے واسطے ہی اور جو شے پیش نظر ہوتی ہے اُسے محض مظہر ربانی سمجھ کے وہ اُس کے سامنے سر جھکاتے ہیں لیکن بت پرستی کے ادنیٰ مدارج مین وہ مردہ پرستی ہی جس میں انسان کو اپنے عزیزوں اور دوستوں کے بھوت پریت ہو جانے کا یقین ہوتا ہے۔ لیکن اس میں بھی دو مدارج ہیں اعلیٰ مرتبہ تو یہ ہے کہ روح کے بابت یہ عقیدہ ہو کہ وہ بوجہ گناہوں میں آلودہ ہونے کے خبیث ہوگئی ہی۔ اور ستاتی ہی۔ اور ادنیٰ مرتبہ میں آسیب و بلا کا عقیدہ ہوتا ہے۔ مثلاً جاہل اور وحشی لوگ صرف اتنا جانتے ہیں کہ انسان مرکے بھوت ہو گیا لیکن وہ عذاب و ثواب اور جزا و سزا کے بابت کچھ نہین سمجھتے بلکہ اُن کے خیالات اسی عالم کو دار الجزا سمجھنے میں محدود رہتے ہین۔ چنانچہ ایسے لوگون کی قسمین کسی عہد شکنی یا دروغگوئی کے بابت اسی دنیا تک کے لیے محدود ہوتی ہیں (جیسے بعض لوگ کہتے ہیں ۴

شمار کرنے کے واسطے کافی ہے اور جس قدر تفاوت ہو اُسکی بابت صاف نظر آرہا ہے کہ
بعض نے مرورِ ایام اور وسعتِ نظر سے ترقی کے کچھ زیادہ مدارج طے کیے ہیں اور بعض نے بہت
کم۔ چنانچہ بعض میں انسان کے روزافزوں علم وآگہی سے اخلاقی خیالات بھی داخل ہو گئے اور
معبودوں کی صورتوں میں انسانوں کے خط وخال اور اُن کے افعال میں انسان کے جذبات
ورجحانات کی جھلک نظر آنے لگی۔ اس میلان میں اس قدر ترقی کی گنجایش تھی کہ بعض مذاہب
میں نہ صرف دیوتاؤں میں اخلاقِ حسنہ اور عقل ودانش کے جوہر دکھائے گئے بلکہ مختلف جذباتِ
انسانی مجسم اور مشخص کرکے معبودوں کی صورت میں ظاہر کیے گئے۔ چنانچہ ہندوستان اور
یونان کے علم الاصنام پر غور کرنے سے اس کا پورا ثبوت ملتا ہے۔ مذاہب فطرت کی اس
حالت کے ساتھ یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ اُن میں آثار فطرت کی پرستش کا رجحان غالب
تھا۔ لیکن مذاہب کی تاثیرات اخلاقی اثروں سے خالی نہ تھیں اور اُن میں اخلاقی تعلیم وتلقین
کا کوئی نہ کوئی شائبہ ضرور تھا۔ یعنی اگرچہ انسان محض آثار فطرت سے مرعوب ہو کے اپنی نگاہ
میں آپ حقیر معلوم ہوتا تھا اور اپنے تذلّل کے اظہار میں اور اپنے کو بلیات سے محفوظ رکھنے
کے خیال سے اُن کے سامنے سر جھکاتا اور اُنھیں مؤثر حقیقی سمجھ کے اُن سے پناہ مانگتا اور سرتی
کا خواستگار ہوتا تھا لیکن یہی رُعب اُسکے بیم ورجا کے جذبات کو بھی برانگیختہ کرتا اور نیکی کرنے اور
بدی سے باز رہنے کا خیال پیدا کرتا تھا۔ اور نکوکاری سے اچھے ثمرات پانے کی امید اور بدکاری
سے بُرا انجام دیکھنے اور گرفتار عذاب ہونے کی دہشت دل میں سمائی رہتی تھی۔ اور قوم میں کچھ
اشخاص فلسفی یا عقلا یا انبیا ایسے پیدا ہو گئے جنھوں نے اپنے تخیل کی بلند پروازی یا عقل کی

ہ کہ ہمارے دیدوں گھٹنوں کے سامنے آئے اگر ہم ایسا
کریں) اسی طرح یہ لوگ مرے ہوے انسانوں سے دعا اور عرض
دعا کا خیال بھی نہیں کرتے لیکن اعلیٰ مدارج میں روح کے
سدا باقی رہنے غیر مقید ہونے اور حاجت روائی کرسکنے کا عقیدہ

ہوتا ہے اور یہ مانا جاتا ہے کہ وہ مرنے کے بعد جس قدر زیادہ خواہشات
وجذبات سے پاک اور تشخصات وتعینات سے آزاد ہو جاتے ہیں اُسیقدر
عالم میں اُن کے تصرفات بڑھ جاتے ہیں اور بوجہ اُنکے برگزیدہ اور
مقرب ہونے کے اُنکی شفاعت دوسروں کی آمرزش کا سبب ہو سکتی ہے

برتری سے اس امر پر نظر کی کہ مذہب کے فطری حصّہ کو اخلاقی حصّہ پر مرجح ہونا اور محض اظہار
تذلّل اور عجز و نیاز پر طہارت قلب اور شایستگی اطوار کو فائق سمجھنا چاہیے۔ یعنی آثار فطرت
کی پرستش کے عوض نفوس انسانی کے تزکیہ پر زیادہ توجہ کرنا چاہیے تو گو ایک وقت میں اُنکی
اخلاقی تعلیم و تلقین سے ایک عام شورش اور برہمی پیدا ہوئی اور لوگوں نے اپنے معبودوں
کی طرف سے ذرا بھی بے توجہی کو سخت گناہ سمجھ کے ایسے لوگوں کو مرتد اور بد دین جانا اور
ان کے درپے آزار ہوے لیکن رفتہ رفتہ کر کے مذہب میں تہذیب اخلاق اور تزکیۂ باطن کے
واسطے جبر نفس اور ریاضات و مجاہدات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور معبودوں کی ذات وصفات
کے تصور میں حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات راہ پانے لگے۔ پھر تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ اخلاقی[۱]
اصول اس قدر غالب ہوتے گئے کہ شایستہ مذاہب میں کورانہ پرستش اور رسم و رواج کی
سخت پابندی اور شعائر مذہبی میں بشدت غلو و انہماک نسیًا منسیًا ہو گیا اور بجز مستثنیٰ اوقات کے
جب کہ تعصب نے معتقدان مذہب میں جوش و خروش پیدا کیا ہو علی العموم دنیا میں اچھی زندگی
کے نمونے پابندان مذاہب نے دکھائے۔ بالآخر۔ اسی خلل و اختلال سے مذہب فطرت کی جگہ
مذہب حسن معاشرت نے لے لی۔ کیونکہ تمدنی ترقی مذہب حسن معاشرت کی تلقین و موعظت کے
واسطے راستہ صاف کر دیتی ہے۔ اور اگرچہ ایسی حالت میں بھی مذہب فطرت کے آثار و یادگار
باقی رہتے ہیں لیکن اُن کا غلبہ اور تفوق قائم نہیں رہتا اور بڑے بڑے معبود فطرت جدید

[۱] اخلاق کو مذہب سے جو تعلق ہے اس کے بارے میں
یہ کہا جا سکتا ہے کہ ادنیٰ قوموں میں چونکہ معبود انسانی صفات
سے متصف بلکہ بعض اوقات محض بلیات ہوتے ہین اس سبب
سے وہ لوگ گناہ اور معصیت کی طرف سے بے پروا ہوتے
ہین اور جب تک وہ نذر نیاز کے ذریعے سے اپنے معبودون
کو راضی رکھتے ہین دار و گیر سے مطمئن رہتے ہین۔ یہی
وجہ ہے کہ اُن لوگون مین شیطان یا ایسے کسی گمراہ کرنے
والے یا بھٹکانے والے وجود کا خیال بھی نہین ہوتا۔
بعض اہل تحقیق کا خیال ہے کہ ادنیٰ درجے کی قومون مین
چونکہ مساوات کا خیال غالب ہوتا ہے اور جہالت علمیت
مفلسی و توانگری۔ غلامی اور مولائی کے جھگڑے
بکھیڑے نہین ہوتے نہ وہ کاروبار یا پیشہ و ہنر کی ۲

خیالات وموجودات کے ایک تصورِ محبت کے سامنے پادرہوا ہوجاتے ہیں لیکن ایک دو صورت سے پھر بھی کچھ معبود ایسے باقی رہ جاتے ہیں جن سے انسان اپنے بیم ورجا کے خیالات وابستہ رکھتا ہے٭ مصیبتوں میں ان سے عرض حاجت کرتا ہے تکلیفوں میں اُنکی دوہائی دیتا ہے۔ پریشانیوں میں اُنکی منتیں مانتا ہے۔ عہد ومواثیق میں اُنکے ناموں پر حلف اُٹھاتا ہے۔ اور کامیابیوں اور مسرت کے موقعوں پر اُن پر نذر ونیاز چڑھاتا ہے۔ یہ وہ درجہ ہوتا ہے جس میں آثار فطرت کی جگہ ارواح۔ ائمہ۔ مؤکل۔ ملائکہ۔ یا اولیا وشہدا آجاتے ہیں کیونکہ اُس وقت یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ تمام عالم ایک ما فوق الفطرۃ ذات کے تصرف واختیار میں ہے اور وہی سرچشمۂ خلاق حسن ہے اور یہ ارواح وملائکہ وغیرہ اُسکے برگزیدہ مخلوق ہیں جنھیں خاص اعلیٰ قوتیں عطا کی گئی ہیں یا جنھوں نے اپنے ریاضات ومجاہدات سے اپنی روح کو پاک وصاف اور قوی تر بنا لیا ہے۔ اس حالت تک پہونچ کے مختلف جماعتیں اس وجہ سے متحد ہوجاتی ہیں کہ وہ نجاتِ ابدی کے ایک ہی اصول کی ماننے والی ہیں اور اُنکے اتحاد کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ اُس اصول کو قائم رکھیں۔ اُسکی نشو ونما کریں۔ اُسکی دعوت دیں اور تبلیغ کریں اور اُسی پر سب کو کاربند کرائیں اس طور سے یہ مذاہب اشخاص منفرد کے ہاتھوں قائم ہوتے ہیں اور پھر دوسری نسل کے لوگ اُسکے آئین وضوابط مقرر کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اُنکے اصل اصول الہام یا وحی کے ذریعہ سے اُن تک پہونچے اور جس شخص نے اُنکی تبلیغ کی ہے وہ کوئی واجب التعظیم رسول یا نبی تھا

٭ تقسیم ہوتی ہے جو لازمۂ تمدن ہے اس لیے اُن میں ارتکاب جرائم کی ترغیب کے نہ سامان ہوتے ہیں نہ زیادہ معائب اور اس لیے اُن میں اخلاقی قوت زبردست ہوتی ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمدن کی ترقی سے انسان کے اخلاق خراب اور اُن میں عیوب پیدا ہوجاتے ہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ تمدن تو صرف ہمارے سامانوں کو بڑھاتا ہے۔ ہماری عزمیتوں کو بلند کرتا اور ہم کو ایک اعلیٰ اور عمدہ زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے۔ اب اگر ادنیٰ قوموں میں بوجہ بےسامانی کے بعض عیوب نظر نہیں آتے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے درند وپرند جملہ بہائم دوحوش کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بالکل معصوم ہوتے ہیں۔ لیکن ہم اُن میں کوئی اخلاقی قوت نہیں پاتے

بلکہ بعض اوقات جوش عقیدت میں وہ اُسی کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ زمانۂ حال کے اہل تحقیق مذہب کو انسانی اختراع مانتے اور اُس کی ترقی کو انسانی تمدن اور علم کی ترقی سے وابستہ جانتے ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ جن مقامات پر تمدن کے معتدبہ اجزانے ترقی کی لیکن اُسی تناسب سے حقائق اشیا کا علم نہیں بڑھا (جیسے پیرو اور میکسیکو میں) وہاں ایزدی قوت اور قدرت کے بابت تو زیادہ صحیح خیال پیدا ہوا لیکن اُسکی ماہیت ذات کے تصور میں کچھ ترقی نہ ہوئی۔ اور اس وجہ سے وہاں مذہب پر ہول اور وہشت غالب رہے اور انسان کو اپنے ضعف و کمزوری کا احساس زیادہ رہا۔ پھر تدریج جس قدر نوامیس فطرت اور اشیاء کی حقیقت و ماہیت کا علم بڑھا انسانی نفوس میں زیادہ کشادگی اور قوت بڑھتی گئی۔ مثلاً اوّل اوّل انسان کو یہ خیال پیدا ہوا کہ خدانے اس زمین کو پانی کے اندر سے اُبھارا اور اُسے انسانوں کا مسکن بنایا۔ بعد ازیں اُس نے یہ سمجھا کہ زمین اور پانی

ــه اہل تحقیق نے مذہب کی بابت جو رائے قائم کی ہے اُس کے متعلق اتنا کہدینا ضرور ہے کہ جس قدر نتائج اُنھوں نے نکالے ہیں وہ محض قیاسی ہیں اور منطقی اصطلاح میں قیاس مفید یقین کو نہیں ہوتا۔ جو شہادت اسوقت ہمارے پیش نظر ہے اُس سے یہ کسی طرح یہ پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتا ہے کہ مذہب کُلیتہً ایجاد بندہ ہے۔ اہل مذاہب کا یہ دعوی کہ اُنھیں مذہب کی تعلیم بذریعہ وحی والہام ہوئی ہے۔ اس شہادت سے باطل ثابت ہوتا ہے۔ وہ اس کے مدعی ہیں کہ مذہب اور سچا مذہب وہ ہے جس کی تبلیغ کسی نبی برحق یا رسول برحق نے کی ہو۔ اور اسکے علاوہ جس قدر عقائد و ملل ہیں وہ مذہب کے نام سے موسوم کیے گئے ہیں لیکن درحقیقت وہ انسان کے واہمہ خلاق کی طبعزاد ہیں اور اہل تحقیق نے محض اُن کی وجہ سے دھوکا کھایا اور کُل مذاہب کا ایک سلسلہ قائم کرکے سرے سے مذہب کو انسانی اختراع سمجھ لیا ہے۔ اس دعوے پر دلیل یہ ہے کہ جس قدر نبی برحق سلف سے اب تک گذرے ہیں وہ سب بلاکسی استثناء کے اپنے زمانے کے نہایت برگزیدہ۔ صاحب تقویٰ و طہارت۔ متصف بامانت و دیانت راست گو۔ خوش معاملہ۔ حرص و ہوا سے بری۔ مال و منال کی طمع سے پاک عزت شوکت جاہ و حشمت کے شوق سے دور تھے۔ اُن کی عمریں بکمال صفائی اور پاکی سے بسر ہوئیں۔ انھوں نے

دونوں ایزدی قوت سے خلق ہوئے۔ کچھ دنوں وہ محض بلّیات کو معبود مانتا رہا مگر بعد چندے اُس نے خیر وشر دونوں قسم کے معبودوں کا وجود تسلیم کیا۔ اور پھر اُس نے صرف خیر مجسم معبود کو خدا مانا دیگر معبودوں کو اُن کا مطیع یا اُس کی درگاہ سے راندہ ومنحرف اور ضال ومضل سمجھا پہلے اُس نے صرف بھوت پریت اور

نہایت سادگی اور مسکنیت سے زندگی ختم کی اور ہمہ وقت اُن کی کوشش اور ہمت اس پر مصروف رہی کہ بنی آدم صلح وامن اور ہمدردی ومؤانست باہمی سے بسر کریں۔ اُن میں پاکیزہ اخلاق وعادات پیدا ہوں اور وہ حُسنِ معاشرت کی صراطِ مستقیم پر چلیں۔ لوگوں نے انھیں ایذائیں پہنچائیں۔ تکلیفیں دیں۔ مجنون ودیوانہ کہا۔ ساحر اور جادوگر بنایا۔ لیکن اُنھوں نے برا نہ مانا۔ اور اپنا کام کرتے رہے۔ ایسے لوگوں نے نبوت یا رسالت کا دعوےٰ کیا لیکن اس دعوے کی وجہ سے نہ کوئی نفع اُٹھایا نہ کچھ چین پایا۔ بلکہ محض اسی دعوے کے سبب سے اہل زمانہ اُن کے درپئے آزار ہوئے۔ پس عقل اسے قبول نہیں کرتی کہ ایسے بزرگ برگزیدہ معصوم اور خوش اخلاق انسان جن کی سچائی اور بے غرضی کو زمانہ مانے ہوئے تھا عمر بھر میں اگر کچھ جھوٹ بولے تو اُسی قدر کہ نبوت کے مدعی ہوئے۔ پھر مذاہب الہامی کی مسلسل تاریخ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اکثر انبیا نے اپنے مابعد انبیا

کی تصدیق اور اپنے مابعد آنے والوں کی پیشین گوئی کی اور اُن کی شریعتوں نے ماسبق شریعتوں میں ترمیم واصلاح کی۔ اور یہ ترمیم واصلاح بہ اندازۂ قوم کی عقلی ترقی کے ہوا کی۔ لیکن ان سب میں توحید۔ نبوت۔ جزا وسزا کے مسائل قدر مشترک رہے۔

اس مقام پر یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ قریب قریب کل شایستہ مذہبوں میں (یعنی ایسے مذہبوں میں جنھیں اپنے الہامی ہونے کا دعوےٰ ہے) کوئی ایک بھی ایسا نہ ہوگا جن میں متعدد امور اعتقادی اور مسائل ایسے نہ ہوں گے جن کو عقل انسانی نے پورے طور پر نہ سمجھا ہوگا یا نہ سمجھ میں آنے کے قابل مانا ہوگا بلکہ اُن کی بابت یہی کہا گیا ہوگا کہ وہ انسان کے فہم سے بالاتر اور اُس کی عقل نارسا سے دُور ہیں۔ یعنی شرط ایمان بودو زش ایمان بالغیب۔ بہ الفاظِ دیگر۔ قریب قریب کُل الہامی مذاہب میں جو امور معمولی انسان کے فہم میں آنے والے

آسیب بلا کو اپنے لیے باعث پریشانی اور اپنے سے زیادہ صاحب قدرت مانا۔ پھر بتدریج اُس نے صرف ارواح طیبہ کو قادر و مقتدر جانا اور بالآخر اس عقیدے کو ایک کریم و رحیم اور عادل ہستی کے عقیدے سے ملا کے اُس نے اخلاق کو مذہب سے پیوند کیا۔ اس سلسلے پر نظر کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر

ہیں وہ تو صاف صاف بیان کر دیے گئے ہیں اور جو اُس سے بالاتر ہیں اُن کی بابت یہ کہہ دیا گیا ہے کہ اُن کی کُنہ و حقیقت پر غور و تامل کی حاجت نہیں۔ اُنھیں بے دلیل و حجت مان لینا چاہیے۔ اب اگر مسائل مذہبی صرف انسانی تخئیل کے طبع زاد ہوتے تو لازم تھا کہ وہ معمولی فہم انسانی سے بالاتر نہ ہوتے اور کم از کم یہ تھا کہ جو لوگ نبوت یا رسالت کے مدعی تھے وہ خود اس کا دعوے کرتے کہ ہمارے فہم و ادراک میں اُن اُمور کی کُنہ حقیقت آ گئی ہے۔ برخلاف اس کے انبیاء معصومین نے ان امور میں اپنی عقل کی نارسائی کا اعتراف اور "ماعرفناک" کہہ کے اپنا عجز ظاہر کیا ہے۔ بلکہ جس نبی اُمّی نے اس کا دعوے کیا ہے کہ وہ خاتم الانبیاء ہے اور اُس کا دین کامل و اکمل ہے اُس نے خود اپنے بارے میں خدا کی طرف سے لوگوں کو یہ پیغام پہنچایا ہے کہ "میں صرف ایک بشر ہوں تم جیسا البتہ میں اپنے خدا کا ایک پیغام بر ہوں کہ اُس کے حکم تم تک پہنچاتا ہوں"۔

نہ صرف اسی قدر۔ بلکہ عقل انسانی کو ہمیشہ ترقی کُن ماننے کے بعد یہ لازم ہے کہ جو امور ایک وقت معمولی فہم انسانی سے بالاتر تھے چاہیے تھا کہ دوسرے زمانے کے انسان اُن کے سمجھنے سے قاصر رہتے جیسا کہ کل مسائل فلسفہ و حکمت کے بارے میں ہوا برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ الہامی مذاہب کے اکثر عقائد و احکام کی حقیقت و ماہیت اور علت ہمیشہ کنز مخفی رہی۔ پھر الہامی مذاہب کی تاریخ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ ہر قوم کی شائستگی اور عقلی ترقی کے لحاظ سے اُس کے واسطے شرعی تکلیفات مقرر کی گئیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ مذاہب میں بھی ترقی ہوئی اور اگرچہ مہمات عقائد میں سب یکساں رہے لیکن معاملات و عبادات میں متواتر تبدیلیاں ہوا کیں حتّٰی کہ بنی آدم پر ایک ایسی شریعت نازل ہوئی جو اُن کے لیے ابد الآباد تک کافی و وافی ہوگی اس میں اتنی آزادی ہے کہ وہ دنیا کے معاملات میں خلل انداز

انسان بلحاظ علمیت و تمدن ترقی کرتے گئے اُن کا مذہب پاک و پاکیزہ اور بلند ہوتا گیا اور اسی سے یہ عقدہ بھی حل ہوتا ہے کہ سائنس میں جس قدر اضافہ ہوتا جائے گا (یعنی جس قدر انسانوں کے علوم میں یقینیات اور متحقق اُمور زیادہ ہوتے جائیں گے) اُسی قدر اُن کا مذہبی خیال اوہام و وساوس سے پاک وصاف اور ارفع و اعلےٰ

اور انسانی ترقیات میں مزاحم نہیں اور اس میں اتنا لوچ ہے کہ وہ سوسائٹی کے ہر طبقے اور ہر فرد واحد سے ہر حال میں سازوار ہوسکتی ہے۔ اسی شریعت نے دُنیا میں ایک اعلیٰ تمدن قائم کیا اور عالم میں شائستگی کا ایک نیا دَور شروع کیا۔

اب صرف دیکھنا یہ ہے کہ اہل تحقیق نے جو مدارج مذاہب کی ترقی کے بیان کیے ہیں اور جیسے وہ مذہب کو انسانی اختراع ثابت کرتے ہیں اُن کے بارے میں اہل مذاہب کیا کہہ سکتے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ خدا کی اتنی بڑی کائنات اور اس کی بعید ونہایت مخلوقات کے حالات پر غور کرنے سے ہم پر یہ راز منکشف ہوتا ہے کہ دنیا میں مذہبی خیالات کے دو مبدأ وماخذ ہیں۔ ایک الہام و وحی اور دوسرا خود نفس انسان کے تخیل۔ انسان بدو فطرت سے با مذہب پیدا ہوا ہے اور اُس کے دل میں یہ خیال ضرور کھٹکتا رہتا ہے کہ وہ اس عالم اجسام کے سوا جس کے حرکات ہم روزمرہ مشاہدہ کرتے ہیں کوئی اور عالَم

بھی ہے جو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہے وہی عالم محرک ان حرکات کا کلیۃً یا جزئیۃً ہے اور اسی عالم سے ہمارے رنج وراحت۔ غربت وامارت بیماری وصحت وابستہ ہوتی ہیں اور اسی کے سبب سے اس عالَم کون وفساد میں ہر قسم کے تغیرات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ درخت خود بخود بڑھتا ہے وقت معینہ پر پھول پھل لاتا ہے۔ پھر بے برگ وبار ہوجاتا ہے۔ انسان ایک حالتِ مجبوری میں پیدا ہوتا ہے پھر عقل وہوش حاصل کرتا ہے۔ دُنیا میں اپنی جسمانی اور روحانی قوتوں سے ایک چہل پہل پیدا پیدا کرتا ہے اور پھر یکایک اُٹھ جاتا ہے۔ اَب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان حرکات کا صدور کس سے ہوا۔ یہ اور اسی قسم کے بہت سے کرشمے قدرت کے ہیں جن کی علّت وغایت ہر انسانی گروہ اپنی سمجھ اور عقل اور اپنے علم کے موافق قرار دے لیتا ہے اور اُسی کے مطابق اُس کے بیم ورجا کے جذبات اور اُسکے غم ومسرت کے خیالات پیدا

ہوتا جائے گا۔ یہ وہ بات ہے جس کا ثبوت صرف ادنیٰ درجے کی قوموں میں نہیں ملتا بلکہ شائستہ اور متمدن قوموں کے حالات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً اکثر ترقی یافتہ قوموں میں بھی جہالت کی زیادتی نے سحر وافسوں اور ٹونے ٹوٹکے کے عقائد پھیلا دیے تھے لیکن سائنس کی ترقی سے وہ سب عقائد باطل ثابت ہوئے

ہوتے ہیں۔ انسان کی عقل اسباب وعلل کے سلسلے کو ایک حد تک پہنچا کے تھم جاتی ہے اور بالآخر وہی حیرانی جو شروع میں تھی اُس کی طبیعت کو پریشان کرنے لگتی ہے۔ ایسے وقت میں اُس کی مخلصی کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو نبی برحق اور اس کی شریعت کے ذریعہ سے وہ ان اسرارِ مخفی سے مطلع ہوتا ہے اور اُس کی طبیعت قرار وسکون پاتی ہے یا خود اُس کا واہمۂ خلاق اُس کے واسطے تسکین خاطر کا سامان مہیا کرتا ہے اور اُسے انسان کے تذلل اور عجز کا یقین دلا کے عالم طبیعی کے اجسام فانی کی ظاہری شان وشوکت سے مرعوب کر دیتا ہے اور وہ اُنھیں کو عالم میں مقتدر اور متصرف سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ یہ بات اہل مذاہب کے مقدس صحیفوں سے بھی ثابت ہے۔ پس۔ اہل تحقیق نے جس امر کو اتنی جستجو اور کدوکاوش کے بعد دریافت کیا ہے اُس کا پتہ ایک صحیفۂ نازلہ میں بخوبی لگتا ہے۔ اور اہل مذاہب کو اس امر کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا کہ

جس وقت تک کوئی قوم کسی نبی برحق کی تعلیم وتلقین سے بہرہ مند نہیں ہوتی اُس کے افراد محض اپنے واہمہ کی خلاقی پر چھوٹے ہوئے ہوتے ہیں اور اس وجہ سے اُن کا دارومدار تمام تر اوہام باطلہ پر ہو جاتا ہے اور اب اس بات کا فیصلہ کہ وہ اوہام کس قدر عقل ودانائی سے دُور یا نزدیک ہوں گے صرف اُس قوم کی عام معلومات اور اُس کے تخیل کے زور وقوت کے تناسب ہوگا جو قومیں جہالتِ مفرط میں ڈوبی ہوئی بہائم صفت ہوں گی اُن میں مذہبی خیالات بھی ہر سروحشیانہ وظالمانہ ہوں گے اور جو قومیں علم وآگہی کے ثمرات سے مالا مال ہوں گی اُن کے معتقدات مذہبی میں بھی شائستگی ہوگی اور اُن کی رسموں میں سفاہت اور اُن کی عادتوں میں سفاکی نہ ہوگی۔ پس اہل تحقیق کے مقابلے میں اہل مذہب کا سلسلۂ استدلال یہ ٹھہرے گا کہ خداوند کریم کی عادت یوں جاری ہوئی ہے کہ وہ بنی آدم

اور لوگوں نے ایسے عقائد سے انحراف کیا۔ اسی بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ لوگ تنگ خیال ہیں جو سائنس کو حقائق مذہبی سے مخالف سمجھتے ہیں۔ محض کوتاہ نظری

کی ہدایت کے واسطے ہر وقت ایک نبی مبعوث کرتا رہتا ہے اور ہر قوم کے واسطے اُس نے ایک نہ ایک ہادی ضرور بھیجا ہے۔ اس ہادی برحق اور نبی معصوم کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ خدائی احکام بندوں تک پہنچائے اون کو نیکی اور بدی کی راہ دکھائے اور اپنے افعال واقوال سے ایک نمونہ حسنِ خلق ومعاشرۃ کا اُن کے سامنے پیش کرے اس نبی کی زندگی اور اس کے مرنے کے بعد بھی ایک گروہ اُس کے معاون اور حمایتی لوگوں کا دنیا میں رہتا ہے کہ وہ اس کی پیروی کرے اور خلق کو دین کی راہ پر لگائے۔ لیکن چونکہ انسان ظلوم وجہول پیدا ہوا ہے اور اس کے سینے میں آرزووں بھرا دل دیا گیا ہے کہ جسے عقل سلیم کے مطیع کرنے یا نہ کرنے کا اختیار اُسے حاصل ہوتا ہے لہذا وہ بے راہ چل نکلتا ہے اپنے ہادیوں کی تلقین کو دل سے فراموش کر دیتا اور ضلالت میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کی امت نے چند ہی روز میں اُن کے ارشادات کو بھلا دیا اور شرک میں مبتلا ہو کے گوسالہ پرستی شروع کر دی۔ حضرت عیسیٰؑ کی امت نے اُن کو خدا کا بیٹا قرار دیا اور انھیں کی پرستش کرنے لگے۔

اب صرف یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ وہ مذاہب جو الہامی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اُن کے ماننے والے بھی بہت سے خلاف عقل معتقدات وخیالات میں ڈوبے ہوے اور سراسر وحشیانہ وجاہلانہ رسموں اور رواجوں میں جکڑے ہوے کیوں نظر آتے ہیں۔ تو تھوڑے غور سے یہ عقدہ حل ہو جاتا ہے کہ قریب قریب کُل مذاہب کی تبلیغ ایسے وقت شروع ہوئی جبکہ وہ قوم جو اوّل اوّل مخاطب صحیح بنائی گئی تھی کفر وضلالت میں شرابور تھی اور اُس کے کُل افراد نے ایک ہی وقت میں ایک ساتھ اُس مذہب کو اختیار نہیں کر لیا تھا اس وجہ سے اکثر اوقات انسانی طبائع کے رجحاناتِ مختلف نے اصل مذہب کی شان بدل دی اور بہت سی وہ باتیں جزءِ مذہب بنا دیں جو درحقیقت مذہب کی منافی تھیں۔ پھر جب وہ مذہب مختلف ذریعوں سے دوسری قوموں اور ملکوں میں پہنچا تو خصوصیات قومی وملکی کی تاثیر نے

ہے۔ سائنس صرف مذہبی غلطیوں اور خطاؤں کی دشمن اور اوہام و وساوس کی رقیب ہے۔ اور سچا مذہب وہی ہے جس کی بنیاد سائنس اور حکمت کے اوپر قائم ہو۔

جلوہ گری دکھلائی اور جس طرح ایک تخم مختلف زمینوں میں جدا گانہ رنگ و بو اور ذائقہ پیدا کرتا ہے اسی طرح مذہبی خیالات میں رنگا رنگی پیدا ہوگئی۔ وہ دین جس نے شرک کی بنیاد اکھیڑ ڈالی تھی جس کے ابتدائی پیرووں نے توحید میں اتنا اپنے آپ کو رنگ لیا تھا کہ اس درخت کو جس کے نیچے جناب رسول خدا صلعم گاہ بہ گاہ تشریف رکھتے تھے اور جسے بعد وفات آنحضرت صلعم کے

حضرت کی اصحاب محبت و عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے محض اس سبب سے کٹوا ڈالا تھا کہ کہیں اسلام میں خدا پرستی کے عوض شجر پرستی نہ شروع ہو جائے ہندوستان میں آکے اس کی یہ نوبت ہوگئی کہ آج ایک درویش کی جبہ و عبا کی پرستش کی جاتی ہے۔ لیکن کیا اس سے مذہب کے دامن پر کوئی دھبہ لگ سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ سب انسان کی اختراع ہے اور اہل ایمان اور صاحب بصیرت اسے ہرگز داخل مذہب نہیں سمجھتا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ تمدّن

مقدمۃُ الکتاب

باب اوّل

علوم انسانی کی عظیم الشان شاخوں میں صرف تاریخ ہی کی شاخ ایسی ہو جس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور جو سب سے زیادہ مقبول و پسند ہوئی ہے اور عام راے یہی معلوم ہوتی ہے کہ بحالتِ مجموعی مورخین کی کامیابی اُسی قدر ہوئی ہے جس قدر اُنھوں نے محنت و مشقت کی ہے" اور یہ کہ جس قدر اس مبحث پر غور و فکر اور مطالعہ سے کام لیا گیا ہے اُسی قدر زیادہ وہ سمجھ میں بھی آیا ہے۔

تاریخ کی قدر و منزلت کے بارے میں جو کچھ اعتبار و اطمینان ہے وہ عام طور سے پھیلا ہوا ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخیں کس قدر کثرت سے پڑھی جاتی ہیں اور تمام سلسلہ ہاے تعلیمی میں اُن کا کتنا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ پھر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک طور پر یہ اعتبار و اطمینان نہایت معقول اور بجا بھی ہو نہ اس بات سے انکار

ہو سکتا ہے کہ جو سامان جمع کیے گئے ہیں وہ (اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو) بظاہر بیش بہا اور خوش آیند معلوم ہوتے ہیں۔ یورپ کے تمام بڑے بڑے ملکوں اور یورپ سے باہر بھی اکثر ملکوں کی مُلکی (پولیٹکل) اور فوجی (ملیٹری) سرگزشت پارینہ نہایت ہوشیاری سے جمع اور خوش اسلوبی سے مُدوّن کر لی گئی ہے اور جس شہادت پر وہ مبنی ہے اُس کی بخوبی چھان بنان ہو چکی ہے۔ توضیع قوانین کی تاریخ پر بھی بہت کچھ توجہ صرف کی گئی ہے اور اسی طرح مذہب کی تاریخ پر بھی۔ پھر اس سے کچھ گھٹ کے گرتا ہم کافی طور سے علوم تجربیہ (سائینس) علوم ادبیہ (لٹریچر) فنون نفیسہ۔ ایجاداتِ مفیدہ اور بالآخر انسانوں کے چال چلن اور اُن کے آرام و آسایش کے طریقوں کے مدارج ترقی کے دریافت کرنے پر بھی بہت کچھ محنت کی گئی ہے اور اس غرض سے کہ ازمنۂ ماضیہ کے متعلق ہمارا علم وسیع ہو جائے ہر ایک قسم کے آثار قدیمہ کی جانچ پڑتال کی گئی۔ جن مقامات پر کسی قدیم زمانہ میں شہر بسے ہوے تھے وہ جگہیں کھود کر مٹے ہوے نشانوں کا کھوج لگایا گیا۔ پُرانے سکّے زمین کے اندر سے نکالے اور پڑھے گئے۔ کتابے اور نوشتے نقل کیے گئے۔ قدیم حروفِ تہجی قائم کیے گئے۔ ہیرو غلیفیون[۱] میں معنے پہنائے گئے۔ اور بعض حالات میں مدت کی

[۱] اہل تحقیق کہتے ہیں کہ انسانی خیالات کو حسِّ بصر کے ذریعے سے ایک سے دوسرے تک پہونچانے کے واسطے سب سے پہلے جو ترکیب ایجاد ہوئی وہ تحریرِ تصویری تھی۔ مثلاً جب کسی جانور کا تصور دوسرے کے ذہن پر حالی کرنا ہوتا تھا تو اُس جانور کی صورت بنا دیتے یا اختصار منظور ہوتا تو اُس کے سر اور سینگ کا نقشہ کھینچ دیتے انھیں خطوطِ تصویری کو ہیرو غلیف کہتے ہیں۔ بالفعل یہ بات مسلّم الثبوت ہے کہ اکثر اقوامِ عالم نے اپنے خیالات کو ایک مستقل اور عالمگیر طریقہ سے سمجھ میں آنے والی شکل میں ظاہر ہونے کے لیے ہیرو غلیف ایجاد کیے تھے اور یہ بھی تحقیق ہو گیا ہے کہ تدریج انھیں ہیرو غلیفیوں کی شکلوں میں تغیرات ہوا کیے حتیٰ کہ جن چیزوں کی طرف وہ اشارہ کرتے تھے اُن میں اور اُن کی تصویروں میں بظاہر کوئی تعلق باقی نہ رہا اور رفتہ رفتہ کر کے وہ اُن آوازوں تک کے مُظہر ہو گئے جن سے اُس شے کو بول چال میں پکارتے تھے لیکن اس تبدیلی سے وہ نقوش حروف (دیکھو صفحہ ۲)

بھولی بسری زبانوں کی از سرِ نو ترتیب و تنظیم کی گئی۔ بہت سے وہ قوانینِ قواعد جن کے بموجب زبانِ انسانی میں تبدیلیاں ہوتی ہیں دریافت کرلیے گئے اور اُن کے ذریعہ سے ماہرینِ علم اللسان

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱) بالکل معدوم نہیں ہوگئے بلکہ اپنے اصلی مفہوم کے ادا کرنے کے واسطے تھوڑے بہت استعمال میں رہے۔ چنانچہ چین میں اب تک حروف و نقوش دو طرح جدا جدا مستعمل ہیں۔ خطوطِ تصویری مفرد و مرکب الفاظ و تصورات سب کے مفہوم ادا کرتے تھے۔ جیسے آفتاب کے واسطے ایک دائرہ بنا کے اُس کے بیچ میں ایک نقطہ دیتے ماہتاب کے واسطے ہلالی شکل جس کے اندر ایک لکیر ہوتی ہے۔ پہاڑ کے واسطے برابر برابر تین چوٹیاں بنا دیتے۔ بارش کے واسطے ایک مدوّر لکیر بنا کے اُس کے نیچے کچھ قطرے ٹپکتے دکھا دیتے۔ پھر انھیں کے ترکیب دینے سے مرکب تصورات ادا کیے جاتے جیسے آنکھ اور پانی کی شکلیں بنانے سے آنسو مراد لیتے۔ ایک کان اور ایک دروازے کی شکل بنانے سے سُننے اور سمجھنے کا خیال ادا کرتے۔ اسی طرح مجازہ استعارہ کا بھی کام نکالا جاتا جیسے ہاتھ کی شکل بنانے سے کاروباری آدمی مراد ہوتا۔ وقس علیٰ ہٰذا۔ اسی طور سے اوپر نیچے کا خیال صرف ایک لکیر اور ایک نقطے سے ظاہر کیا جاتا نقطہ اوپر ہوا تو فوق مراد لیا اور نیچے ہوا تو تحت۔ انھیں خطوطِ تصویری کو بعد چندے ایک

نہ ایک نام عطا ہوا کیونکہ ہر شے کو انسان کسی نہ کسی طرح پکارتا تھا اور چند مدت میں وہ ان خطوط کو بھی اسی طرح پکارنے لگا۔ رفتہ رفتہ کرکے جداگانہ لفظ اور اُسکے ردّ و بدل سے حروف ہوئے۔

۵۲ علم اللسان (فائلالوجی) وہ علم ہے جس میں فنِ السنۂ عالم سے بحث کی جاتی ہے مختلف زبانوں کے قواعد صرف و نحو الفاظ کے مادہ اشتقاق اصطلاحی اور لغوی معنوں اور ادائے مطالب کے طریقوں پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ متعدد زبانوں کی ساخت اور ترکیب کے تقابل کرنے اور طبقات و درجات میں ترتیب دینے سے ایسے کلیات قائم ہوجاتے ہیں جن سے زبان کی پیدائش اور نشو و نما کا حال کھل جاتا ہے۔ ایک زمانہ میں یہ خیال دائر سائر تھا کہ زبان بنی آدم کی خود ایجاد کی ہوئی ہے یعنی جب انسانوں کو یہ معلوم ہوا کہ اُن کے بسرعت بڑھتے ہوئے تصورات اُن کے جسمانی اشارات اور چہرے کے تغیرات سے بخوبی ادا نہیں ہوسکتے تو انھوں نے حلق سے ایسی آوازیں نکالنی شروع کیں جن کے معنی معہود ذہنی ہونے کے سبب سے باہم سمجھ میں آجاتے تھے۔ اسی کے مقابل اہلِ مذاہب کا یہ خیال تھا کہ زبان منجانب اللہ ہے اور خدا ہی نے (صفحہ ۴ دیکھو)

کے ہاتھوں اُن تاریک زمانوں کے حالات معلوم کرنے کا کام لیا گیا جبکہ ابتداءً قومیں

رکھے اور براہ راست انسان کو سکھائے ہیں۔

آجکل کی جدید تحقیق نے ان دونوں نظریوں پر یہ حاشیہ چڑھایا کہ جس قدر شواہد ہیں اُن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زبان فی البدیہ اور برجستہ طبعزاد انسانی فطرت کی ہر اور انسان کی جسمانی اور ذہنی ساخت اور ترکیب کا لازمی نتیجہ ہے اور اسی طرح اُس کے لیے خاصۂ فطرت سے ہے جیسے چلنا پھرنا۔ کھانا پینا۔ سونا جاگنا۔ اور اُسکی مرضی اور ارادے سے وہ اسی قدر آزاد ہے جس قدر اُس کے قد و قامت کی درازی یا بالوں کی رنگت ہے۔

مختلف اقوام عالم کی زبانوں کے تقابل نے ہر زبان کے ماخذ عیاں کر دیے ہیں اور فی الحال یہ رائے بہت مقبول ہے کہ کُل شائستہ زبانوں کا مبدأ یا ایرین زبان ہے یا سمیاطیقی اور جن قوموں میں ان کی شاخیں پھیلی ہیں اُنھیں نے تمدن کے اعلےٰ مدارج طے کیے ہیں۔ انھیں دونوں کے تحت میں جو زبانیں ہیں اُن میں تصریف اور گردان کا قاعدہ جاری ہے اور ایک مادہ سے متعدد الفاظ مشتق ہوتے اور جداگانہ طرز سے اپنے مطالب ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں سے ایرین زبان سے ہندوستان۔ فارس افغانستان۔ کردستان۔ بُخارا۔ اسپین۔ پرتگال۔ برٹینی۔ اسکاٹ لینڈ۔ آئرلینڈ۔ فرانس اطالیہ۔ یونان۔ روس۔ پولینڈ۔ جرمنی۔ انگلستان ہالینڈ۔ ڈنمارک۔ سوئیڈن۔ ناروے وغیرہ کی زبانیں نکلی ہیں اور سمیاطیقی زبان سے عربی۔ عبرانی شامی وغیرہ۔ علاوہ ان دو بڑی قسموں کے ایک قسم وہ ہے جس میں کلمات مفردہ ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ چینی زبان سربرآوردہ ہے اور اسی کے ذیل میں تبت۔ سیام۔ انام اور برہما کی زبانیں ہیں اور جاپانی زبان اور کوریا کی زبان مشتبہ حالت میں ہیں پھر ایک اور قسم کی زبان ہے کہ جس میں تورانی شاخ زیادہ نمایاں ہے اور اُس میں ایشیا۔ یورپ اور اُشنیا کی وہ سب زبانیں بہ استثناء چینی زبان کے شامل ہیں جو ایرین اور سمیاطیقی سے مشتق نہیں ہوئی ہیں۔ اور علاوہ ان کے افریقہ کی اکثر زبانیں بھی اسی زمرے میں ہیں یعنی افریقہ کی جو زبانیں سمیاطیقی نسل سے جدا ہیں وہ اس کے تحت میں آتی ہیں۔

السنۂ عالم کی اس تحقیقات سے سب سے بڑا کام جو نکلا ہے وہ یہ ہے کہ اقوام عالم کی ہدایت اور اُن کی بہت قدیم تاریخ کی بابت نہایت عمدہ شواہد مہیا ہو گئے ہیں اور چونکہ زبان خیالات انسانی

اکنافِ عالم میں پھیلی تھیں۔ سیاستِ مُدن٥٣ کا علم اب خود ایک فن ہو گیا ہے اور اس کی وجہ سے دولت کی اُس غیر مساوی تقسیم کے اسباب معلوم ہو گئے ہیں جس سے معاشرت کی مُظہر ہوا کرتی ہے اور خیالات معاشرت کا خاکہ ہوتے ہیں اس لیے اقوام عالم کی زبانوں کی .... بسیط تحقیقات سے قدیم معاشرت کی بابت بہت سے ایسے امور ثابت ہوے ہیں جو اور کسی طرح ثابت نہیں ہو سکتے مثلاً تمدن کی تاریخ میں زبان کی تحقیقات سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ اکثر حالتوں میں جب مختلف قومیں مختلط ہوتی ہیں تو غالب تمدن کی زبان بھی غالب رہتی ہے اور جس مقام پر ایک قوم دوسری قوم سے آدابِ تمدن حاصل کرتی ہے وہاں زبان بھی اسی جانب پر چلتی ہے اور بیرونی الفاظ و تصورات کو مہیا کر لیتی ہے۔ جیسے غیر متمدن ترکوں کی زبان میں عربی بکثرت داخل ہو گئی اور اُس وقت کہ جب کُل اسلامی تہذیب و شایستگی کا سرچشمہ فارس تھا عربی زبان میں فارسی (عجمی) زبان کی بہت کچھ آمیزش ہو گئی تھی اسی طرح جنوبی ہندوستان میں سنسکرت اور اُس کی مختلف شاخوں (پراکرتوں) کے الفاظ اس قدر کثرت سے ملے جلے ہیں کہ اگر تامل زبان کی انشاء کا ایک ورق لیا جائے تو وہ اس کی شہادت دے گا کہ کس طرح ایک غیر آریا قوم نے ایک آریا قوم سے مذہب فلسفہ اور اصول معاشرت کو لے لیا ہے۔ یا جیسے آج کل ہندوستان میں انگریزوں کے اعلیٰ تمدن نے نہ صرف اہلِ ہند کو مغربی طرزِ معاشرت کا گرویدہ بنا لیا ہے بلکہ آج ہندوستان میں جو زبانیں عام طور سے مروج ہیں اُن میں بکثرت انگریزی الفاظ داخل ہو گئے ہیں اور انگریزی خوانوں کی گفتگو اور انشاپردازی میں صرف الفاظ ہی نہیں بلکہ انگریزی محاورات۔ اسلوبِ بیان۔ الفاظ کی ترکیبیں۔ اور تلمیحیں گُھلی ملی نظر آتی ہیں اور جس وقت انگریزی علوم و فنون ترجمہ ہوں گے اُس وقت بہت سے علمی مصطلحات بھی انھیں زبانوں میں داخل ہو جائیں گے

٥٣ سیاستِ مُدن (پولیٹکل اکانمی) وہ علم ہے جس میں دولت کے پیدا کرنے۔ جمع کیے جانے۔ تقسیم ہونے اور صرف میں آنے سے بحث کی جاتی ہے۔ اگلے وقتوں میں جب بلادِ مشرق میں تمدن ترقی پر تھا علی العموم قوموں اور ملکوں میں کاروبارِ دُنیوی کے لحاظ سے ایک درجہ بندی تھی اور مختلف طبقے قائم تھے اور پیشے اور ہنر میں میراث چلتی تھی۔ اس کی وجہ سے مختلف نتائج پیدا ہوتے تھے۔ مثلاً اگر ایک طرف یہ فائدہ تھا کہ میراث کی وجہ سے (صفحہ ۹ دیکھو)

کی نظم میں بے حد خلل پڑتا ہے۔ اب اعداد کی فراہمی اس سلیقہ سے کی گئی ہو کہ نہ صرف انسانوں

کے پیشوں اور صنعتی ہنروں میں ہر نسل مابعد زیادہ ترقی کرتی تھی تو دوسری طرف یہ نقصان بھی تھا کہ ہر انسان اپنے کاروبار کے اختیار کرنے میں آزاد نہ تھا اور اپنی پسند اور رجحان طبیعت کے موافق پیشہ اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ اگر ایک طرف سوسائٹی کی حالت میں استقلال وثبات تھا اور جدید انقلابات اور ردوبدل سے انسانی قسمتیں محفوظ تھیں تو دوسری طرف یہ نقصان بھی تھا کہ جو گروہ کم فائدہ مند یا ضرر رساں محنت ومشقت والے کاروبار کرتا تھا وہ دولت میں بھی بہت کم حصہ پاتا تھا۔ عزت ووقار کے لحاظ سے روز بروز پست ہوتا چلا جاتا تھا اور ایک لخت محنت میں مصروف رہنے اور تفریح وانبساطِ خاطر میسر نہ ہونے سے اُسے دنیا میں حیوانوں کی سی زندگی گزارنا پڑتی تھی۔ ایسی حالت میں جو چیز ملکی یا قومی دولت میں کوئی اہم نتیجہ پیدا کرتی تھی وہ یا تو فتوحات کا جوش ہوتا تھا یا ہمُن (؟) ان کے زمانے میں مذہب کی تعلیم اور قوانین اخلاق کی ادب آموزی چنانچہ اُن ملکوں کی شریعتوں اور خلاقی حکمتوں میں بہت باتیں ایسی تھیں جو اس نظم کے قائم رکھنے میں معین تھیں مثلاً حرص وطمع کی اس وجہ سے بہت کچھ ممانعت کی گئی تھی کہ کوئی شخص دولت کے جمع کرنے کی عجلت اور کوشش میں اپنا موروثی پیشہ چھوڑ کے دوسرا پیشہ اختیار نہ کرے اور تاکہ سوسائٹی کا انتظام قائم رہے اور اس میں خلل نہ پڑے باہمی معاملات میں صفائی اور دیانت معاہدہ کی پابندی اور ناپنے تولنے میں ایمان داری کی سخت تاکید تھی۔ دولت کی افراط کچھ مستحسن نہ تھی اور عیش وتنعم کوئی پسندیدہ بات سمجھی نہ جاتی تھی ایک پیشہ والا دوسرے پیشہ والے سے مخلوط ہو نہ سکتا تھا اور یہ باہمی منافرت ہر گروہ کو اپنے موروثی پیشہ سے مانوس رکھنے اور غیر کے پیشہ کے سیکھنے میں مزاحم ہونے کے واسطے کافی تھی۔ ایسی حالتوں میں قومی دولت کا تغیر وتبدل بہت کچھ قومی فتوحات سے وابستہ رہتا تھا اور سلطنت کے داخلی انتظامات میں اس کی جانب سے اتنی بے التفاتی تھی کہ اُس کے متعلق جس قدر مسائل تھے اُن پر غور وفکر کرنا کچھ بہت ضروری نہ تھا۔ انھیں وجوہ سے مشرقی ملکوں میں یہ علم نہ ایک مستقل علم کی طرح مدوّن ہو سکا نہ اُس کے مسائل منقّح یا اصول منضبط ہو سکے لیکن مغربی تمدن نے سوسائٹی کا جو نظم قائم کیا ہے اُس کا پہلا اثر یہ ہو کہ پیشے یا ہنر کسی گروہ یا طبقے سے مخصوص نہیں رہے ہیں ہر شخص اپنے رجحان طبیعت اور اپنی مرضی سے دنیا میں اپنی

کی مادّی فوائد سے متعلق بلکہ اُن کی اخلاقی خصوصیتوں کے بارے میں بھی ہمارا علم بہت وسیع ہو گیا ہے۔ مثلاً مختلف قسم کے جرائم کی تعداد۔ اُن کا باہمی تناسب۔ اُن پر سن و سال صنف تعلیم اور اسی قبیل کے دوسرے امور کا جو اثر پڑتا ہے یہ سب باتیں بہت اچھی طرح معلوم ہو گئی ہیں۔ تحقیق و جستجو کی اس عظیم الشان تحریک کا جغرافیہ طبیعی نے بھی بخوبی

بسر اوقات کے واسطے کوئی شکل اور کوئی پیشہ اختیار کر سکتا ہے۔ اب اس نظام کے قائم ...... ہونے میں سب سے پہلے اس کی ضرورت پیدا ہوئی کہ قوموں اور ملکوں میں دولت کے پیدا کرنے تقسیم کیے جانے اور صرف میں لانے کے متعلق جس قدر مسائل ہیں اُن کی تنقیح و تنقید کی جائے۔ حکومتیں اپنی رعایا کی خوشحالی اور اپنے ملک کی فلاح و بہبود کو اب صرف فتوحات اور ملک گیری پر موقوف و منحصر نہیں سمجھتیں بلکہ تجارت اور صنعت و حرفت پر موقوف سمجھ کر اُسی کے فروغ دینے پر ہمہ تن مصروف رکھتی ہیں۔ مثلاً جب یہ مسئلہ طے ہو گیا کہ جس قدر کوئی ملک دوسرے ملک کے ہاتھ اپنے یہاں کی چیزیں زیادہ بیچتا ہے اُسی قدر نفع زیادہ اُٹھاتا ہے اور جس قدر زیادہ خریدتا ہے اُسی قدر کم نفع اُٹھاتا ہے۔ تو اس انکشاف سے موازنۂ تجارت کا اصول قائم ہوا اور ہر ملک کی یہ کوشش رہنے لگی کہ اپنی محنت اور صنعت سے وہ چیزیں پیدا کرے جو دوسرے ملکوں والے خرید کریں۔ پھر جب

دوسرا مسئلہ یہ طے ہوا کہ جس قدر کسی ملک میں مانگ ہوتی ہے اُسی قدر رسد بہم پہونچائی جاتی ہے تو اس مسئلہ کے طے ہونے کے بعد سب سے بڑی بات جو ایک تاجر کو کرنا ہوتی ہے وہ مانگ کی تحقیق ہوتی ہے یعنی اپنے کاروبار کے فروغ پانے کے واسطے اولاً یہ تحقیق کرنا ہوتا ہے کہ بازار میں کس شے کی مانگ زیادہ ہے۔ وقس علیٰ ہذا

۵۴ جغرافیۂ طبیعی کا موضوع زمین بتعلق فطرت نوامیس فطرت ہے۔ اس علم میں زمین۔ ہوا۔ پانی اور اُن موجودات آبی (حیوانی یا نباتی) سے بحث کی جاتی ہے جن میں یہ عناصر مصروف رہتے ہیں۔ اور اُن موجودات کی تقسیم کی تاریخ۔ حدونہایت۔ طریقوں اور سببوں پر غور کیا جاتا ہے۔ اس علم کے پڑھنے سے صرف یہی فائدہ نہیں ہوتا کہ انسان کو یہ تعلیم ہوتی ہے کہ فطرت کی پیداواروں کی نشوونما میں کس طرح ترقی کی جائے بلکہ اُس کی بدولت جو غور و فکر کی عادت اور خواص اشیا پر نظر کرنے کی مشق ہو جاتی ہے اُس سے عموماً عقلی ترقی بھی ہوتی ہے۔ جغرافیۂ طبیعی کی تحقیقات (صفحہ ۹ دیکھو)

ساتھ دیا ہے۔ موسمی آثار (تغیر و تبدل کے قاعدے) درج رجسٹر کر لیے گئے ہیں۔ پہاڑوں کی ساحت کر لی گئی ہے۔ دریاؤں کی پیمایش ہو گئی ہے اور اُن کے مخارج تک کی تلاش کر لی گئی ہے۔ ہر ایک قسم کی فطری پیداوار کی اچھی خاصی دیکھ بھال ہو گئی ہے اور اُن کی مخفی تاثیرات و انکشاف کر دی گئی ہیں۔ پھر ہر قسم کی غذا جس سے بقاء حیات ہوتی ہے اُس کی تحلیل کیمیائی کی گئی ہے اور اُس کے اجزاے ترکیبی وزن اور شمار کر لیے گئے ہیں اور اکثر حالتوں میں اُن کا جس قسم کا اثر بدنِ انسان پر پڑتا ہے وہ قابلِ اطمینان طور سے محقق ہو گیا ہے۔ پھر اسی کے قدم بقدم اور اس غرض سے کہ انسانی معلومات کے وسیع کرنے کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رہے اور اُن واقعات کے علم میں جو انسان پر موثر ہیں ترقی ہو سکے دیگر مختلف صیغہ جات میں ایک بسیط تحقیق و تدقیق کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ چنانچہ

اس کے تحت میں عموماً کل علوم طبیعی آ جاتے ہیں۔ مثلاً اقلیم۔ حرارت۔ چشمے۔ دریا۔ پہاڑ۔ سمندر۔ ہوائیں بارش۔ بادل۔ حیوانات و نباتات کی تقسیم وغیرہ وغیرہ کے مباحث سے اس میں بحث کی جاتی ہے۔

۵ تحلیل کیمیائی۔ حکمت تجربہ کی وہ شاخ ہے جس کا موضوع کسی مرکب شے کے اجزاے ترکیبی کا افتراق و انفصال ہوتا ہے۔ جیسے پانی کے اجزاے ترکیبی ہائیڈروجن اور آکسیجن کا علحدہ کرنا یا شکر کے اجزاے ترکیبی کاربن۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن کا جدا جدا کرنا۔ علم کیمیا کی اس شاخ کا کام صرف اسی قدر ہے کہ مرکب در مرکب یا مختلط القوام اشیاء کے سادہ اور مفرد اجزاے ترکیبی الگ الگ کر دکھائے

اس شاخ میں جو عمل کیے جاتے ہیں اُن کی دو قسمیں ہیں۔ اول تحلیل بلحاظ کیفیت اور ثانیاً تحلیل بلحاظ کمیت۔ ایک میں کسی مرکب شے کے اجزاے ترکیبی کی کیفیت و ماہیت مزاج وغیرہ اُن کی مقداروں کے دریافت کی جاتی ہے مثلاً صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانی کن کن اجزا سے مرکب ہے اور دوسری میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اجزاے ترکیبی کا وزن یا شمار کیا ہے اور از روے حجم یا مقدار کے وہ کس صحیح تناسب سے یکجا ہوے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جب ایک حصہ ہائیڈروجن آٹھ حصہ آکسیجن سے ملتا ہے تو پانی بنتا ہے۔ و علی ہذا القیاس۔

اکثر تہذیب یافتہ اور شایستہ ملکوں کی بابت ہم کو اب یہ معلوم ہے کہ اُن کی موت فوت کا کیا حساب ہے۔ اُن میں شادی بیاہ کیونکر ہوتے ہیں۔ اُن کے یہاں توالد وتناسل کا تناسب کس طرح ہے۔ اور اُن کے پیشوں اور حرفتوں کی کیفیت کیا ہے۔ اُن کے یہاں مزدوری کی اُجرت اور معمولی سامانِ معیشت (جن پر اُن کی زندگی کا دارومدار ہے) کی قیمت میں کس طور سے اُتار چڑھاؤ ہوا کرتا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے بہت سے واقعات وحالات ہیں جو یکجا کیے گئے ہیں۔ ترتیب دیے گئے ہیں اور اب اُن سے کام لے سکتے ہیں۔ یہ نتائج جو گویا کہ تشریح اعضاے قومی ہیں اس وجہ سے یادگار ہیں کہ وہ نہایت جزئی وتفصیلی حالات سے تعلق رکھتے ہیں اور انھیں سے ملے ہوے وہ نتائج ہیں جو اگرچہ کم جزئی لیکن زیادہ بسیط ہیں۔ اب نہ صرف بڑی بڑی قوموں کے افعال وحرکات اور خصائص طبعی قلمبند کر دیے ہیں بلکہ وہ مختلف جرگے اور قبیلے جو ساری دنیا کے کسی معلوم حصہ میں بستے ہیں اُن کو بھی سیاحوں نے بچشم خود معائنہ کیا ہے اور اُن کے حالات بیان کیے ہیں اور اس ذریعہ سے ہم لوگ اس قابل ہوگئے ہیں کہ انسانی تہذیب اور تمدن کے ہر درجے اور طبقے اور ہر جدا اور مختلف حالت اور حیثیت میں انسان کی صورت حال کا مقابلہ کر سکیں۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ ہمارے ابناے جنس کی بابت یہ جستجو بظاہر ایسی ہے جو کسی طرح ختم ہونے نہیں آتی بلکہ روز بروز اُس کا شوق بڑھتا جاتا ہے۔ یہ کہ اس شوق کے پورا کرنے کے سامان بھی بظاہر ترقی کرتے جاتے ہیں اور یہ کہ اب تک جو کچھ معلومات حاصل ہو چکی ہے وہ محفوظ رکھی گئی ہے۔ اب ہم ان سب امور کو جب یکجا کرتے ہیں تو ہم کو واقعات کے اُس عظیم الشان ذخیرے کی قدر وقیمت کا کچھ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے جو ہمارے قبض واختیار میں ہے اور جس کی مدد سے نوع انسانی کی ترقی کی تحقیقات ہو سکتی ہے۔

لیکن برعکس اس کے جب ہم اس بات کو بیان کرنے بیٹھیں گے کہ اس کل مواد سے

کیا کام لیا گیا ہے تو ہم کو ایک بالکل مختلف تصویر کھینچنا پڑے گی۔ بد قسمتی سے تاریخ انسان کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ اگرچہ اُس کے مختلف حصّوں کی نہایت قابلیت سے جانچ پڑتال کی گئی ہے لیکن مشکل سے کسی ایک متنفس نے یہ کوشش کی ہے کہ اُن سب کو یکجا جمع کر اس راہ کو یقینی طور سے ڈھونڈھ نکالے جس سے وہ باہم ربط اور تعلق رکھتے ہیں تحقیق کے اور سب بڑے بڑے میدانوں میں کلّیات قائم کرنے کی ضرورت کو دنیا بھر نے تسلیم کر لیا ہے اور اس بارے میں نہایت معقول کوششیں جاری ہیں کہ جزئی واقعات سے صعود کیا جائے تاکہ اُن قوانین کلّی کا علم حاصل ہو جن کے وہ واقعاتِ جزئی تابع اور محکوم ہیں لیکن مورخین کے معمولی دھرّے سے یہ اس قدر دُور ہے کہ اُن میں یہ عجیب خیال دائر سائر ہے کہ اُن کا کام بس اتنا ہی ہے کہ بعض قسم کے واقعات بیان کر دیں اور گاہ بگاہ لطف کلام کے واسطے اظہار واقعات کے وقت محض اخلاقی اور سیاسی خیالات جو مفید نظر آئیں اُن کی چاشنی دے دی جائے۔ چنانچہ اس راہ کے کھُل جانے سے ہر ایک مصنف جو خیالات کی سُستی یا فطری ناقابلیت کے سبب سے اس لایق نہیں ہوتا کہ شجر علم کی بلند ترین شاخوں تک رسائی حاصل کر سکے وہ یہی کرتا ہے کہ کتابوں کی متعدد جلدیں پڑھنے میں چند سال صرف کر دیتا ہے اور پھر اتنا ہو جاتا ہے کہ ایک مورّخ بن بیٹھے اب وہ ایک عظیم الشان قوم کی تاریخ لکھ سکتا ہے اور جس مبحث پر وہ قلم اُٹھاتا ہے اُس میں ایک مستند شخص سمجھا جاتا ہے۔

اس حقیر معیار کے رواج پذیر ہو جانے سے وہ نتائج پیدا ہوئے ہیں جو ہماری معلومات کی ترقی میں سخت سدِ راہ ہیں۔ چنانچہ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ بحالت مجموعی تمامی مورخین اس بات سے محض بیگانہ رہے ہیں کہ شروع ہی شروع میں ایسی وسعت نظر سے مبادیِ فن پر غور کریں کہ وہ اس قابل ہو جائیں کہ جس مبحث پر وہ قلم اُٹھانے والے ہیں اُس کے کل فطری متعلقات پر اُنھیں عبور حاصل ہو جائے۔ چنانچہ یہ عجیب تماشہ نظر آرہا ہے کہ اگر

ایک مورخ صاحب فن سیاست مدن سے ناواقف ہیں تو دوسرے صاحب قانون سے بے بہرہ ہیں۔ تیسرے صاحب معاملات مذہبی اور تغیرات اعتقادی سے نابلد۔ چوتھے صاحب علم الاعداد[۵۶] کے فلسفہ میں کچھ درک نہیں رکھتے اور پانچویں صاحب کا ذہن طبیعیات[۵۷] میں مطلق نہیں لڑتا۔ حالانکہ یہ سب امور سب سے زیادہ ضروری اور لابدی ہیں کیونکہ انھیں سے وہ سب اسباب ترکیب پاتے ہیں جو نسل انسانی کی اُفتاد مزاج اور رجحانِ طبیعت پر موثر ہوتے ہیں اور جن میں اُن کا ظہور ہوتا ہے۔ چونکہ ان اہم مشاغل میں سے بعض کو ایک شخص نے اپنے سر لیا اور بعض کو دوسرے شخص نے۔ اس لیے

۵۶ علم الاعداد۔ (اسٹیٹسٹکس) حکمت عملی کی وہ شاخ ہے جس کا موضوع اُن واقعات کا جمع کرنا اور ترتیب دینا ہے جو کسی ملک یا قوم کی معاشرت اخلاق اور دولت سے علاقہ رکھتے ہیں۔ اس علم کے دائرۂ تعریف میں متعدد مباحث اور مسائل آتے ہیں چنانچہ جو امور بعد تحقیق طے شدہ ہوگئے ہیں وہ حسب ذیل عنوانوں کے تحت میں بیان کیے جا سکتے ہیں۔

(۱) کسی ملک یا قوم میں دولت کی حقیقت۔ اُسکے پیدا ہونے اور بڑھنے کے مسائل۔

(۲) تجارت داخلی اور خارجی سے متعلق مسائل۔

(۳) محاصل و مداخل سے متعلق مسائل۔

(۴) سکۂ رائج الوقت اور اشیاء اجناس کے نرخ قیمت کے متعلق مسائل۔

(۵) شرح مزدوری و کرایہ اور تقسیم پیشہ و حرفہ سے متعلق مسائل۔

(۶) رعایا کے مالی تعلقات کے بارے میں سلطنت کی مداخلت کے فرائض سے متعلق مسائل۔

اس علم کے ذریعے سے ہر ملک کی مالی۔ تجارتی۔ علمی۔ اخلاقی اور معاشرتی حالت کا کافی اندازہ ہو سکتا ہے اور باشندگان ملک کی حاجتوں۔ ضرورتوں۔ خواہشوں اور رغبتوں کو معلوم اور اُن کی فوقی فراری۔ اُن کے امراض و آلام۔ اُن کی خوش حالی یا بدحالی کو دریافت کرسکتے ہیں۔ آج کل کی کل ترقی یافتہ اور شایستہ حکومتوں کا دارومدار اس علم پر ہے اور اُن کا پورا نظم و نسق اُسی پر چل رہا ہے اور بغیر اس قسم کے سامانوں سے آراستہ ہوے کوئی سلطنت ملکداری اور رعایا پروری میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ملکوں کی مردم شماری (صفحہ ۱۲ دیکھو)

بجاے اس کے کہ وہ یکجا جمع ہوتے پراگندہ اور پاشاں ہو رہے ہیں اور اس وجہ سے باہمی تقابل کے میں جو امور دریافت کیے جاتے ہیں اُن کی غرض یہی ہوتی ہے کہ رعایا کی حالت مدبّران ملک پر واضح ہو اور سلطنت اپنے فرائض ادا کرسکے۔

۵ طبیعیات یا حکمت طبیعی (فزیکل سائنس) میں اُن امور کے احوال کے علم سے بحث کی جاتی ہے جو وجود خارجی اور وجود ذہنی میں مادّہ کے محتاج ہیں یعنے بغیر مادّہ کے پائے نہیں جاتے۔ مثلاً آسمان زمین۔ شجر و حجر۔ انسان اور بندر۔ کیونکہ ان کا وجود بغیر اُس خاص مادّہ کے جس کے ساتھ ہو کر وہ موجود ہوئی ہیں نہ ہمارے ذہن میں اور نہ خارج میں پایا جا سکتا ہے۔ پس ان موجودات مادی کے حالات خواص اور تاثیرات کے دریافت کرنے سے جس علم کو تعلق ہے یا جس علم میں ان کی حقیقت و ماہیت سے بحث کی جاتی ہے وہی طبیعیات کہلاتا ہے۔ لہذا اس علم کے موضوع عالم کے کل اجسام ہیں خواہ وہ فلکی ہوں یا عنصری۔ بسیط ہوں یا مرکب نباتات ہوں یا حیوانات۔

حکمت طبیعی کو جب وسعت دیتے ہیں تو اس وقت وجود خارجی اور ذہنی کی تفریق دور کر دیتے ہیں اور اس میں ان اشیاء سے بحث کرنا داخل ہوتا ہے جو وجود خارجی میں تو مادّہ کی محتاج ہوتی ہیں لیکن وجود ذہنی میں محتاج مادّہ کی نہیں ہوتیں، جیسے مربع۔ مثلث۔ مستطیل۔ اس حالت میں جملہ علوم ریاضی (جیسے ہندسہ۔ ہیئت۔ جرثقیل۔ موسیقی وغیرہ) اس کے تحت میں آجاتے ہیں اور اُس کے موضوع میں کُل وہ اشیاء عالم داخل ہو جاتی ہیں جن کا تصور ذہن میں کیا جاتا ہے اگرچہ بعض اُن میں سے ایسی بھی ہوں جو خارج میں بغیر مادّہ کے پائی نہ جاتی ہوں لیکن جب حکمت طبیعی کو اتنی وسعت نہیں دیتے تو صرف اُنھیں اشیاء کے علم میں محدود کر دیتے ہیں جو ذہن اور خارج دونوں میں مادّہ کی محتاج ہوتی ہیں۔ اور علوم ریاضی کو مابعد الطبیعۃ کے زمرے میں رکھ دیتے ہیں۔ یہ تعریف حسب بیان ارسطو اور اُس کے پیرووں کے ہے اور اہل مشرق اسی کو مانے ہوئے ہیں۔

اہل مغرب نے فزیکل سائنس کے اصلی معنی یہ قرار دیے ہیں کہ اُس سے مراد وہ علم ہوتا ہے جو نظام فطرت (یعنے واقعات و حادثات کے پیرایۂ ظہور) سے سروکار رکھتا ہے اس حد تک کہ وہ واقعات یا حادثات ایک فن کی حیثیت سے

اور موازنہ سے جو اعانت مل سکتی تھی وہ مفقود ہو گئی ہے اور اگرچہ فن تاریخ کے یہی اجزائے ترکیبی تھے لیکن کسی کے ذہن میں یہ بات نہ آئی کہ اُن کو یکجا کرتا اور بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں گوندھ لاتا۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے ابتدا ہی سے بعض بڑے بڑے خوش فکر لوگ اُٹھے ہیں جنھوں نے فن تاریخ کی اس پچھڑی ہوئی حالت پر تاسّف کیا ہے اور حتی المقدور اسکے سنبھالنے کی کوشش کی ہے مگر ایسے اتفاقات شاذ ہوئے ہیں۔ اس قدر شاذ کہ یورپ

مدون کر لیے گئے ہیں۔ اس کے تحت میں وہ سب علم داخل ہیں جو جاندار اور .... بے جان اشیاء۔ ذہنی اور مادی موجودات سے بحث کرتے ہیں اور اس لیے اُس کی خاص شاخیں یہ ہیں (۱) وہ علوم جن میں حرکتِ اجسام سے جبکہ وہ کسی قوت سے متاثر ہوتے ہیں۔ بحث کی جاتی ہے اسی کے تحت میں زمین۔ چاند۔ سورج اور دوسرے سیاروں کی حرکتوں اور اُن کی باہمی کشش جذب و اتصال پر غور کیا جاتا ہے (۲) وہ علوم جن میں بعض آثار فطری کو مطالعہ کر کے اُن کی بابت کلیات قائم اور انواع مختلف میں وہ کلیات منطبق کیے جاتے ہیں۔

اس علم کی جامع تعریف میں وہ سب علوم داخل ہیں جو ریاضی نظری و عملی۔ حکمت طبیعی۔ کیمیا۔ تاریخ۔ طبیعی وغیرہ کی کل شاخیں ہیں اور جو عالم مادی کے متعلق جس قدر علم ہم کو حاصل ہے اُس سب کو احاطہ کیے ہیں۔ یہ تو ایک وسیع تعریف ہوئی لیکن محدود معنوں میں اُسے صرف حکمت طبیعی کا مترادف سمجھتے ہیں اور اُس وقت اُس سے اجسام بحیثیت اجسام کے جملہ خواص و کیفیات کا علم مراد ہوتا ہے یعنی آثار طبیعی کی حکمت (درانحالیکہ اُس کے موضوع میں کوئی معتدبہ تبدیلی نہ ہو) اور اُس کے مقابل میں ایک طرف فن کیمیا ہوتا ہے جو اجسام کی تحصیل و تحلیل سے بحث کرتا ہے اور دوسری طرف تاریخ طبیعی جس میں نباتات۔ حیوانات اور جمادات کے کل آثار شامل ہوتے ہیں۔

اس علم کے مبادی میں مسائل کشش مسائل متعلق حرارت و نور وغیرہ ہیں۔ جن میں سے ہر ایک میں متعدد علوم و فنون جداگانہ عنوانوں پر قائم ہیں۔

:: ؛ ::

کی تمام سرمایۂ ناز تصانیف (تاریخی) میں تین چار سے زیادہ ایسی نہیں ہیں کہ جن میں یہ جدت ملحوظ رکھی گئی ہو۔ اور تاریخ انسان کی تحقیق و تدقیق اُن جامع اور مانع اصول کے بموجب کی گئی ہو جو دیگر صیغہ جات علوم میں بجدکامیاب ثابت ہو چکے ہیں اور جن اصول کی پابندی ہی سے مشاہدات بسیطہ کا مرتبہ حقائق حکمیہ تک بلند ہو سکتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مورخین میں سولھویں صدی کے بعد اور علی الخصوص گزشتہ سو برس کے اندر متعدد صورتوں سے یہ جھلک نظر آتی ہے کہ بسیط طور سے وسعت نظر روز افزوں ہو رہی ہے اور تصنیفات میں اُن مباحث کے داخل کرنے پر رغبت پیدا ہو چلی ہے جو اس سے پیشتر ضرور خارج از بحث رکھے جاتے۔ اس طریقہ سے اُنکی تصنیفات میں گوناگوں مضامین ملے جُلے نظر آتے ہیں۔ اور صرف متوازی واقعات کے جمع اور بیان کر دینے سے ایسے کلیات اخذ کرنے کی راہ کھُل گئی کہ جس کا کوئی پتہ اور نشان یورپ کی ابتدائی تصانیف میں کہیں نہیں ملتا۔ اس میں شک نہیں کہ اس سے بڑا نفع ہوا ہے اس حیثیت سے کہ اُس نے مورخین کو ایک وسیع تر سلسلۂ خیالات سے آشنا کر دیا ہے۔ اور اُن میں غور و خوض کی وہ عادتیں پیدا کر دی ہیں جن کا اگرچہ بیجا استعمال بھی ہوسکتا ہے لیکن وہ حقیقی علم کے واسطے شرط لازمی ہیں کیونکہ اُن کے بغیر کوئی علم مدون ہو نہیں سکتا۔

لیکن باوجودیکہ فن تاریخ کے یہ سامان اب اتنے دل خوش کُن نظر آتے ہیں جتنے کبھی پیشتر نہ تھے پھر بھی یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ مستثنیات شاذہ سے قطع نظر کی جائے تو ابھی صرف آیندہ کے لیے سامان ہی سامان جمع ہوے ہیں اور کچھ توقعات ہی قائم ہوے ہیں اور شاید اس بات کے دریافت کرنے کی طرف ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا ہے کہ وہ کون اصول ہیں جو قوموں کی سیرت و خصلت اور قسمت پر حکمرانی کرتے ہیں۔ فی الواقع اب تک جو کچھ ہو چکا ہے اُس کے اندازہ کرنے کی کوشش میں اس مقدمہ کے ایک اور حصہ میں کر دوں گا۔ سر دست اسی قدر بیان کرنا کافی ہے کہ خیالات انسانی کے تمام

اعلیٰ مقاصد کے واسطے فن تاریخ ہنوز نہایت ناقص اور نامکمل ہے اور اُس کی وہی پراگندہ اور خودسرانہ صورت ہے جو قدرتی طور سے ایسے فن کی ہونا چاہیے جس کے آئین منضبط نہ ہوں بلکہ جس کی بنیاد ہی ٹھیک نہ ہو۔

فن تاریخ کے مواد کے اس قدر افراط کے ساتھ موجود ہونے پر خاص اس فن کے متعلق ہماری معلومات کی اس درجہ ناقص ہونے کی وجہ سے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کی تحقیق کچھ ایسے بلند پیمانے پر کرنا چاہیے کہ اب تک جو کچھ کیا گیا ہے اُس سے وہ بہت ارفع اور اعلیٰ ہو اور یہ کہ نہایت سرتوڑ کوششیں کرنا چاہیے تاکہ تحقیقات کا یہ عظیم الشان اور کارآمد صیغہ بھی دیگر صیغہ جات کی سطح کے برابر پہونچ جائے جس سے ہمارے علم میں ایک موازنہ اور تناسب طبعی پیدا ہو۔ چنانچہ اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کے موجودہ تصنیف کا منصوبہ باندھا گیا ہے۔ لیکن جو خیالی عمارت قائم کی گئی ہے اُسے حقیقت میں بالکل ویسا ہی بنائے جانا تو محال ہے تاہم میں کوشش کروں گا کہ تاریخ انسان کی تکمیل اس حد تک کرڈالوں کہ دیگر محققین نے نیچرل سائنس (طبیعات) کی متعدد شاخوں میں جو کچھ کیا ہی وہ اگر اُس کے برابر نہ ہو تو کم سے کم اُسی کی صورت پر تو ہو۔ لوگوں نے فطرت کے متعلق اتقدر کیا ہے کہ وہ واقعات جو بظاہر حد درجہ غیر منتظم اور محض حوادثِ اتفاقی معلوم ہوتے تھے۔ اُن کی تشریح کی اور یہ دکھلادیا کہ وہ سب مقررہ اور عالمگیر قوانین کے مطابق ہیں۔ یہ اس طرح ہوسکا ہے کہ لائق و فائق اشخاص نے اور اُن لوگوں نے جو صبر و تحمل رکھتے ہیں اور جن کے خیالات کبھی نہیں تھکتے ہیں۔ اُنھوں نے واقعات فطری کو اس نگاہ سے مطالعہ کیا کہ اُن میں باقاعدگی کا سراغ لگائیں اب اگر واقعات انسانی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے اور وہ بھی اسی نظر سے مطالعہ کیے جائیں تو ہم کو اسی قسم کے نتائج پیدا ہونے کی پوری توقع ہوسکتی ہے۔ کیونکہ یہ بخوبی واضح ہے کہ وہ لوگ جو اقرار کرتے ہیں کہ واقعات تاریخی میں یہ صلاحیت ہی نہیں ہے کہ وہ کلیات کے تحت میں آسکیں وہ امر تنقیح طلب

کہ گویا مسلّم مان لیتے ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی کرتے ہیں۔ وہ نہ صرف ایسی بات کو مان لیتے ہیں جسے وہ ثابت نہیں کرسکتے بلکہ اُس بات کو تسلیم کرلیتے ہیں جو معلومات کی موجودہ حالت میں بالکل قیاس کے خلاف ہے جو شخص اس سے کچھ بھی واقف ہے کہ گذشتہ دو صدیوں میں کیا کچھ کیا جاچکا ہے وہ ضرور جانتا ہوگا کہ ہر نسل مابعد نے بعض اُن واقعات کو باقاعدہ اور پیشین گوئی کرنے کے قابل ثابت کردیا ہے جن کی بابت نسل ماقبل یہی سمجھتی تھی کہ نہ وہ کسی قاعدہ کے تحت میں آتے ہیں نہ اُنکی بابت کوئی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔ اسی وجہ سے ترقی کن تہذیب وشائستگی کا رجحان یہی ہے کہ وہ ہمارا عقیدہ اس بارے میں مستحکم کردے کہ عالم میں ایک نظم وترتیب سلسلہ وقاعدہ اور آئین وقانون جاری ہے۔ جب حالت یہ ہے تو اب اگر کچھ واقعات یا صنف واقعات ابھی تک نظم وترتیب کے تحت میں نہیں آئے ہیں تو بجائے اس کے کہ ہم یہ ہنکارنے لگیں کہ وہ نظم وترتیب کے تحت میں آ ہی نہیں سکتے لازم ہے کہ گزشتہ تجربے کو پیش نظر رکھیں اور اُس سے ہدایت پاکے یہ تسلیم کریں کہ جن باتوں کی توجیہ اس وقت نہیں ہوسکتی ممکن ہے کہ زمانہ آیندہ میں کسی وقت اُن کی توجیہ ہوجائے ماہرین سائنس کے یہاں تو پراگندگی اور پریشانی میں سے نظم وترتیب دریافت ہونے کی توقع کی اس قدر مشق چڑھی ہوئی ہے کہ اب یہ نوبت پہونچ گئی ہے کہ ان میں سے جو مشاہیر ہیں وہ تو یومنون بالغیب کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اگر مورخین کے زمرے میں عام طور سے اس توقع کا پتہ اور نشان نہیں ملتا تو غالبًا اس کا سبب یہ ہوگا کہ وہ لوگ رموز فطرت کے محققین کی بہ نسبت قابلیت کم رکھتے ہیں اور نیز یہ کہ نظام معاشرت کا مسئلہ خود اس درجہ پیچیدہ ہے کہ اُس کے باترتیب مطالعہ میں سخت دقتیں پیش آتی ہیں۔

یہی دو سبب مخالف تاریخ کے ایک فن بن جانے میں سدِّ راہ ہوے ہیں اور اسی وجہ سے یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جو مورّخ بہت ہی مشہور اور سربرآوردہ ہیں وہ بھی کامیاب ترین

فاضلان علوم طبیعی سے نہایت کم مرتبہ پر ہیں کیونکہ فن تاریخ کی جانب کسی ایسے شخص نے توجہ صرف نہ کی جو دماغی قابلیت کے لحاظ سے کیپلر[۵۸] - یا - نیوٹن[۵۹] یا اور اسی قسم کے دیگر حضرات سے مد مقابل ہو سکے - اور بنظر اُن دقتوں اور پیچیدگیوں کے دیکھا جائے

۵۸ کیپلر (جان کیپلر) جرمنی کا ایک نہایت نامور ہیئت داں - یہ شخص ریاضی اور ہیئت کا مسلم الثبوت کامل فن تھا - اس نے علم ہیئت میں متعدد کتابیں تصنیف کیں - علی الخصوص "حرکتِ مریخ" پر اُس نے جو کچھ "ہیئت جدید" میں لکھا ہے وہ اس علم میں نہایت قابل قدر اضافہ سمجھا جاتا ہے - اُس کی عادت تھی کہ جہاں اُسے نئے حقائق کی جھلک بھی نظر آتی وہ انتھک محنت کر کے اُن کے انکشاف کے پیچھے پڑ جاتا - یہ نامور صاحب کمال سنہ ۱۵۷۱ء میں پیدا ہوا اور ۵۹ برس زندہ رہ کے سنہ ۱۶۳۰ء میں مر گیا -

۵۹ نیوٹن (سر اسحاق نیوٹن) ریاضی اور حکمت طبیعی کا وہ کامل ترین ماہر جس کا ثانی اُس وقت تو کیا اب تک پیدا نہیں ہوا ہے - سنہ ۱۶۴۲ء میں بمقام وولس تھارپ (لنکن شائر) پیدا ہوا - ۲۲ برس کے سن میں بی اے کی ڈگری حاصل کی - اُس نے علوم ریاضی اور مرایا و مناظر میں زیادہ توجہ صرف کی اور چند ہی روز میں اُس نے "نور" اور "لون (رنگ)" کے بابت جدید نظریات قائم کیے - جب سنہ ۱۶۶۵ء میں طاعون کا زور ہوا تو اس نے گوشہ نشینی اختیار کی - اِس حالت میں اُس کا شغل صرف مطالعہ اور غور و فکر تھا - اسی زمانے میں وہ ایک روز اپنے باغ میں تنہا بیٹھا تھا کہ سامنے ایک سیب درخت سے گرتے دیکھ کے اُس نے اس پر غور کرنا شروع کیا کہ یہ سیب درخت سے زمین پر کیوں گرا - کیونکہ سیب میں تو کوئی قوت ایسی نہیں جو اسے زمین پر لائے - بالآخر اُس نے کشش ثقل کا معما حل کیا - اور اسی اصول پر غور کرتے ہوے یہ خیال کرنا شروع کیا کہ چونکہ زمین کے مرکز سے نہایت دور مقام پر بھی اس کشش کا زور گھٹا نہیں ہے لہذا یہ کشش ماہتاب اور سیاروں تک وسیع ہو سکتی ہے - اُس نے نور اور لون پر جو نظریات قائم کیے تھے انھیں کے بدولت اُس نے ایک نئی دوربین ایجاد کی - نیوٹن نے اپنے زمانے میں ہر قسم کے علمی اور ملکی اعزاز حاصل کیے یونیورسٹیوں کا وہ رکن رکین تھا - پارلیمنٹ کا وہ ممبر تھا اور دربار شاہی میں عزت و حرمت کے ساتھ اُسے باریابی کا شرف حاصل تھا - اس علمی تبحر اور وجاہت اور اِس ملکی اقتدار و عزت پر

جو اس بحث کو گھیرے ہوے ہیں تو ایک فلسفی مورخ کے سدِّ راہ ایسی مشکلات ہوتی ہیں جن کو فطرت کے مطالعہ کرنے والوں کی مشکلات سے کہیں زیادہ خطرناک کہنا چاہیے - کیونکہ ایک طرف تو اُس کے مشاہدات میں ایسی غلطیوں کا احتمال بہت ہوتا ہے جو تعصب اور دیگر جذبات انسانی کے باعث پیدا ہوتی ہیں اور دوسری طرف وہ اس بات سے قاصر ہے کہ اپنی تحقیقات میں علوم طبیعی کے بڑے وسیلے یعنی تجربے سے کام لے سکے حالانکہ یہی تجربہ ایک ایسی چیز ہے جس کے سبب سے اس عالم خارجی کے نہایت نازک اور دقیق مسائل کی چھان بان کی جاتی ہے -

لہذا یہ بات کچھ بھی قابل تعجب نہیں ہے کہ مطالعۂ فطرت کی موجودہ حالت ترقی کے مقابلے میں خود انسانی حرکات و سکنات کا مطالعہ ہنوز عالمِ طفولیت میں ہو - بیشک ان دونوں مشغلوں کی ترقی میں ایسا بیّن فرق ہے کہ درانحالیکہ علوم طبیعی میں واقعات کا باقاعدہ ہونا اور اُن کی بابت پیشین گوئی کر سکنا - ان معاملات تک میں جو ہنوز ثابت بھی نہیں ہوے ہیں ایک مسلّمہ مسئلہ جانا جاتا ہے تاریخ میں اسی قسم کی باقاعدگی نہ صرف غیر مسلّم ہوتی ہے بلکہ اُس کو ماننے سے قطعی انکار کر دیا جاتا ہے - یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ تاریخ کو ایسے درجے پر پہونچا دے کہ وہ معلوماتِ انسانی کی

ص بھی وہ نہایت نیک دل صلح کن خلیق و متواضع اور منکسر مزاج تھا - اُس کے مشاغل علمی کی دلچسپی اتنی زیادہ تھی کہ اُس نے اپنی عمر احقاق حق میں بسر کی شادی نہ کی نہ اس کا خیال بھی دل میں لایا - اور باوجود اس قابلیت کے اُس نے خود اپنے بارے میں لکھا ہے "مجھے نہیں معلوم کہ میں دنیا کو کیا نظر آؤنگا لیکن اپنی نظر میں تو میں اُس بچے کے مانند ہوں جو سمندر کے ساحل پر کھیلتا ہو کہ کبھی اِدھر ایک چکنا چکنا پتھر اور کبھی اُدھر ایک خوبصورت خوبصورت گھونگا (جو اوروں سے زیادہ چکنا اور خوبصورت ہو) پاکے خوش ہو رہا ہو لیکن بحر حقیقت کا سمندر جس کی تھاہ کسی نے نہیں پائی اُس کے سامنے موجیں مار رہا ہو - نیوٹن نے ۱۷۲۷ء میں وفات پائی -

دیگر شاخوں کی سطح کے برابر آ جائے تو اُس کو ابتدا ہی میں سخت مزاحمتیں پیش آتی ہیں کیونکہ اُس سے کہا جاتا ہے کہ انسان کے معاملات میں کچھ رازہاے سربستہ اور کچھ امور محض قضا و قدر پر ایسے مبنی ہوتے ہیں جو ہماری تحقیقات کی دسترس سے باہر ہیں اور اسی وجہ سے اُن کی آیندہ رفتار ہم سے ہمیشہ پوشیدہ رہے گی۔ اِس کے جواب میں اسی قدر کہنا کافی ہے کہ ایک تو یہ اعتراض محض فضول ہے دوسرے اُس کی حقیقت پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس کا کچھ ثبوت مل نہیں سکتا۔ پھر یہ اعتراض اس عالم آشکارا واقعہ کے مخالف ہے کہ ہر ایک مقام پر جس قدر معلومات بڑھتی جاتی ہے اُسی قدر یکسانیت کا اعتقاد بڑھتا جاتا ہے۔ یعنی یہ اعتقاد کہ ایک ہی قسم کے حالات و اسباب میں ایک ہی طرح کے واقعات متوالی اور متواتر طور سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ اچھا۔ اب ہم اس قضیہ کی اچھی طرح جانچ پرتال کرتے ہیں اور اس بات کا کھوج لگاتے ہیں کہ یہ عام عقیدہ جو دائر سائر ہے کہ تاریخ ہمیشہ اسی ظنی اور غیر یقینی حالت میں رہے گی اور سائنس کے مرتبے پر کبھی نہ پہونچے گی اس کی بنیاد کیا ہے۔ اس طور پر ہم کو یہ بڑا مسئلہ حل کرنا پڑے گا جو درحقیقت ہماری بحث کی جڑ ہے۔ کہ آیا انسانوں (اور بدرجہ انسانی جماعتوں) کے افعال و حرکات کچھ مقررہ قوانین کے محکوم ہیں یا یہ کہ وہ محض نتیجہ ہیں بخت[1] و اتفاق یا مافوق الفطرت مداخلت کے؟ انھیں دو صورتوں کے مباحثے میں بہت سے مفید اور دلچسپ خیالات کی جانب ذہن منتقل ہوگا۔

[1] فلاسفۂ یونان کی اصطلاح میں وہ واقعات جن کے اسباب ہماری نگاہوں سے پوشیدہ یا ہمارے دسترس سے باہر ہیں اُن کی نسبت کہتے ہیں کہ بخت یا اتفاق سے وقوع پذیر ہوے ہیں۔ یہ دونوں لفظیں ایک ہی مقام پر بولی جاتی ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اگر نتیجہ مفید ہے تو بخت سے تعبیر کریں گے اور اگر مضر تو اتفاق سے۔ مثلاً کسی نے کنواں کھودا اور اُسمیں دفینہ نکل آیا یہ بخت ہے۔ کنویں پر پانی بھرنے گیا، پانوں پھسلا اور گر پڑا، یہ اتفاق ہے۔ انگریزی میں اسکے مقابل چانس Chance اور ایکسیڈنٹ Accident ہیں

کیونکہ اس معاملہ سے متعلق دو اصول ہیں جو تمدن کے مختلف مدارج سے معلوم ہوتے ہیں۔ پہلے اصول کے بموجب ہر واقعہ اپنے مرتبۂ ذات میں منفرد۔ دوسروں سے غیر متعلق اور ایک اندھے دُھندھے بخت یا اتفاق کا نتیجہ ہے۔ یہ رائے جو ایک بالکل جاہل و بے علم مخلوق میں جبلتاً پیدا ہوتی ہے بہت ہی جلد تجربہ کی اس وسعت سے کمزور ہو جاتی ہے جس سے یکسانیت۔ تواتر اور تسلسل کا وہ علم حاصل ہوتا ہے جو فطرت ہماری آنکھ کے سامنے آئے دن پیش کیا کرتی ہے مثلاً اگر خانہ بدوش قومیں جن پر تہذیب و تمدن کا سایہ ابھی نہیں پڑا ہے صرف شکار مارنے یا مچھلی پکڑنے پر گزر بسر کرتی رہتیں تو بیشک وہ اسی خیال میں مگن رہتیں کہ اُن کی معمولی ازوقہ کی فراہمی کسی محض اتفاقی سبب پر مبنی ہے جس کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ اور اُس کی فراہمی کا غیر متعین ہونا۔ اُس میں کبھی افراط اور کبھی تفریط ہونا ضرور اُن کو یہ سمجھنے ہی نہ دیتا کہ فطرت کے بند و بست میں کوئی خاص نظم و ترتیب بھی ہے اور اُن کی طبیعت سے یہ خیال کوسوں دُور رہتا کہ دنیا میں جتنے واقعات و حادثات ہوتے ہیں وہ سب تابع و متبع ہوتے ہیں چند خاص اصول اور کلیات کے اور اگر اُن کا علم حاصل ہو جائے تو اکثر اوقات زمانۂ آئندہ کے متعلق بہت کچھ پیشین گوئی کی جا سکتی ہے لیکن جس وقت ہی قومیں ترقی کر کے زراعتی حالت میں پہونچتی ہیں تو سب سے پہلے وہ ایسی غذا استعمال کرنے لگتی ہیں جو نہ صرف اپنی ہیئت ظاہری سے بلکہ خود اپنے وجود میں بھی انکے اپنے افعال کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ جو کچھ وہ بوتے ہیں اُسی کو وہ کاٹتے بھی ہیں۔ اسی طور سے تمام سامانِ معیشت جس کی اُنھیں حاجت ہوا کرتی ہے وہ براہ راست خود اُن کے حیطۂ اختیار میں آجاتا ہے اور خود اُن کی محنت مشقت سے اُنھیں ہاتھ آتا ہے۔ اب جو دانہ وہ زمین میں ڈالتے ہیں اور جس پکّے ہوئے دانے کو وہ کھیت میں سے کاٹتے ہیں ان دونوں میں جو یکسانیت کا تعلق ہوتا ہے وہ صاف نظر آنے لگتا ہے اور نتائج کی باقاعدگی کا خیال دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ اب وہ زمانۂ مستقبل کا انتظار صرف یقین و اذعان ہی کے ساتھ نہیں بلکہ ایسے وثوق و اطمینان کے ساتھ کرتی ہیں

جس کا تصور بھی اُن کو اپنے پیشتر کے مشاغل میں ہو نہیں سکتا تھا۔ اسی مقام سے واقعات کے استقلال و تسلسل کا ایک دُھندلا سا خیال پیدا ہوتا ہے اور اوّل اوّل اُن کے ذہنوں میں اُس تصور کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے جسے آگے بڑھ کے نوامیس فطرت سے تعبیر کرتے ہیں اب ترقی کے وسیع میدان میں ہر ہر قدم پہ یہ تصور صاف اور روشن ہوتا چلا جائے گا جس قدر ان کے مطالعے کی مشق بڑھے گی۔ جس قدر اُن کا تجربہ ایک وسیع سطح پر پہونچے گا اُن کو ایسی یکسانیتیں نظر آتی جائیں گی جنکا کبھی وہم و خیال بھی اُن کو نہ ہوا تھا اور جن کے انکشاف سے وہ بخت و اتفاق والا اصول جو اُنھوں نے اوّل اوّل قائم کیا تھا ٹوٹتا چلا جائے گا۔ پھر اس سے ذرا آگے بڑھنے پر اُن میں بسیط توجیہات کا ایک ذوق پیدا ہوگا۔ اور اُنھیں میں سے کوئی شخص ایسا پیدا ہوگا جو اِن انکشافات سے کلیات قائم کرے گا اور اگلے مقبول عام خیالات سے نفرت کر کے یہ عقیدہ قائم کرے گا کہ ہر ایک واقعہ اپنے واقعۂ ماقبل سے کسی ضروری و ادعائی سلسلے کے ذریعے سے مربوط و مسلسل ہے۔ پھر وہ واقعہ ماقبل ایک اور واقعہ ماقبل سے پیوند رکھتا ہے اور یہ کہ اسی طور سے سارا عالم ایک ضروری سلسلہ ہے جس میں ہر شخص اپنا کام کر سکتا ہے لیکن یہ تصفیہ نہیں کر سکتا کہ اُس کا کیا کام ہونا چاہیے۔

اسی طور پر جماعت انسانی کی معمولی رفتار میں فطرت کی باقاعدگی کا روز افزوں علم بخت و اتفاق کے اصول کو شکست کر کے ضروری تسلسل کے اصول کو قائم کر دیا کرتا ہے۔ اور میرے خیال میں ظن غالب یہی ہے کہ انھیں دو اصول یعنی بخت و اتفاق اور تسلسل ضروری ہی وہ دو اصول نکلے ہیں جو بعد کو مرضی[1] مختار اور تقدیر سے موسوم کیے گئے ہیں۔ اب اس بات

[1] مرضی مختار ترجمہ ہے فری وِل Free will کا اور تقدیر ترجمہ ہے پریڈسٹی نیشن Predestination کا۔ اول الذکر سے یہ مراد ہے کہ انسان فاعل مختار ہے اور اپنے افعال میں کسی کا پابند نہیں۔ آخر الذکر سے یہ مطلب ہے کہ تمام امور پیشتر سے مقدر ہو چکے ہیں اور وہ اُسی طرح واقع ہوں گے جس طرح مقدر ہو چکے ہیں اُن میں انسان مجبور ہے۔ قریب قریب یہی دو اصول ہیں جن کو ہمارے یہاں جبر و اختیار سے تعبیر کرتے ہیں۔

کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ کس طور پر جماعتِ انسانی کی ترقی یافتہ حالت میں یہ ردوبدل ہوا - ہر ملک میں جب دولت کسی معیّن حد تک جمع ہو جاتی ہے تو وہاں ایک انسان کی محنت کی پیداوار اس سے زیادہ ہونے لگتی ہے جتنی خود اُس کی بسر اوقات کو کفایت کرتی ہے - تب اس کی کچھ حاجت نہیں رہتی کہ جملہ اشخاص محنت کریں اور اس طور پر ایک جماعت علیٰحدہ بن جاتی ہے جس کے اکثر افراد اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ تفریحی مشاغل میں صرف کرتے ہیں اور بعض افراد علوم کے پڑھنے پڑھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں - اسی آخرالذکر گروہ میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو واقعات خارجیہ سے قطع نظر کر کے صرف اپنی ہستی کے مطالعے میں مشغول ہو جاتے ہیں - اور یہی لوگ (اگر بڑی اعلیٰ درجے کی قابلیت رکھتے ہوتے ہیں) ایسے نئے نئے مذہبوں اور حکمتوں کے موجد اور بانی ہوتے ہیں جو اپنے معتقدین اور مسترشدین پر بیحد و بے اندازہ اثر و اقتدار پیدا کر لیتے ہیں - لیکن ایسی ملتوں کے مصنّفین بھی اُن خصائص سے متاثر ہوتے ہیں جو اُن کے زمانۂ حیات میں رائج اور شائع ہوتی ہیں - کیونکہ کسی انسان کے واسطے یہ ناممکن ہے کہ گرد و پیش کے آزاد خیالات کے اثر سے بھاگ سکے - اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ ایک نیا مذہب یا نیا فلسفہ ایجاد ہوا تو حقیقت میں وہ چنداں کسی کی فکر بکر کی طبعزاد نہیں ہوتا بلکہ جو کچھ ہوتا ہے اسی قدر ہوتا ہے کہ معاصر متفکرین میں جو خیالات رواج پائے ہوئے ہوتے ہیں وہ ایک نئی راہ پر لگا دیے جاتے ہیں - چنانچہ اسی طور سے اس صورت خاص میں جو ہمارے روبرو ہے عالم خارجی میں بخت و اتفاق کا اصول عالم باطنی کی مرضی مختار کے اصول سے منطبق ہے - اور اسی طرح "تسلسل ضروری" کا اصول بالکل اصول "تقدیر" سے مشابہ ہے - فرق صرف اسی قدر ہے کہ اول الذکر وہ ہے جو ماہرین علم مابعد الطبیعات[۱۲] کی بلند پروازی سے نکلا ہے اور آخرالذکر وہ ہے جس نے اہل مذاہب کی

[۱۲] مابعد الطبیعات - یہ علم ارسطو کی بعض تصانیف سے ماخوذ ہے - اور اس علم میں مطلق وجود سے بحث

گو دیں نشو ونما پائی ہے۔ سب سے پہلے جب ما بعد الطبیعات کا عالم اصول بخت و اتفاق کو لے کے چلتا ہے تو اپنے نفس کے مطالعے میں اس خود سر۔ غیر ذمہ دار اور مطلق العنان اصول کو چلاتا ہے جو اِس نئے میدان میں پہونچ کے "مرضی مختار" ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا جملہ ہے جو بظاہر تمام دقتوں کو دور کر دیتا ہے کیونکہ آزادی مطلق (جو خود ہی تمام افعال کی مُصدر ہوا کرتی ہے) کسی سے صدور نہیں پاتی بلکہ اصول بخت و اتفاق کی طرح اکیلا مرو اقعی ہوتی ہے جس کی مزید توضیح ہو نہیں سکتی۔ پھر بعد اس کے جب کوئی اہل مذہب اصول تسلسل لازمی کو مذہبی قالب میں ڈھالتا ہے تو چونکہ اُس کے ذہن میں نظم و ترتیب اور یکسانیت کے خیالات رچے اور بسے ہوتے ہیں اس لیے قدرتی طور سے وہ اس غیر متبدل باقاعدگی کو ایک ذات واجب الوجود کے علم و قدرت کے تحت میں رکھ دیتا ہے اور اس طور پر خدا کی وحدانیت کے بلند خیال کے ساتھ یہ خیال بھی وابستہ ہو جاتا ہے کہ اُسی خدا نے واحد نے ازل سے تمام ممکنات کو کلیۃً مقدر اور مقرر کر رکھا ہے۔

ہمارے وجود کے بارے میں جو کچھ گنجلکیں ہیں اُن کے مٹانے کے واسطے مرضی مختار کہی جاتی ہے۔ یعنی اُن اشیاء سے جو اپنے وجود میں کسی طرح مادہ کی محتاج نہیں۔ مثلاً واجب الوجود۔ جواہر مجردہ وغیرہ۔ اسی علم میں اُمور عامہ سے بھی بحث کرتے ہیں جیسے مباحث ہیولی وصورۃ۔ وجزو لایتجزی وحدوث وقدم وغیرہ۔ ارسطو کے نزدیک ہر ایک شی جو ہمارے سامنے بطور ایک حقیقت کے پیش ہوتی ہے اُس کے بابت ہم یہ سوالات کر سکتے ہیں کہ اُس کی اصلی حقیقت یا ماہیت یا تعریف کیا ہے۔ اُس کے ظہور کی کیا شانیں ہیں۔ اُسے کس نے پیدا کیا یا وہ کیونکر پیدا ہوئی اور کس غرض سے پیدا ہوئی۔ مختصر یہ کہ ہم ہر موجود کی بابت اُس کے ہیولی اور صورت اور اُس کی بدایۃ ونہایۃ کے بارے میں سوال کر سکتے ہیں اور انھیں کے جوابات سے جو علم مدوّن ہوتا ہے وہی حکمت ما بعد الطبیعۃ کہلاتا ہے۔ یہ علم طبیعات سے بالکل جدا ہے کیونکہ طبیعات کا دارمدار محض تجربہ پر ہے اور ما بعد الطبیعات کو تجربہ سے کوئی واسطہ نہیں بلکہ وہ ایسے امور عامہ در حقائق بسیطہ پر مبنی ہے جنھیں تجربہ کے معیار پر آزمانا ممکن نہیں۔ ارسطو

اور تقدیر کے یہ اصول جو ایک دوسرے کی ضد ہیں بے شک نہایت سادہ اور بے خطر طور سے مشکل کُشائی کر رہے ہیں اور چونکہ وہ بہ آسانی سمجھ میں آجاتے ہیں وہ اوسط درجے کی طبیعت انسانی کے واسطے ایسے مناسب حال ہیں کہ خود اس موجودہ زمانے میں بھی انسانوں کا ایک گروہ کثیر اس پہ مختلف الراے ہے اور اُنھوں نے نہ صرف ہمارے ذرائع آگہی کا ستیاناس کر رکھا ہے بلکہ ایسے مذہبی فرقے پیدا کر دیے ہیں جن کے باہمی مناقشات نے جماعتِ انسانی کو درہم برہم کر رکھا ہے اور اکثر اوقات خانگی تعلقات کو تلخ و بدمزہ کر دیا ہے۔ یورپ کے زیادہ ترقی یافتہ اہل نظر میں اب یہ خیال ترقی کر رہا ہے کہ

ان کے نزدیک یہ علم نہ صرف حقائق موجودات کا علم ہے بلکہ ہمارے ادراک و شعور کا بھی علم یہی ہے۔ بلکہ یہی علم الٰہی ہے کیونکہ ذات واجب الوجود ہی مبدأ و منتہائے کُل موجودات ہے۔ اور وجود حقیقی اُسی کا وجود ہے۔ اسی وجہ سے اس علم کو الٰہیات بھی کہتے ہیں

اس علم کی تقسیم اس طرح پہ ہے کہ پہلے موجودات کے نفس وجود سے بحث کی جاتی ہے اور پھر اُن موجودات کے بابت جو علم ہمارا ہے اُس علم کی ماہیت پہ غور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ کسی موجود کی ماہیت وجود پہ بحث کرتے وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عالم خارجی میں جو اشیاء نفس انسانی سے براہ راست سروکار نہیں رکھتیں اُن کی بابت ہم کو جو کچھ علم ہوا ہے اس کی اصل و حقیقت کیا ہے۔ اور اس سوال کے جواب دینے کے واسطے خود نفس ذہن انسانی کی حقیقت پہ غور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یہ علم اُس علم سے وابستہ ہو گیا ہے جس کا موضوع یہ ہے کہ تکمیل اور تسلسل کے ساتھ ہماری ذہنی ترکیب سے قوانین اور خواص کی تحقیقات کرے جسے علم نفس یا حکمت نفس ذہن یا فلسفۂ اخلاقی سے موسوم کرتے ہیں۔ اس طور پر مابعد الطبیعیات کے تحت میں یہ سب علوم آجاتے ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات اُسے مطلق علم یا علم خارجی کے بابت ہمارے ادراک کی ماہیت پہ محدود کرتے ہیں اور بعض اوقات علم نفس یا واقعات ادراک و شعور پہ۔ یعنے یا تو اُنھیں واقعات کو اُن کے مرتبۂ ذات میں دیکھتے ہیں یا اس لحاظ سے اُن پہ نظر ڈالتے ہیں کہ وہ اُن حقائق سے واسطہ رکھتے ہیں جو نفس سے خارج ہیں۔ بالفاظ دیگر موجودات

یہ دونوں اصول غلط ہیں یا کم ازکم یہ کہ ہمارے پاس کافی شہادت اُن کے سچ ہونے کی نہیں ہے اور چونکہ یہ مسئلہ نہایت اہم ہے اس لیے یہ بہت سودمند ہوگا اگر (قبل اسکے کہ ہم آگے بڑھیں) ہم اس مسئلہ کو اتنا سُلجھا دیں گے جتنا کہ وہ مشکلات جو اس کے حل کرنے میں سدِّ راہ ہیں اجازت دیں گی۔

مسئلہ مرضی مختار اور تقدیر کی ابتدا (بظن غالب) کی بابت جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اُس کے متعلق چاہے جس قدر شبہات کیے جائیں لیکن بہرحال اس بارے میں تو غالبًا کسی کو کچھ گفتگو نہ ہوگی کہ حقیقت میں اب کس بنیاد پر یہ دونوں اصول مبنی ہیں مسئلۂ تقدیر بالکل ایک مذہبی قیاس پر مبنی ہے اور مسئلۂ مرضی مختار علم ما بعد الطبیعات کی ایک قیاس پر۔ اول الذکر کے حامی ایک ایسے مفروضہ پر چلتے ہیں جس کی ادنیٰ تعریف یہ ہے کہ اُس کی بابت آج تک اُنھوں نے کوئی معقول شہادت پیش نہیں کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہم یہ اعتقاد رکھیں کہ خلاقِ عالم نے باوجود اپنی رحمت عام کے جسے وہ خود بخوشی تسلیم کرتے ہیں ایک تحکمانہ تفریق مقبول اور غیر مقبول میں قائم کردی ہے یہ کہ اُس نے روزِ ازل سے کروڑہا مخلوق کے واسطے جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئی ہے اور جسے صرف اُس کی قدرت ہی وجود میں لا سکتی ہے عذابِ الیم مقدر کر دیا ہے اور یہ کہ اُس نے یہ جو کچھ کیا کسی اصولِ معدلت کے لحاظ سے نہیں کیا بلکہ شخصی خود مختار حکومت و سطوت کے زور میں کر ڈالا۔ اس اصول کی سراغ رسانی فرقۂ پروٹسٹنٹ

کا وجود یا اُن کے بابت ہمارا ادراک و شعور یہی موضوع اس علم کے قرار پا سکتے ہیں۔

اس علم کو ما بعد الطبیعۃ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے دقیق اور نظری مسائل ایسے ہوتے ہیں کہ بہت سے علوم و فنون کے پڑھنے کے بعد جب ذہن اور نفس انسانی کو ایک ملکۂ راسخہ حاصل ہو چکتا ہے اُس وقت اسے پڑھاتے ہیں۔ اس کے مقابل میں بعض حکمانے ریاضی و ہندسہ وغیرہ کو ما قبل الطبیعۃ کے نام سے موسوم کیا ہے کیونکہ اُنھیں طبیعیات کی تعلیم سے پیشتر پڑھاتے ہیں۔

مین کالون[٤٣] کی مظلوم مگر قوی دماغ تک ہوتی ہو لیکن کلیسیا کی ابتدائی حالت میں اُسے آگسٹن[٤٤]

٤٣ کالون (جان کالون) یہ شخص ایک ملت جدید کا بانی ہوا ہے اور اسی نے اس کا نام روشن کیا ہو۔ اس کے عقائد میں جس قدر مہتم بالشان حصہ ہے وہ وہی ہو جس میں وہ آگسٹن کے نقش قدم پر چلا ہے۔ اُس کے مخصوص اصول حسب ذیل ہیں۔

انسان بحیثیت ایک گنہگار کے مجرم اور بد ہو سبب پہلا انسان جو پیدا کیا گیا تھا وہ خالق اکبر کی صورت پر اور اوسی کے مشابہ تھا۔ اس سے نہ صرف اُس کا اشرف المخلوقات ہونا مترشح ہوتا ہو بلکہ اُس کی اصلی طہارت۔ دیانت اور تقدیس بھی ثابت ہوتی ہے۔ اسی حالت میں حضرت آدم زمین پر پھینکے گئے اور بعد اس ہبوط کے کل بنی آدم اُن سے پیدا ہوے چنانچہ انکی ارواح میں بدی سرایت کر گئی اور وہ نکبت و ادبار میں گرفتار ہوے جس پر قہر ایزدی نازل ہوتا ہے۔ اُن سے مواخذہ کیا جاتا ہے اور وہ عذاب و عقاب میں گرفتار ہوتے ہیں۔ کیونکہ خداوند کریم صرف نکوکاری اور پرہیزگاری اور تقوے و طہارت سے راضی ہوتا ہو۔ کوئی انسان دوسرے کے اعمال بد کی وجہ سے پکڑا نہیں جاتا نہ بنی آدم محض حضرت آدم کی خطا پر ماخوذ کیے جائیں گے۔ البتہ اس لیے کہ اُنکی خطا کے سبب سے ہم پر شامت سوار ہو گئی ہے اور ہم خود بدی کے مرتکب ہوتے ہیں ہم سے خود ہمارے گناہوں کی بابت مواخذہ ہوگا۔

خدا نے بعض اشخاص کے لیے حیات دائمی اور بعض کے لیے مواخذہ اور موت دائمی مقدر کی ہو جن لوگوں کو حیات کیلیے منتخب کیا ہو اُنھیں وہ نجات کی طرف بلاتا ہو اور خداوند کریم بڑھتے ہوے ایمان اور طہارت قلب کے ساتھ اُن کا خاتمہ بالخیر کرتا ہو۔

ولادت ۱۰ جولائی ۱۵۰۹ء وفات ۲۷ مئی ۱۵۶۴ء

٤٤ آگسٹن۔ یہ شخص لاطینی کلیسیا کے چار پیران طریقت میں سے ایک تھا۔ ۱۳ نومبر ۳۵۴ء کو پیدا ہوا۔ ابتداءً پیروان مانی میں تھا۔ اور مدت تک احقاق حق کی کوشش میں مصروف رہا۔ دس برس کے تجربہ کے بعد آخرکار عقائد مانی سے بیزار اور دل برداشتہ ہو کے ۳۸۳ء میں روم چلا گیا اور وہاں سے میلان پہونچا۔ یہاں وہ فصاحت و بلاغت کے درس دینے لگا اسی زمانہ میں اُس نے فلسفۂ افلاطون پر توجہ کی اور مسیحیوں کی صحبت کے اثر سے دین مسیحی کے بابت تحقیقات کرتا رہا۔ چنانچہ جس زمانہ میں افلاطون کا فلسفہ اُسکے دماغ میں بسا ہوا تھا اُس نے انجیل کا مطالعہ شروع کیا اور بالآخر ۳۸۶ء میں بمقام میلان اس نے اصطباغ لیا۔ اور ایک سرگرم و پُرجوش حامی دین ہو گیا۔ یہ جو خانقاہوں میں رہنے کا سلسلہ ہے اس کا رواج

نے باضابطہ طور سے ترتیب دیا تھا۔ اور اُس نے غالباً اس کو پیروان مانی[۵] سے مستعار لیا تھا۔
بہر کیف۔ یہ اصول دیگر خیالات سے (جو اصل اصول ہیں) جس قدر بے جوڑ اور بے میل ہے
اُس سے قطع نظر کرکے دیکھا جائے تو ایک علمی تحقیقات میں اس کو ایک بے برگ و ثمر قیاس
سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ ہماری معلومات کے احاطہ سے خارج ہے اور ہم کو اس کے

۴ دینے والا سب سے بڑھ کر یہی شخص معلوم ہوتا۔ اسنے پیروان مانی اور نیز دیگر عقائد و ملل والوں کی تردید میں متعدد کتابیں لکھیں اور ایک مدت تک اُن سے مناظرہ و مباحثہ میں معروف رہا۔ اس کے عقائد میں یہ بات تھی کہ انسانوں پر جو نکبت و ادبار ہے وہ ہبوطِ حضرت آدمؑ کی وجہ سے ہے اور اسی کی وجہ سے بنی آدم غلامی اور ماندگی میں پڑے ہیں۔ مذہب اور مابعد الطبیعات دونوں کی دلیلوں سے وہ مسئلۂ قضا و قدر کا قائل تھا اور اسی سے اُس نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ کچھ انسان برگزیدہ پیدا ہوئے ہیں اور کچھ شامت زدہ۔ اسی سبب سے تعصب مذہبی کا رنگ اُس نے اس قدر چڑھا دیا تھا کہ مذہبی خطاؤں پر ملکی تعزیر کا وہ روادار تھا۔ اور اس تعزیر میں اس قدر سختی اُسنے جائز رکھی تھی کہ محض اختلافِ عقائد کی وجہ سے کسی کو جلا ڈالنا کوئی بات نہ تھی۔ اس شخص کا بڑا حصہ مسائل مذہبی پر تصنیف و تالیف کرتے گزرا اور اس نے کلیسا کی ایسی بے نظیر خدمت کی کہ آج وہ ارکان اربعہ میں سب سے افضل و اعلیٰ سمجھا جاتا ہے اُس نے ۲۰ ر اگست سنہ ۴۳۰ء کو وفات پائی۔

۵ مانی۔ یہ شخص تیسری صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ اس کے نجی زندگی کے حالات مختلف وسائل سے جس قدر ہم پہونچے ہیں وہ باہم گر ایسے متناقض ہیں کہ اُنپر پورا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہر کیف۔ یہ شخص ایک نئی ملت کا بانی ہوا۔ اُس کے خیال میں یہ بات سمائی کہ مذہب مجوس کو عیسائیت سے ملا دینا چاہیے اور اس مجموعہ میں بدھ مذہب (جہاں تک اُسے اُس سے واقفیت تھی) کے اصول بھی اضافہ کر دینا چاہیے۔ اس غرض سے کہ اُسکی سعی مشکور ہو اُس نے یہ دعویٰ کیا کہ حضرت مسیح نے جس فارقلیط کا وعدہ کیا ہے وہ میں ہی ہوں جس وقت اُس نے سب سے پہلے اپنے معتقدات شایع کیے ہیں اُسوقت شاپور اول عجم کا فرماں روا تھا اور ایک روایت تو یہ ہے کہ یہ فرماں روا اول اُس سے ناراض نہ تھا۔ لیکن جب مانی اُس کے بیٹے کو (جو بیمار تھا) صحیح نہ کر سکا تو اُس نے مانی کو قید خانہ میں ڈال دیا۔ مانی قید خانہ سے نکل بھاگا

صدق وکذب پر یقین کرنے کا کوئی ذریعہ حاصل نہیں۔

دوسرا اصول جو عرصہ سے مرضی مختار کے نام سے مشہور ہے فرقۂ آرمینیش[۱۶] سے متعلق ہے

مگر پھر گرفتار ہوکر آیا اور قتل کیا گیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ مانی ایک مجوسی خاندان کا رکن تھا۔ غیرمعمولی قوائے دماغی لایا تھا اور تصویرکشی اور صناعی میں اعلیٰ دستگاہ رکھتا تھا۔ نقاشی میں کامل اور ریاضی کا بڑا ماہر تھا۔ شروع میں عیسائی ہوگیا تھا اور آہواز کے کلیسا میں بڑے مرتبہ پر فائز تھا۔ اُس نے اپنے تئیں فارقلیط موعود ظاہر کیا اور جب شاپور اول نے اُسپر مظالم کیے تو وہ وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور ہندوستان چین۔ ترکستان میں پھرتا رہا۔ یہیں وہ سال بھر تک ایک غار میں رہا۔ اب جو اس گوشۂ عزلت سے وہ برآمد ہوا تو ایک کتاب جس میں اعلیٰ درجہ کی تصویریں اور نقش و نگار تھے لیکے برآمد ہوا تو اسی کتاب کا نام ارژنگ مانی تھا۔ جب سنہ ۲۷۲ء میں شاپور مرچکا تو وہ پھر فارس گیا۔ اس وقت ہرمز مسند حکومت پر متمکن تھا اور وہ مانی کی طرف عنایت کی نظر رکھتا تھا۔ اُس نے مانی کو اعزاز و احترام سے لیا اور ایک قصر بلند رہنے کو دیا۔ ہرمز کے مرنے پر بہرام اُس کا جانشیں ہوا جس نے بالآخر سنہ ۲۷۶ء میں اُسکی زندہ کھال کھنچوائی۔

مانی کے عقائد میں سب سے زیادہ اہم یہ عقیدہ تھا کہ جملہ مخلوقات مرئی وغیرمرئی (جو دکھائی دیتے ہیں یا نہیں دیتے ہیں) دو اصولوں سے متفرع ہوئے ہیں یہ دونوں اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ان میں سے ایک نور ہے خیر ہے یزداں ہے اور دوسرا ظلمت ہے۔ شر ہے۔ ماہرِ فن ہے یہ دونوں اپنے طبقات میں (جو قریب قریب ہیں) رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے اتنے جدا اور بے واسطہ ہیں کہ طبقۂ ظلمت اور اُسکے مالک کو طبقۂ نور اور اُسکے مالک کے وجود کی بھی اطلاع نہیں۔ اس کے عقیدہ کی رُو سے دنیا کا انجام نار پر ہو جس میں طبقۂ ظلمت بالکل جلا کے خاک کردیا جائیگا نور والی کے طبقہ میں پہونچنے کے واسطے اُسکے نزدیک یہ ضرور ہے کہ نفسانی خواہشات بالکل پست کرڈالے جائیں اور اُسکے لیے عیش و عشرت کے جذبات سے قطعی اجتناب اور سخت زہد و تقویٰ پر عمل کیا جائے۔ اس ملت کے ماننے والے دو قسموں میں منقسم ہیں۔ ایک فرقہ وہ ہے جسے بُرائی اور یاوہ گوئی سے بچنے کی سخت قسم کھانا چاہیے۔ گوشت۔ انڈے۔ دودھ۔ مچھلی۔ شراب اور کُل منشیات کو ترک کردینا چاہیے۔ دھن دولت

لیکن حقیقت میں وہ الٰہیات کے ایک اصول انسانی ادراک کے تفوق پر قائم ہے۔ یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہر شخص اس بات کو جانتا اور محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک فاعل مختار ہے اور اگرچہ کیسے ہی نازک دلائل پیش کیے جائیں لیکن ہمارے سروں سے یہ سودا

یا کسی قسم کے مال و متاع کی فکر نہ کرنا چاہیے کسی مخلوق کو (حیوانات ہو یا نبات) ستانا نہ چاہیے نہ اپنے کنبہ قبیلہ کی خبر لینا چاہیے۔ کسی ایسے شخص کی جو اپنا ہم عقیدہ نہ ہو دردمندی کرنا چاہیے اور بالآخر شادی بیاہ یا کسی اور صورت سے اپنی عصمت و عفت نہ مٹانا چاہیے۔ دوسرا فرقہ وہ ہے جو پہلے کی بہ نسبت دنیا کی نفیس چیزوں سے تمتع اٹھانے میں آزاد ہے اور اُس کے ذمہ پہلے فرقہ والوں کی خبرگیری مقدم ہے۔

پیروان مانی کے یہاں آفتاب و ماہتاب کی پرستش اس حیثیت سے کیجاتی ہے کہ وہ مظاہر یزدانی ہیں۔ اُن کے یہاں نہ عبادت کے واسطے قربان گاہ ہوتی ہے نہ پرتکلف معبد۔ اُن کے یہاں جو کچھ ہیں روزے ہیں۔ نمازیں ہیں۔ اور یا ایک دینی صحیفہ کی تلاوت ہے۔ اس صحیفہ دینی کے بابت یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ مانی کا لکھا ہوا ہے۔ یہ لوگ اتوار کو مقدس مانتے ہیں کیونکہ وہ آفتاب سے منسوب ہے اور مانی کا روز وفات سال بھر میں سب سے بڑھ کے برگزیدہ دن ہے۔ پیروان مانی اخلاقی حیثیت سے ایسے کٹر متعصب ہوتے ہیں کہ پاکی اور طہارت اور صفائی سے زندگی بسر نہیں کر سکتے۔

۵۱۶ آرمینیس۔ یہ شخص ۱۵۶۰ء میں بمقام اودیواٹر (جنوب ہالینڈ) پیدا ہوا اور اس کی شہرت اس سبب سے بہت ہوئی کہ مذہب اصلاح یافتہ میں کالون کے خلاف اُس نے ایک ملت جدید قائم کی۔ اُس کے اصول دینی یہ ہیں۔ (۱) قضائے الٰہی جب وہ خود اپنے افعال سے متعلق ہوتی ہے تو مبرم ہوتی ہے اور جب وہ افعال انسانی سے متعلق ہوتی ہے تو معلق ہوتی ہے یعنی وہ قضا جو ایک نجات دہندہ (جیسے حضرت مسیحؑ) کے مقرر کرتے اور بخشش کے عطا کرنے سے متعلق ہوتی ہے۔ وہ مبرم ہوتی ہے۔ لیکن وہ قضا جو بندوں کے عذاب و ثواب دیئے جانے سے متعلق ہوتی ہے وہ اُن کے افعال پر معلق ہوتی ہے۔ مثلاً اگر وہ ایمان لاتے اور توبہ کرتے ہیں تو اُنھیں ثواب ملتا ہے اور اُنکی نجات ہوتی ہے اور اگر وہ بے ایمان رہتے یا بے توبہ کیے اُٹھ جاتے ہیں تو اُن سے مواخذہ ہوتا ہے اور اُن پر عذاب کیا جاتا ہے۔ (۲) خداوند کریم چونکہ حسکم الحاکمین ہے اس لیے اُس کی حکومت مخلوق کے مقتضائے فطرت کے

نکل نہیں سکتا کہ ہم ایک مرضی مختار رکھتے ہیں۔ اب ایسے اعلیٰ حدود و اختیارات کے تسلیم کرنے میں (جو استدلال کے کُل طریقوں کو پسپا کر رہا ہے) دو مفروضات شامل ہیں جن میں سے ایک (اگرچہ ممکن ہے کہ سچ ہو) کبھی ثابت نہیں کیا گیا اور دوسرا تو بے چون و چرا غلط ہے۔ یہ مفروضات یہ ہیں۔ اولاً ایک خاص خود مختار ملکہ ہے جسے ادراک کہتے

مطابق ہوتی ہے۔ یعنی یہ کہ ایزدی حکومت اِس طرح چلتی ہے کہ وہ انسانی آزادی سے شانہ بشانہ رہتی ہے (۳) انسان اپنے بدفطرت سے بفضلِ خدا آزاد اور قادر ہے کہ حق کا ارادہ کرے اور راستی پر کاربند ہو۔ لیکن شامت میں مبتلا ہو کے وہ ایسا کر نہیں سکتا اور اُسے اس کی ضرورت رہتی ہے کہ ایسے کاموں کے کرنے سے پیشتر جو نیک ہیں اور جن سے خداوند کریم راضی ہے اس کی تمام قوتوں میں نئی روح پھونکی جائے (یہی علت ہے حضرت مسیحؑ کی ولادت و بعثت کی) (۴) فضلِ ایزدی اُن سب صفاتِ حسنہ کو جو انسان میں ہوتے ہیں اس طرح پیدا کرتا قائم رکھتا اور تکمیل کو پہونچاتا ہے کہ اُس کے بغیر (اگرچہ اُس میں روح تازہ بھی پھونکی ہوئی ہو) وہ کسی نیک بات کا تصور یا ارادہ یا اُس پر عمل بھی نہیں کر سکتا۔ (۵) روح القدس کی عنایت سے اولیا لوگ اتنی قوت رکھتے ہیں کہ آخر تک باوجود معصیتِ آدم) اور ذی لحم و گوشت سے بنے ہوئے)

ہونے کے وہ ثابت قدم رہ سکتے ہیں لیکن اصول صحیحہ سے وہ بھی اتنا تجاوز کر سکتے ہیں کہ فضلِ ایزدی بھی اُنپر اثر نہیں کر سکتا۔ (۶) ہر دیندار کو خود اپنی بخشش کا یقین ہو سکتا یاد لایا جا سکتا ہے۔ (۷) یہ ممکن ہے کہ ایک شخص جس میں نئی روح پھونکی گئی ہو بغیر معصیت کے زندہ رہے آرمینیس کا قول تھا۔ حق حق۔ وینی حق ایک گہرے کنوئیں میں ڈوبا ہوا ہے اور بغیر سخت کوشش کے وہ وہاں سے نکل نہیں سکتا۔ اُس نے جس قدر زیادہ غور کیا اُسی قدر اُسے انسان کے خود مختاری اور قضاے مبرم کے حدود گھٹنے کا یقین ہوا۔ اُس نے یہ اعتراف کیا کہ اُن لوگوں کو جو اپنے گناہوں سے توبہ کرتے اور حضرت مسیحؑ پر ایمان لاتے ہیں خدا ہی بخشش اور حیات جاودانی عطا کرتا ہے۔ خدا کی یہی مرضی ہوتی ہے کہ ہر شخص نجات حاصل کرے لیکن چونکہ اُسے ازل سے لوگوں کے با ایمان یا بے ایمان

ہیں۔ ثانیاً یہ کہ جو کچھ یہ ملکہ ظاہر کرتا ہے اُس کی تردید ہو نہیں سکتی؛ لیکن اول تو یہ کسی طرح یقینی نہیں کہ ادراک بھی کوئی ملکہ ہے بلکہ بعض نہایت قابل اہل نظر کی یہ رائے ہے کہ یہ ادراک صرف نفس ذہن کی ایک حالت ہے۔ پس۔ اگر واقع میں صورت حال یہی ہے تو ساری دلیل باد رہوا ہوئی جاتی ہے۔ کیونکہ اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ نفس ذہن کے تمام ملکات (جب اُن سے پوری طرح کام لیا جائے) یکساں صحیح و درست ہوتے ہیں تب بھی کوئی شخص نفس ذہن کی ہر ایک حالت کے بارے میں (جو اتفاقیہ پیدا ہو) یہی دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بہر نوع۔ اس اعتراض سے درگزر کر کے بھی ہم آگے چل کے یہ جواب دے سکتے ہیں کہ اگر ادراک بھی طبیعت کا کوئی ملکہ ہے تو بھی ہم ساری تاریخ کی شہادت اس بات کے ثابت کرنے کے واسطے رکھتے ہیں کہ یہ بالکل ہی مخدوش ہے۔ تمام اُن بڑے بڑے درجات و طبقات میں جن میں بنی آدم ترقی تہذیب کی جادہ پیمائی میں ہو کے گزرے ہیں نوع انسانی بعض ایسے خصوصیات ذہنی یا معتقدات مذہبی کے سبب ممتاز رہی ہے کہ جن کا اثر اُس زمانہ کے مذہب اور فلسفہ اور اخلاق پر باقی رہ گیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک عقیدہ جسے ایک زمانہ میں لوگ داخل ایمان سمجھتے تھے دوسرے دورے میں موجب تحقیر سمجھا گیا۔ اور پھر ان میں سے ہر ایک اپنے وقت میں قلوب انسانی سے اتنا وابستہ اور اُن کے ادراک کا ایسا جزو لاینفک بنا رہا ہے جیسے وہ رائے ہے جسے ہم مرضی مختار کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ ادراک کے یہ کُل ثمرات صحیح ہوں کیونکہ اُنمیں

ہونے کا علم حاصل ہے اس وجہ سے اُس نے ازل سے ہر ایک کی قسمت مقدر کر رکھی ہے۔ کالون اور آرمینیس کے عقائد میں جو کچھ فرق ہے یہ ہے کہ دونوں اس بارے میں جداگانہ راہ گئے ہیں کہ گنہگاروں

پر فضل ایزدی کس طرح ہوگا۔ ایک کے نزدیک یہ امر پہلے سے مقدر اور مقرر ہو چکا ہے اور اُسکے نزدیک قضائے مبرم میں سب طے ہو گیا ہے۔ دوسرے کے نزدیک کوئی امر مقدر اور مقرر نہیں ہوا اور قضا معلق ہے۔ لیکن صرف اُس کا علم باری تعالیٰ کو پیشتر سے ہے فقط

سے بہتیرے ایک دوسرے کی نفی کرتے ہیں۔ پس تاوقتیکہ ہر ایک زمانے میں سچائی کی مختلف معیاریں قرار نہ دی جائیں یہ بدیہی بات ہے کہ ایک انسان کے ادراک کی شہادت ہرگز کوئی ثبوت اس کا نہیں ہے کہ وہ سچ بھی ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو دو مسئلے جو بالکل ایک دوسرے کی ضد ہوں چاہیے کہ وہ دونوں مساوی طور سے سچ ہوں۔ علاوہ اس کے روزمرہ کی زندگی کے طرزِ عمل سے ایک اور بات بھی نکل سکتی ہے۔ یعنی کیا بعض خاص حالات میں ہم لوگ دیو پری اور آسیب وبلا کے وجود کا ادراک نہیں کرتے ہیں؟ اور پھر کیا عام طور سے یہ تسلیم نہیں کر لیا گیا ہے کہ ایسی چیزوں کا کوئی وجود نہیں ہے؟ اگر اس دلیل کے قطع کرنے کی کوشش یہ کہہ کے کی جاوے کہ ایسا ادراک ظاہری ہے اصلی وحقیقی نہیں ہے تو میں یہ پوچھوں گا کہ وہ کون شئے ہے جو اس بات کا تصفیہ کر سکتی ہے کہ فلاں قسم کا ادراک اصلی وحقیقی ہے اور فلاں قسم کا ظاہری اور غیر اصلی۔ اگر یہ پُر فخر ملکہ ہم کو بعض چیزوں میں دھوکا دیتا ہے تو ہمارے پاس اُسکی کیا ضمانت ہے کہ دیگر مواقع پر دھوکا نہ دے گا۔ اگر اسکی کوئی ضمانت نہیں ہے تو پھر ملکہ ہرگز لایق اعتماد بھی نہیں ہے۔ اور اگر کوئی ضمانت ہے تو (چاہے وہ کچھ بھی ہو) اُس کے وجود ہی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی ایسی شئے کی ضرورت ہے جس کا ملکۂ ادراک محکوم ومطیع ہو۔ اور اِس بات سے ملکۂ ادراک کے اعلیٰ وافضل ہونے کا وہ اصول باطل ہوا جاتا ہے جس پر مرضی مختار کے حامی مجبور ہیں کہ اپنے پورے اصول کی تعمیر قائم کریں درحقیقت ادراک کے بطور ایک خود مختار ملکہ ہونے کی بابت جو کچھ شک وتذبذب ہے اور نیز جس طور سے اُس ملکہ نے (اگر اُس کا وجود ہے تو) خود اپنے تخیلات کی تردید کی ہے۔ ان دو وجہوں نے منجملہ دیگر متعدد وجوہ کے مدت سے مجھے اس بات کا یقین دلادیا ہے کہ منفرد اشخاص کے نفوس کے معمولی مطالعے کے ذریعہ سے علم مابعد الطبیعات کبھی ایک

سائنس کے درجے پر نہیں پہونچ سکتا۔ ہاں اُس کا مطالعہ اس طرح کامیابی سے انجام کو پہونچ سکتا ہے کہ ازروے برہانِ علمی وہ قوانین منطبق کیے جائیں جن کو تاریخ کے ذریعے سے دریافت ہونا چاہیے۔ یعنی یہ کہ وہ قوانین جن کا سُراغ اُن آثار بسیطہ کی تنقید و تنقیح سے لگ جاتا ہے جو معاملاتِ انسانی کا ایک سلسلۂ اعظم ہمارے پیش نظر کرتا ہے۔[۱۶]

خوش قسمتی سے اُس شخص کو جو یہ عقیدہ رکھتا ہے فن تاریخ کی ایک سائنس ممکن ہے اُسے اس غرض خاص کے واسطے یہ کچھ ضرور نہیں کہ تقدیر یا مرضی مختار کے اصول میں سے کسی ایک کو وہ مانتا ہی ہو۔ اور تحقیقات کے اس درجے پر ہم کو صرف اسی قدر سروکار اُس سے ہوگا کہ وہ مندرجۂ ذیل امور کو قبول کرے۔ یہ کہ جب ہم سے کوئی فعل صادر ہوتا ہے تو وہ فعل نتیجہ ہوتا ہے کسی وجہ یا وجوہ تحریک کا۔ یہ کہ وہ وجوہ خود نتیجہ ہوتے ہیں کچھ اسباب ماقبل کے اور یہ کہ نتیجۃً اگر ہم جملہ واقعات ماقبل سے اور اُنکی تحریکات کے جملہ قوانین سے واقف ہو جاتے تو ہم ایسے یقین کے ساتھ جو کبھی خطا نہ کرتا اُس کے فوری نتائج کے بابت پیشین گوئی کر سکتے۔ اگر میں بہت زیادہ غلطی پر نہیں ہوں تو یہی رائے وہ ہے جو ہر ایک ایسے شخص کو رکھنا چاہیے جس کی طبیعت کسی خاص فرقہ کی والا دادہ اور تعصبانہ نہیں ہوگئی ہے اور جو اپنی رائیں ان شہادتوں کے بموجب قائم

۱۶ تقریر مندرجۂ بالا کا حاصل راقم کے نزدیک صرف اس قدر ہے کہ مصنف مسئلۂ جبر و اختیار کے دونوں پہلوؤں کو مخدوش سمجھتا ہے۔ جبر محض میں اُس نے یہ خدشہ وارد کیا ہے کہ خداوند کریم کی معدلت سے بعید ہے کہ وہ کروڑہا مخلوق کو بے وجہ عذاب کے واسطے مقدر کر دے۔ اور اختیار محض کے ماننے میں اُسے یہ گفتگو ہے کہ تا بت نہیں اور اس کی بنیاد جس اور اک پر ہے وہ غیر متحقق اور مغالطہ میں ڈالنے والا ہے۔ شریعت حقۂ اسلامیہ کے اصول سے انسان جبر و اختیار کے درمیان میں ہے یعنی فی الجملہ مجبور ہے اور فی الجملہ مختار۔ جس قدر مجبور ہے اُسی قدر بازپرس سے معاف ہے اور جس قدر مختار ہے اُسی قدر عذاب و ثواب کا مستحق۔ اور یہی صراطِ مستقیم ہے۔

کیا کرتا ہے جو حقیقت میں اُس کے پیش نظر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر میں کہتا ہوں کہ اگر میں کسی شخص کی افتادِ طبیعت سے بخوبی واقف ہوں تو اکثر اوقات میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ فلاں حالات و معاملات میں وہ اس طرح کا برتاؤ کرے گا۔ اب اگر میں اس پیشین گوئی میں ناکام رہوں تو مجھے اس ناکامی کو اس بات پر محمول نہ کرنا چاہیے کہ اُس شخص کی مرضی مختار اور طبیعت مطلق العنان تھی۔ نہ مجھے اس کا قائل ہو جانا چاہیے کہ کوئی مافوق الفطرت حکم محکم تھا جس نے اُسے مجبور رکھا۔ کیونکہ ان دونوں کا ذرّہ برابر ثبوت ہمارے پاس نہیں ہے۔ بلکہ میں اس خیال پر قناعت کروں گا کہ یا تو مجھے اس کی غلط اطلاع ملی تھی کہ کن حالات و معاملات میں وہ شخص پڑ گیا تھا۔ یا یہ کہ میں نے کافی طور سے اُس کی طبیعت کی معمولی رفتار پر غور و مطالعہ نہیں کیا تھا۔ بہرنوع اگر مجھ میں صحیح طور سے استدلال کی قابلیت ہے اور ساتھ ہی اس کے اگر اُس کے مزاج اور ان کل واقعات کا علم کلی حاصل ہے جو اُس کے گردوپیش تھے تو مَیں اُس طرزِ عمل کی پیشین گوئی کر سکوں گا جو اُن واقعات کے نتیجہ کے طور پر وہ اختیار کرے گا۔

علم مابعد الطبیعات کے اصول مرضی مختار اور مذہبی اصول تقدیر سے قطع نظر کر کے ہم اس نتیجہ پر کشاں کشاں لائے گئے ہیں کہ انسانی افعال و حرکات چونکہ اُن کے واقعاتِ ماقبل کی وجہ سے مقرر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اُن میں ایک قسم کی یکسانیت کی شان ہونا چاہیے یعنی یہ کہ ٹھیک ایک ہی قسم کے حالات و معاملات میں ٹھیک ایک ہی قسم کے نتائج پیدا ہونا چاہیے۔ اور چونکہ تمام واقعات ماقبل یا نفس انسانی میں ہوتے ہیں یا اُس سے خارج لہٰذا ہم کو صاف طور سے یہ نظر آجاتا ہے کہ نتائج میں جس قدر تغیرات ہوتے ہیں یعنی بالفاظ دیگر تمام وہ انقلابات جن کے ذکر سے تاریخ کے صفحات رنگے ہوئے ہیں اور نوع انسانی کی ساری گردشیں۔ اُس کی ترقی۔ اُس کا تنزل۔ اُس کی شادی اور اُس کا غم ایک دوگونہ تحریک کے نتیجے ہونا چاہیے یعنی ایک تو نفس انسانی پر آثارِ خارجی

کے عمل کا اور دوسرے آثار خارجی پر نفس انسانی کے عمل کا۔

یہی مواد ہے جسکے ذریعے سے ایک فلسفیانہ تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ ایک طرف نفس انسانی ہے جو اپنے وجود کے سارے قوانین کا تابع ومتبع ہے اور جب اُسپر کارپردازان خارجی کا قابو نہیں رہتا اُس وقت وہ اپنی ساخت اور ترکیب کے حالات کے لحاظ سے نشوونما پاتا ہے۔ دوسری جانب ہم اُس شے کو پاتے ہیں جسے قدرت یا

۱؎ مصنف کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس عقدہ کو حل کرے کہ انسان کوئی کام کرتا ہے تو کیوں کرتا ہے؟ اُس نے اول ہی اول اس بات کو طے کر دیا ہے کہ انسان نہ مجبور محض ہے نہ مختار محض۔ وہ انسان کو ایک حد تک با اختیار سمجھتا ہے اور ایک حد تک بے اختیار اور اُس کے فحوائے کلام سے یہ ٹپکتا ہے کہ وہ انسان کو اس میں بے اختیار سمجھتا ہے کہ اُسکے دل میں کوئی قصد یا ارادہ پیدا ہو یعنی بقول شاعر جو یہ دل چاہتا ہے کرتا ہے۔ قابو اس ناسمجھ پہ کس کا ہے اُس کے نزدیک انسان اپنے دل پر اختیار نہیں رکھتا۔ جذبات کے پیدا ہونے میں اُسکا کچھ قابو نہیں ہوتا لیکن قصد یا ارادہ کے پیدا ہونے کے بعد وہ اُس پر عمل کرے یا نہ کرے یہ ایک حد تک اُس کے اختیار میں ہے۔ اسی طرح کسی شے کا پسند یا ناپسند کرنا دل میں کسی شوق یا خواہش کا از خود پیدا ہوجانا بھی اُس کے بس کی بات نہیں وہ اپنے میں ایسے صفات جو اُس کی بدنی ترکیب اور دماغی ساخت کے مناسب نہ ہوں پیدا نہیں کرسکتا نہ اپنے رجحانات طبیعت کو جو جبلی اور خلقی ہوتے ہیں وہ بدل سکتا ہے۔ کیونکہ ان امور میں وہ مجبور ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ رجحانات وجذبات کیونکر پیدا ہوتے ہیں اور بنی آدم کے شمائل وخصائل میں یہ رنگا رنگی کس وجہ سے ہے؟ مختصر یہ ہے کہ دریافت کیا جائے کہ انسان کے افعال ارادی میں اس کا محرک کون ہوتا ہے؟ مصنف کے نزدیک وجوہ تحریک صرف یہ ہیں۔

(۱) انسان اپنے گرد وپیش جس قدر قدرتی ساز وسامان پاتا ہے وہ سانچہ ہوتے ہیں جنمیں اُس کی طبیعت ڈھلتی ہے۔ یہی ساز وسامان اُس میں خاص قسم کے جذبات ورجحانات پیدا کرتے ہیں۔ انھیں کی وجہ سے اُس میں قصد۔ ارادہ۔ خواہش۔ شوق۔ اور متعدد صفات پیدا ہوتے ہیں۔ اور انھیں کے وقتاً فوقتاً تغیرات سے انسان متاثر (صفحہ ۴۶ دیکھو)

فطرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ وہ بھی اگرچہ اپنے قوانین کی محکوم و مطیع ہوتی ہے۔ لیکن علی التواتر نفس انسانی سے دست و گریبان ہوا کرتی ہے۔ کبھی وہ اُس کے جذبات کو اُبھارتی اور جوش میں لاتی۔ کبھی اُن کے اذہان کو تیز کرتی ہے اور (اس طور سے) اُن کے حرکات و افعال کو ایسی راہ دکھاتی ہے جس کو (اگر یہ رخنہ اندازی نہ ہوتی تو) وہ کبھی اختیار نہ کرتے اسی سے ہم دیکھتے ہیں کہ نفس انسانی فطرت میں ترمیم و اصلاح کرتا رہتا ہے اور پھر فطرت انسانی نفس کی ترمیم و اصلاح کرتی رہتی ہے اور اسی باہمی ذوجہتین ترمیم و اصلاح ہی سے بداہتہً سارے نتائج پیدا ہونا چاہئیں۔

ہوا کرتا ہے اور انھیں کے مطابق افعال اُس سے صادر ہوتے ہیں۔ مثلاً جو لوگ پہاڑی ملکوں میں رہتے ہیں اُن کے اور میدانی ملکوں میں رہنے والوں کے خصائل میں ایک تفاوت عظیم ہوتا ہے کیونکہ پہاڑیوں کے نشیب و فراز۔ و شوار گذار راہیں۔ خطرناک جانوروں کے مسکنوں کا قرب اور اُن کا ہر وقت کا سامنا اور معمولی ازوقہ کا سامان فراہم نہ ہوسکنا۔ یہ سب باتیں وہاں کے رہنے والوں کو محنت اور جفاکشی پر مجبور۔ تکلیفوں کے برداشت کرنے پر جری۔ اور خطرات میں اوسان درست رکھنے اور نڈر ہونے پر تیار کر دیتے ہیں۔ برعکس اس کے میدانی ملکوں والے جو بیشتر زراعت و فلاحت کے ذریعے سے ازوقہ بہم پہونچاتے ہیں وہ نسبتاً سُست و کاہل۔ آرام پسند اور کسی قدر کم جرأت بھی ہوتے ہیں۔ یا مثلاً گرم ملکوں اور سرد ملکوں کے رہنے والوں کے شمائل و خصائل میں جو اختلافات ہوتے ہیں وہ محض آثار طبعی کی وجہ سے ہوتے ہیں (۲) خود انسان اپنے جد و جہد سے اپنے گرد و پیش کے قدرتی سامانوں میں بہت کچھ تغیرات کرتا ہے اور اُس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس تبدیل شدہ حالت کا اثر اُس کی سیرت و صورت و معاشرت پر پڑتا ہے اور اُس کی طبیعت کی ایک خاص افتاد ہو جاتی ہے اور وقتاً فوقتاً اُس سے وہی افعال سرزد ہوتے ہیں جو مقتضائے حالت ہوتے ہیں۔ مثلاً انسانوں نے جنگل کاٹے۔ پہاڑ کھود ڈالے۔ دریا پاٹے۔ گانوں اور شہر بسائے اور ہر جگہ اپنا رنگ جمایا۔ اب ہر مقام کی حالت اور موقع کے لحاظ سے اُسکی ضرورتیں اور حاجتیں۔ خواہشیں اور رغبتیں جدا ہوگئیں (صفحہ ۴۰ دیکھو)

سردست ہمارے سامنے جو معاملہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ طریقہ معلوم کریں جس سے اس دوہری ترمیم و اصلاح کے قوانین دریافت ہو جائیں - یہ کوشش (جیسا کہ ہم ابھی بیان کریں گے) ہم کو اس ابتدائی تحقیقات کی راہ دکھائے گی جس کا منشا تحقیقات کرنا ہو کہ ان دونوں (ترمیم و اصلاح) میں کون زیادہ اہم ہے یعنی یہ کہ آیا انسانی خواہشات و خیالات آثار طبعی سے زیادہ اثر پذیر ہوتے ہیں یا آثار طبعی اُن سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں - کیونکہ یہ بدیہی بات ہے کہ جو کوئی جماعت زیادہ متاثر ہو اُسی پر (اگر ممکن ہو) دوسرے سے پہلے غور و فکر کرنا چاہیے اور یہ کچھ تو اس لیے کہ چونکہ اُس کے نتائج زیادہ نمایاں ہوں گے لہذا اُس کا مطالعہ کرنا زیادہ آسان ہوگا - اور کچھ اس لیے کہ اگر ہم پہلے بڑی قوت کے قوانین کے کلیے بنالیں گے تو ایسے واقعات جن کی کچھ توجیہ نہ ہو سکے بہت کم رہ جائیں گے - لیکن اگر ہم چھوٹی قوت کے قوانین کے کلیات بنانے پر مصروف ہوں گے تو نتیجہ اسکے برعکس نکلے گا - لیکن اس امتحان میں پڑنے سے پیشتر بعض اُن قطعی شہادتوں کا پیش کرنا زیادہ مناسب ہوگا جو اس امر کے ثابت کرنے کے واسطے ہمارے قبض و اختیار میں ہیں کہ آثار ذہنی ایک ترتیب قاعدے کے ساتھ یکے بعد دیگرے ظہور پذیر ہوتے ہیں اس طور پر جو خیالات سابقاً مذکور ہوے ہیں وہ بہت قوی ہو جائیں گے اور ساتھ ہی اسکے ہم اس قابل ہو جائینگے کہ یہ دیکھ لیں کہ کون ذرائع ہیں جو اس اعلی مبحث کی توضیح کے واسطے کام میں لائے جا چکے ہیں -

---

ہر جگہ ایک نئے قسم کی سوسائٹی بن گئی اور وہ سوسائٹی بھی منجملہ اُن اُمور کے ہو گئی جو انسانوں کی سیرت و خصلت پر موثر ہوتے ہیں اور جن کے اثر سے محفوظ رہنا انسان کے اختیار میں نہیں -

مختصر یہ ہے کہ مصنف کے نزدیک کسی انسان کے

افتادِ مزاج اور عادتوں کی علت وہ قدرتی یا مصنوعی ساز و سامان ہوتے ہیں جو ایک انسان کے گرد و پیش ہوتے ہیں - یہی ساز و سامان اُسکو ایک خاص رنگ میں تر اور کر دیتے ہیں اور اُنھیں سے اُسکے رنج و راحت عیش و کلفت غضب و شفقت - بزدلی و جرأت وغیرہ وابستہ رہتی ہیں -

ظاہر ہے کہ جو نتائج حقیقت میں پیدا ہوئے ہیں وہ بیحد گراں قدر ہیں نہ صرف اس سطح وسیع کے لحاظ سے جس کو وہ کلیات گھیرے ہوئے ہیں بلکہ اُس غیر معمولی حزم و احتیاط کے لحاظ سے بھی جن سے وہ کلیات ترتیب دیے گئے ہیں کیونکہ ایسی حالت میں کہ اکثر مسائل اخلاقی کی تحقیق مذہب یا مابعد الطبیعات کے بعض اصول پر موقوف و منحصر رہی ہے۔ جس سلسلۂ تحقیقات کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ بالکل استقرائی ہے اُس کی بنیاد ایسے بیحد و شمار واقعات کے جمع کرنے اور ترتیب دینے پر مبنی ہے جو مختلف ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور نہایت واضح و لائح صورت سے یعنی حسابی نقشوں کی صورت میں پیش کیے گئے ہیں۔ پھر اُن کو ایسے اشخاص نے یکجا کیا ہے جو اکثر یہ حالت میں صرف حکام سرکاری ہونے کی وجہ سے کوئی خاص اصول بٹہ یا ثابت کرنا نہیں چاہتے تھے اور نہ اُن کی کوئی غرض اس میں شامل تھی کہ جس بارے میں رپورٹ کرنے کی ہدایت انھیں تھی اُس میں امر حق چھپایا جائے۔

افعال انسانی کے متعلق جو جامع ترین قیاسات ہر فریق کے مسلمہ ہیں اور ایسے حقائق سمجھے گئے ہیں جن میں محل چون و چرا نہیں ہے وہ اسی ذریعے سے یا اسی قسم کے دوسرے ذریعوں سے لگائے گئے ہیں اُنکی بنیاد علم الاعداد کی شہادتوں پر قائم ہے اور وہ ریاضی کی زبان میں بیان کیے جاتے ہیں اور جو شخص اس بات سے واقف ہے کہ صرف اس ایک طریقے سے کس قدر انکشاف ہو چکا ہے وہ نہ صرف یہ تسلیم کرے گا کہ آثار ذہنی کس قدر یکسانیت کے ساتھ پایۂ ظہور پذیر ہوتے ہیں بلکہ میرے نزدیک اسے یہ آسرا بندھ جائے گا کہ جس وقت وہ قوی ذرائع کام دینے لگیں گے جو معلومات کی موجودہ حالت میں بھی بفراوانی مہیا ہو سکتے ہیں اُس وقت اس سے بھی زیادہ اہم اور نتیجہ خیز انکشافات ہو جائیں گے۔ خیر۔ آیندہ تحقیقات کی بابت پیشین گوئی کو چھوڑ کر ہم کو سر دست معاملات انسانی میں اُسی یکسانیت اور باقاعدگی سے سروکار ہے جسے سب سے پہلے ماہرین

علم الاعداد نے بر روے کار کیا ہے۔

افعال انسانی ایک سہل اور صاف تقسیم کے ذریعے سے دو قسموں میں منقسم کیے گئے ہیں یعنی نیک و بد اور چونکہ یہ دونوں اقسام ایسے ہیں جن میں ایک خاص نسبت ہے کہ جب وہ جمع کیے جاتے ہیں تو ہماری کل اخلاقی خصلت کا مجموعہ بنجاتے ہیں اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس امر سے ایک بڑھے گا اُسی اندازسے دوسرا گھٹے گا۔ پس اگر ہم کسی زمانے میں انسانوں کے کسی گروہ میں بدکاری کی بابت یکسانیت اور باقاعدگی پائیں گے تو ہم سمجھ لیں گے کہ انکی نکوکاری میں بھی وہی ترتیب ملحوظ ہوگی۔ یا اگر ہم اُسکی نکوکاری میں کوئی ترتیب ثابت کرسکیں گے تو ہم اُس کی بدکاری میں بھی اُسی کی مساوی ترتیب کا قیاس ضرور کرلیں گے۔ کیونکہ ازروے قاعدہ تقسیم افعال کے یہ دونوں قسمیں صرف ایک دوسرے کی متمم ہیں۔ یعنی اگر ہم دوسرے پیرائے میں اسی مضمون کو ظاہر کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ بدیہی بات ہے کہ اگر یہ ثابت ہوجائے کہ انسان کے افعال ذمیمہ گردوپیش کی سوسائٹی کے تغیرات سے متاثر ہوتے ہیں اور اُنھیں کے بموجب ادلتے بدلتے رہتے ہیں تو ہم اس قیاس پر مجبور ہوں گے کہ اُن کے افعال حسنہ بھی اسی طرح ادلتے بدلتے ہوں گے کیونکہ اُن کے جملہ حرکات میں سے حرکات بد کے نکال لینے کے بعد جو باقی رہتا ہے وہی حرکاتِ نیک ہوتے ہیں اور اس سے ہم اس مزید نتیجے کے نکالنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ انقلابات نتیجہ ہوتے ہیں اُن بڑے اور عام اسباب کے جو جماعت انسانی کے مجموعے پر اپنا فعل کرنے کی وجہ سے ضرور کچھ نتائج پیدا کریں گے اور اس میں منفرد اشخاص (جو جماعت کے اجزاے ترکیبی ہیں) کی مرضی یا ارادے کا کچھ لحاظ نہ ہوگا۔

پس اگر انسانوں کے افعال اُس سوسائٹی کی حالت کے تابع اور محکوم ہوتے ہیں جس میں وہ انسان ہوتے ہیں تو ہم کو اس طرح کی ترتیب اور باقاعدگی پائے جانے کی

امید ہے۔ پھر اگر ہم کوئی ایسی ترتیب اور باقاعدگی نہ پا سکیں تو ہم یہ عقیدہ رکھ سکتے ہیں کہ اُن کے افعال محض ایسے متلوّن اور شخصی اصول پر منحصر ہیں جو ہر شخص کے واسطے مخصوص ہیں۔ مثلاً مرضی مختار یا اسی قسم کے کسی دوسرے اصول پر لہذا سب سے بڑھ کے کارآمد اور اہم یہ بات ہے کہ ہم اس امر کا یقین حاصل کریں کہ آیا کسی جماعت خاص کی ساری اخلاقی خصلت میں کچھ ترتیب اور باقاعدگی ہوتی بھی ہے یا نہیں اور یہ ٹھیک اُن مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے جس کے طے کرنے کے واسطے علم الاعداد نے ہمکو نہایت گرانبہا سامان مہیا کر دیا ہے۔

چونکہ وضع قوانین کا اصلی منشاء مجرم کے مقابلے میں، بیجرم کی حفاظت کرنا ہی۔ پس اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ یورپ کی سلطنتوں نے جب علم الاعداد کی اہمیت اور سودمندی کو جانا تو اُنھوں نے ایسے جرائم کے اعداد و شمار مہیا کرائے جن کی تعزیر اُنکو دینا چاہیے تھی۔ چنانچہ اسکی شہادتیں جمع ہوتی چلی گئیں حتیٰ کہ اب اُس کا ذخیرہ ایک خاص مجموعہ علمی کی حیثیت میں ہو گیا ہے جس میں وہ شرحیں اور حاشیے بھی شامل ہیں جو اُس سے متعلق ہیں اب یہ ضخیم مجموعۂ واقعات ہے جس کی اس ہوشیاری کے ساتھ تالیف و ترتیب اور اس عمدگی و وضاحت کے ساتھ تنقید کی گئی ہے کہ انسانی اخلاق کی بابت اب اس سے وہ سبق لیے جا سکتے ہیں جو زمانہ گذشتہ کے سارے مجموعہ تجربیات سے لیے نہیں جا سکتے لیکن چونکہ اس مقدمہ کتاب میں یہ ممکن نہیں کہ ہم ایک مکمل رؤداد اُن تمام قیاسات نتائج کی پیش کر سکیں جنھیں علم الاعداد کی واقعی حالت سے نکال سکنے پر ہم قادر ہیں اس لیے میں اسی پر قناعت کروں گا کہ دو تین بہت ضروری اور مفید امور پر نظر ڈالوں اور ان کے باہمی ربط و تعلق کو دکھاؤں۔

یہ بہت اچھی طرح خیال کیا جا سکتا ہے کہ تمام جرائم میں جرم قتل ایک ایسا جرم ہے جو بالکل خودسرانہ اور غیر منضبط ہے۔ کیونکہ جب ہم اس بات پر نظر کرتے ہیں کہ گو یہ جرم ایسا

ہے جس کا ارتکاب عام طور سے جبھی ہو سکتا ہے جبکہ ایک مدت مدید تک سیہ کاری میں مبتلا رہتے رہتے بدکرداری کی عادت سی ہوگئی ہو۔ لیکن اکثر اوقات وہ ایک فوری نتیجہ ہوتا ہے یکایک اشتعال طبع کا۔ یہ کہ اگر کبھی اُس کا منصوبہ پیشتر سے بھی باندھا جاتا ہے تب بھی اس خیال سے کہ دار و گیر نہ ہو اُس کے ارتکاب کے واسطے عمدہ موقع ہاتھ آنے کی ضرورت ہوتی ہے (جو شاذ ہی ہاتھ آتا ہے) اور اکثر اسی موقع کے تاک میں مجرم کو انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ کہ اسی کے واسطے مجرم کو گھات میں لگا رہنا اور ایام گزاری کرنا پڑتی ہے اور ایسا موقع مل جانے کی تلاش رہتی ہے جو اُس کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ پھر جب وہ وقت آ بھی جاتا ہے اُس وقت ممکن ہے کہ اُس کا دل پس و پیش کرے اور اُس وقت اس سوال کا جواب، کہ اسے ارتکاب جرم کرنا چاہیے یا نہیں چند متضاد تحریکوں کے موازنے پر منحصر ہوتا ہے۔ مثلاً قانون کا ڈر۔ مذہب نے جو عذاب کی وعیدیں کی ہیں اُن کا خوف۔ خود اپنے نفس لوّامہ کی نیش زنی۔ آئندہ ندامت و شرمساری کا اندیشہ۔ نفع کی چاٹ۔ حسد اور انتقام کا جوش اور خیالات نامرادی کا ہجوم جب ہم ان سب کو یکجا جمع کرتے ہیں تو اسباب کا ایک ایسا اُلجھاوا پڑتا ہے کہ ہم معقول طور سے اس امر سے نا اُمید ہو سکتے ہیں کہ جن نازک اور متزلزل ذرائع سے جرم قتل کا ارتکاب یا امتناع ہو سکتا ہے اُس میں کوئی ترتیب یا باقاعدگی ملے گی بھی لیکن اب یہ دیکھنا چاہیے کہ صورتِ حال کیا ہے؟ حالت یہ ہے کہ جرم قتل کا ارتکاب اس ترتیب اور باقاعدگی سے کیا جاتا ہے اور بعض معلوم حالات و اسباب سے اس قدر یکساں واسطہ و تعلق رکھتا ہے جتنا موسموں کا تغیر و تبدل اور طوفان کا مد و جزر۔ ایم کٹیلٹ صاحب جنھوں نے اپنی ساری عمر مختلف ملکوں کے اعداد و شمار کے جمع کرنے اور ایک عنوان سے ترتیب دینے میں صرف کر دی بیان کرتے ہیں کہ اُن کی سراپا محنت جستجو کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ "ہر ایک امر جو جرائم سے متعلق ہے اس میں

ایک ہی عدد اس تواتر سے بار بار پایا جاتا ہے کہ اُس کی بابت غلطی کا احتمال بھی نہیں ہو سکتا اور یہ کہ یہی حالت اُن جرائم کی ہے جو انسانی پیش بندی کے احاطے سے بالکل دور ہیں۔ مثلاً جرم قتل ہے جو اکثر ناگہانی نزاع باہمی کے بعد واقع ہوتا ہے اور وہ نزاع ایسے سببوں سے اُٹھ کھڑی ہوتی ہے جو بظاہر بالکل اتفاقی ہوتے ہیں۔ بیشک ہم تجربے سے جانتے ہیں کہ نہ صرف اسی قدر ہے کہ ہر سال قریب قریب ایک ہی تعداد میں قتل واقع ہوتے بلکہ یہ بھی ہے کہ جن آلات سے قتل واقع ہوتے ہیں وہ بھی قریب قریب ایک ہی تناسب سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ یہ ۱۸۳۵ء کا بیان ہے اور اُس شخص کی زبان سے نکلا ہے جو مسلمہ طور سے یورپ میں اول درجے کا ماہر علم الاعداد تھا اور اُس کے بعد اور جس قدر تحقیقات کی گئی اُس نے اس انکشاف کی تائید ہی کی بلکہ اخیر زمانے کی تحقیقات سے یہ عجیب وغریب بات متیقن ہوگئی ہے کہ جرائم کا یکساں طور سے مکرر سہ کرر واقع ہونا اُس سے زیادہ صاف وصریح اور پیشنگوئی کے قابل ہی تھا وہ قوانین طبعی ہیں جو ہمارے امراض اور فنائے اجسام سے متعلق ہیں۔ مثلاً ۱۸۲۶ء اور ۱۸۴۴ء کے درمیان فرانس میں اُن اشخاص کی تعداد جن پر جرم قائم کیے گئے ایک عجیب اتفاق سے جنس ذکور کی اُن اموات کے برابر تھی جو ایک ہی میعاد کے اندر پیرس میں واقع ہوئیں۔ فرق اس قدر تھا کہ جرائم کی تعداد میں (سال بسال) جو کمی بیشی ہوا کی وہ حقیقت میں اُس سے کم تھی جو اموات میں ہوئی۔ پھر ہر ایک جرم میں علحدہ علحدہ یکساں باقاعدگی معلوم ہوئی اور ہر جرم یکساں اور موقت تکرار واعادہ کا تابع نظر آیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات اُن لوگوں کو عجیب معلوم ہوگی جن کا یہ عقیدہ ہے کہ افعال انسانی بہ نسبت سوسائٹی کے عام حالت کی زیادہ تر ہر شخص واحد کے خصوصیات طبیعت پر منحصر ہیں لیکن ابھی ایک اور حالت جو اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے باقی رہتی ہے۔ منجملہ عام اور مندرجہ رجسٹر جرائم کے خودکشی سے بڑھ کے کوئی جرم ایسا نہیں ہے

جو بالکل منفرد اشخاص پر منحصر ہو۔ کیونکہ لوٹ مار کی کوششیں تو ممکن ہو کہ کامیابی کے ساتھ روک دی جائیں اور اکثر روک دی جاتی بھی ہیں۔ مثلاً کبھی تو وہی شخص جس پر حملہ ہوتا ہو وہ مزاحم ہو جاتا ہے۔ اور کبھی حکام معدلت اُن میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ لیکن جرم اقدام خودکشی اس قسم کی خلل اندازی سے پاک ہے۔ جو شخص اپنے آپ کو ہلاک کرنا ٹھان لیتا ہے اُس کے لیے مرتے وقت کسی دشمن کے حرکات نہ بوجی بھی مانع نہیں ہوسکتے۔ اور چونکہ وہ حکام مجازی کی روک ٹوک سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتا ہے اس لیے اُس کا یہ فعل گویا ساری دنیا سے الگ تھلگ ہو کے صادر ہوتا ہے اور بیرونی طور سے کوئی اُس کا ہاتھ پکڑنے والا ہوتا نہیں ہے اور اسی وجہ سے صاف صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فعل بہ نسبت کسی اور جرم کے زیادہ تر خود اُسکی اپنی مرضی کے بموجب واقع ہوتا ہے۔ پھر ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ عام طور سے دیگر جرائم کی بہ نسبت اس خودکشی کے جرم پر یار آشناؤں کے بھڑکانے کا اثر بہت کم پڑتا ہے اور اس طور سے چونکہ کوئی ساتھی سنگھاتی بھڑکانے والا نہیں ہوتا لہذا خودکشی کرنے والے لوگ اُن خارجی تعلقات کے اثر سے آزاد ہوتے ہیں جو شاید اُنکی مرضی مختار کو پابند کردیتے۔ اس لیے بہ تقاضاے فطرت یہ خیال بہت صحیح ہے کہ جرم خودکشی کو ایسے عام اصول کا پابند کرسکنا یا اُس میں ایسی باقاعدگی کا سراغ پاسکنا عملاً ممکن نہیں کیونکہ یہ جرم ایسا ہے جو بالکل دل کی ایک لہر پر موقوف اور اپنے مرتبۂ ذات میں حد سے زیادہ منفرد ہے اُس کو قانون کے شکنجے میں کس لینا اور اُس پر قابو پا جانا غیر ممکن ہے اور اس کے وقوع میں نہایت چالاک پولیس والے کا کچھ بھی بس نہیں چل سکتا پھر ایک اور روک ایسی ہے جو ہمارے خیالات کی رفتار میں حارج ہو اور وہ یہ ہے خودکشی کے بارے میں بہتر سے بہتر شہادت بھی ہمیشہ ناقص ہی ہوگی۔ مثلاً ڈوبنے سے جو موتیں واقع ہوتی ہیں ممکن ہے کہ وہ خودکشی میں داخل کیجائیں حالانکہ حقیقت میں

وہ اتفاقی ہوں۔ اور اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اتفاقی سمجھی جائیں حالانکہ وہ بالقصد ہوئی ہوں۔ یہی بات ہے جس سے نہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ خودکشی دل کی لہر پر موقوف اور قابو میں آنے والی نہیں بلکہ ثبوت کے لحاظ سے بالکل مخفی اور تاریک بھی ہے اور ان وجوہ سے یہ کچھ بیجا نہیں۔ اگر اس امر سے نا اُمیدی ہو جائے کہ کبھی اُن اسباب عامہ کا پتہ بھی لگے گا جس سے خودکشی کا ارتکاب ہوتا ہے۔

چونکہ اس جُرم کے یہ خصوصیات ہیں اس لیے یہ بشبہ ایک حیرت انگیز بات ہے کہ اس کے متعلق جس قدر شہادت ہمارے پاس موجود ہے وہ صرف ایک بڑے نتیجے پر دال ہے اور اُس سے ہمارے دلوں میں کوئی شک اس بارے میں باقی نہیں رہتا کہ خودکشی نتیجہ ہوتی ہے سوسائٹی کی عام حالت کا اور یہ کہ ہر منفرد مجرم صرف اُسی روش پر چلتا ہے جو حالات و اسباب ماقبل کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے سوسائٹی کی ایک معلوم حالت میں اشخاص کی ایک مقررہ تعداد کو اپنی جان آپ ہلاک کرنا چاہیے بس یہی قانون عام ہے اور یہ خاص مسئلہ کہ کون کون شخص اس جرم کا مرتکب ہوگا حقیقت میں مخصوص قوانین پر منحصر رہے گا اور وہ مخصوص قوانین (اپنے مجموعۂ عمل میں) بالضرور اُس بڑے قانون معاشرت کے تابع ہوں گے جس کے تحت میں وہ سب قانون ہیں اور اُس بڑے قانون کی قوت اتنی زبردست ہے کہ نہ زندگی کی محبت سے اُس قانون کے عملدرآمد میں کچھ بھی خلل پڑ سکتا ہے نہ عالم آخرت کے خوف سے۔ میں اس عجیب و غریب باقاعدگی کے اسباب کی تنقیح بعد کو کروں گا لیکن اس باقاعدگی کے وجود سے ہر ایک ایسا شخص واقف و مطلع ہے جو اخلاقی اعداد و شمار میں کچھ بھی درک رکھتا ہے۔ جن مختلف ملکوں کے بابت ہمارے پاس نقشے موجود ہیں وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ سال بسال ایک ہی تعداد اور تناسب سے لوگ خود اپنی جانیں ہلاک کرتے ہیں حتٰے کہ اگر ہم اس کا بھی لحاظ کریں کہ کامل شہادت فراہم ہونا

کس قدر محال ہے تب بھی یہ فرض کرکے کہ معاشرت کے حالات میں کوئی بین کمی بیشی نہ ہوگی ہم زمانۂ آئندہ کے بارے میں اموات اختیاری کی تعداد کی پیشین گوئی کریں گے اور اس میں غلطی کا احتمال نہایت کم ہوگا۔ خود اسی لندن میں جہاں ایسے انقلابات ہروقت واقع ہوا کرتے ہیں جو دنیا کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ محل عیش و عشرت دار السلطنت کے واسطے لازمی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ اس معاملہ میں اس قدر باقاعدگی ہے کہ شاید قوانین معاشرت کی بڑے خوش عقیدہ شخص کو بھی اتنی امید نہیں ہوسکتی تھی۔ کیونکہ پولٹیکل ہیجان۔ تجارتی ہیجان اور گرانی غلہ سے جو مصیبت پیدا ہوتی ہے وہ سب خودکشی کے سبب واقع ہوتے ہیں اور یہ سارے اسباب وقتاً فوقتاً ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ با ایں ہمہ اس دار السلطنت اعظم میں ہرسال قریب ۲۴۰۔ اشخاص کے اپنی جانیں آپ ہلاک کرتے ہیں اور غیر مستقل اسباب سے جو کمی بیشی خودکشی کی تعداد میں ہوتی ہے اُس میں سب سے بڑھی تعداد ۲۶۶۔ اور سب سے کم تعداد ۲۱۳ ہے ۱۸۴۶ء میں چونکہ ریلوے کے حادثے کے سبب سے بہت ہیجان ہوا تھا اس وجہ سے لندن میں ۲۶۶ خودکشیاں ہوئیں۔ ۱۸۴۷ء میں حالات کچھ سُدھر چلے اور تعداد گھٹ کے ۲۵۶ تک پہونچی۔ ۱۸۴۸ء میں ۲۴۷ کی نوبت آئی۔ ۱۸۴۹ء میں ۲۱۳ ہوئی اور ۱۸۵۰ء میں ۲۲۹۔

جس ترتیب اور باقاعدگی سے سوسائٹی کی ایک ہی حالت میں ایک قسم کے جرائم ضروری طور سے بکرّات و مرّات ہوتے ہیں اُس کی بابت جس قدر شہادتیں ہمارے پاس موجود ہیں اُن میں کا ایک جزء اور بہت قلیل جزء یہ ہے جو ہم نے پیش کیا ہے۔ اور اس شہادت کے پورے زور و قوت کے اندازہ کرنے کے لیے ہم کو صرف یہ بات ذہن نشیں کرنا چاہیے کہ ہم نے جو واقعات بیان کیے ہیں کچھ بالقصد چُن کے نہیں بیان کیے ہیں بلکہ جرائم کی بابت جو مبسوط نقشے بنائے گئے ہیں اُن سے یہ کلیات اخذ کیے گئے

ہیں اور یہ نقشے ایسے باقاعدہ مرتب ہوے ہیں جن میں لکھوکھا مشاہدات منضبط کیے گئے ہیں۔ یہ مشاہدات ایسے ملکوں پر حاوی ہیں جو تہذیب تمدن کے مختلف درجات میں ہیں جن میں گوناگوں خیالات وآرا پھیلے ہوے ہیں جنمیں اخلاق وسیرت کی رو سے بہت بڑے بڑے اختلافات ہیں۔ اگر ہم اسپر یہ اضافہ کریں کہ یہ اعداد اُن لوگوں نے جمع کیے ہیں جو خاص اسی خدمت پر مامور تھے جن کے پاس احقاق حق کے تمام وسائل مہیا تھے اور جنکی کوئی غرض اس میں شامل نہ تھی کہ لوگوں کو خواہ مخواہ فریب دیں تو یقیناً یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ جرائم کا ایک معین تعداد اور یکساں ترتیب سے واقع ہونا ایسی بات ہے جس کا اُس سے زیادہ بیّن اور قطعی ثبوت موجود ہے جتنا انسان کی اخلاقی تاریخ میں کسی اور بات کا ہے۔ ہم یہاں شہادت کے متوازی سلسلے (جو بڑی ہوشیاری سے قائم کیے گئے ہیں) بالکل ہی مختلف حالات واسباب میں پاتے ہیں اور وہ سب کے سب ہمیں ایک ہی راہ دکھانے اور ایک ہی نتیجہ نکالنے پر مجبور کرتے ہیں یعنی یہ کہ انسانی جرائم نتیجہ ہوتے ہیں اُس سوسائٹی کی حالت کے جس میں وہ فردِ خاص (جو مجرم ہوتا ہے) نشو ونما پاتا ہے نہ کہ خود اُس شخص کی خباثت نفس کے۔ یہ وہ قیاس صریح ہے جو بہت مبسوط اور واضح شہادت پر مبنی ہے اور وہ شہادت ایسی ہے جو سارے زمانے کے ہاتھوں پہونچ سکتی ہے اور اسی وجہ سے نہ اُسے کوئی تبدیل کر سکتا ہے نہ اُن تمام قواعد کلیہ کی رو سے جو علم مابعد الطبیعیات والوں یا اہل مذاہب کے ہاتھوں میں ہیں (جنھوں نے زمانۂ گذشتہ کے واقعات کو پراگندہ ومختل کر رکھا ہے) کوئی شخص اُسپر کچھ حرف رکھ سکتا ہے۔

ناظرین واقف ہیں کہ کس طرح عالم طبیعی میں نوامیس فطرت کی کارگزاری میں اکثر خلل پڑ جایا کرتا ہے۔ اُن کو اس کی بھی اُمید ہوگی کہ اخلاقی دنیا میں اُسی طرح کے فتور پڑتے ہوں گے۔ اس طرح کے فتور دونوں مقامات پر ادنےٰ درجے کے قوانین سے پیدا ہوتے ہیں کہ جو خاص موقعوں پر بڑے قوانین سے ٹکرا جاتے ہیں اور اس طور سے

ان کی بندھی ٹکی چال میں خلل انداز ہو جاتے ہیں اس کی ایک عمدہ مثال فن میکانکس[۱] سے ملتی ہے اُس میں ایک خوشنما اصول وہ ہے جسے متوازی الاضلاع قوتوں سے نامزد کرتے ہیں اور جسکے بموجب دو متوازی الاضلاع کی قوتوں میں وہی نسبت ہوتی ہے جو اُن دونوں کے قطروں میں باہم ہوتی ہے۔ یہ وہ قانون ہے جس میں بڑے نتائج نکالے جاسکتے ہیں اور اُس کا تعلق ایسے اہم قولے میکانیہ سے ہے جیسے تحصیل و تحلیل قوے۔ اور کسی شخص نے جو اُس شہادت سے واقف ہے جسپر وہ مبنی ہے اس کی صحت میں کبھی چون وچرا نہیں کی ہے لیکن جس وقت ہم اُس اصول سے عملی کام لینے پر متوجہ ہوتے ہیں اُس وقت ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصول دیگر قوانین سے

۱؎ میکانکس۔ (علم میکانات) وہ فن ہے جس میں قوتوں اور اجسام پر اُن قوتوں کے عمل کی ماہیت سے بحث کی جاتی ہے۔ خواہ وہ عمل بلاواسطہ ہو یا بواسطۂ آلات اور کلوں کے۔ اس علم کا موضوع لہ مادّہ پر قوت کا عمل ہے اس لیے اسے علم مادّہ حرکت یا مادّہ وازجی کہہ سکتے ہیں۔ مادہ پر قوت کا جو عمل ہوتا ہے اُس کی حقیقت تو بطور داب کے ہوتی ہے یا بطور تحریک کے۔ اور اُس سے حرکت پیدا ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ اگر قوتوں میں اتنا تناسب قائم ہوتا ہے کہ جس جسم پر اُن کا اثر ہے وہ ایک حالت موازنہ و معادلہ میں قائم رہتا ہے تو اُن کے اعمال کی تحقیق میکانکس کی اُس شاخ میں کی جاتی ہے جو اسٹیٹکس کہلاتی ہے جس کا موضوع لہ اجسام بحالت سکون یا موازنہ ہوتے ہیں اور جس میں سکون پیدا کرنے یا تبدیلی حرکت سے روکنے کی بابت قوت کا جو عمل ہوتا ہے اُس سے بحث کرتے ہیں۔ اگر قوتوں میں اتنا تناسب قائم ہوتا ہے کہ اُس سے حرکت پیدا ہوتی ہے تو اُس کی تحقیق ڈائنامیکس میں کی جاتی ہے جس کا موضوع لہ مادہ و حرکت ہوتا ہے اور جس میں جسم متحرک کی ماہیت اور نیز سبب حرکت سے بحث کی جاتی ہے۔ پھر جسم سیال (جس میں رقیق چیزیں یا بخارات شامل ہیں) کے بارہ میں اگر اُن کے موازنہ یا معادلہ سے بحث ہوتی ہے تو اسکو ہائیڈرا اسٹیٹکس سے موسوم کرتے ہیں اور اگر انکی حرکت کی تبدیلی یا سکون سے بحث ہوتی ہے تو ہائیڈرو ڈائنامیکس کہتے ہیں۔

اس فن کو اگلے فلسفیوں کے ہاتھوں بہت کم مدد ملی تھی۔ صرف حکیم ارشمیدس نے اس کے بعض بعض اجزاء کی بنیاد ڈالی تھی۔ البتہ سولھویں

جکڑا ہوا ہے مثلاً ہوا کے تصادم اور اُن اجسام کے اختلاف ثقل نوعی وجنسی سے جن پر ہم عمل کر رہے ہیں اور یہ قوانین اُن اجسام کی کیمیائی ترکیب اور (جیسا لفضول کا خیال ہے) نظم ذراتی (ہیولائی) سے پیدا ہوے ہیں۔ پس اس طور سے جو خلل اندازیاں واقع ہوتی ہیں تو ان کے سبب سے وہ صاف اور سادہ فعل قانون میکانی کا جاتا رہتا ہے یا ایں ہمہ اگرچہ اُس قانون کے نتائج میں پیاپے خلل پڑتا ہے لیکن وہ قانون بحال خود اچھوتا باقی رہتا ہے اور ٹھیک اسی طرح معاشرت کا یہ قانون اعظم بھی کہ انسان کے اخلاقی افعال صرف اُن کی اپنی ارادے کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ اسباب ماقبل کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ بجاے خود اگرچہ یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ اُسکے عملدرآمد میں کچھ آشفتگی و خلل اندازی ہو لیکن اُس کی صحت و صداقت پر حرف نہ آئے اور یہی بات اُن خفیف تغیرات کی توجیہ کے واسطے کافی ہو جو ہم کو کسی ملک کے سال بسال تعداد جرائم

صدی عیسوی کے بعد سے اہل مغرب نے اس فن کی تدوین شروع کی۔ اُس وقت گلیلیو نے اس کے اصول کو ریاضی کی شکلوں میں بیان کیا ۱۶۸۶ء میں سر اسحاق نیوٹن کی ایک تصنیف نے اس فن کی بنیاد تجربے پر مضبوطی سے اور قابل اطمینان طور پر قائم کی اور اُس وقت سے سلسلے کے ساتھ اس فن کے ایسے کامل اور ماہر پیدا ہوے جن کی بدولت یہ فن معراج کمال کو پہونچا اور آج اُسکے حیرت انگیز کرشموں سے سارا زمانہ واقف ہے کیونکہ یہ دخانی انجن یہ بڑی بڑی کلیں۔ یہ بادپیما سواریاں سب اسی کی بدولت ایجاد ہوئیں اور پہلیں امداہیں کی روزافزوں ترقی سے

انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا ایک بیّن ثبوت ملتا ہے۔ اس علم کے اولیں اصول جن کی تحقیق و انکشاف کا سہرا نیوٹن کے سر ہے یہ ہیں (۱) ہر جسم اپنی حالت سکون یا بخط مستقیم مسلسل حرکت میں اُس وقت تک قائم رہتا ہو جب تک وہ کسی قوت کے سبب اپنی حالت کی تبدیلی پر مجبور نہ ہو (۲) مقدار حرکت کی تبدیلی مقدار قوت کے تناسب سے ہوتی ہے اور اُسی خط مستقیم میں واقع ہوتی ہو جس میں وہ قوت عمل کرتی ہے (۳) ہر حرکت قسری کے واسطے ایک مساوی اور مقابل حرکت طبعی ہو یعنی دو جسموں کی باہمی حرکات ہمیشہ مساوی یا مقابل سمتوں میں مائل ہوتے ہیں وقس علیٰ ہذا۔

میں نظر آتے ہیں۔ بیشک جب ہم اس بات پر نظر کرتے ہیں کہ اخلاقی دنیا میں عالم طبیعی کے بہ نسبت کس قدر زیادہ ساز و سامان ہیں تو حیرت اسپر ہوتی ہو کہ یہ تغیرات اور زیادہ کیوں نہیں ہوتے اور اس لحاظ سے کہ یہ تغیرات بہت خفیف ہوتے ہیں ہمکو اس کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہو کہ معاشرت کے اُن وسیع قوانین ہیں (جن میں اگرچہ متواتر خلل اندازی ہوتی ہو پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہو کہ وہ ہرایک رُکاوٹ کو سر کر لیتے ہیں اور جن پر بڑے بڑے اعداد و شمار کی مدد سے غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہو کہ مشکل سے کوئی نمایاں فتور پیدا ہوتا ہو) اہم نتائج پیدا کرنے کی قوت کتنی بڑھی ہوئی ہے۔

صرف یہی نہیں ہے کہ انسانوں کے جرائم کے نتیجے کی یکسانیت ظہور دکھا رہی ہو بلکہ سال بھر میں جتنے معاہدے شادی بیاہ کے ہوتے ہیں اُن کی تعداد بھی مجرد اشخاص کے رجحان مزاج اور طبیعت کی رغبت سے طے نہیں ہوتے بلکہ بڑے اور عام واقعات جن پر اشخاص کا کوئی قابو نہیں چل سکتا اِس کا تصفیہ کرتے ہیں چنانچہ اب یہ بات دریافت ہو گئی ہے کہ شادیوں کو غلے کے نرخ سے ایک بندھی ٹکی نسبت ہوتی ہو اور انگلستان میں سو برس کے تجربے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ شادیوں کا تعلق ذاتی خواہشات سے نہیں ہوتا بلکہ اُنکا انعقاد عوام الناس کے بڑے طبقے کی اَوسط آمدنی سے وابستہ رہتا ہے حتیٰ کہ یہ شاندار مذہبی اور معاشرتی تقریب غلے کے نرخ اور مزدوری کی شرح کے ساتھ نہ صرف گھٹتی بڑھتی بلکہ اُنہی کے تابع و محکوم بھی رہتی ہو اور اسی طرح دیگر معاملات میں بھی یکسانیت دریافت ہو گئی ہے اگرچہ اس یکسانیت کے اسباب و وجوہ ابھی معلوم نہیں ہوے ہیں۔ مثلاً ایک عجیب معاملہ ہے کہ ہم اس بات کو ثابت کر سکتے ہیں کہ قوتِ حافظ کی غلط کاریاں بھی اِسی ضروری اور غیر متبدل قاعدے کے تحت میں اپنا جلوہ دکھا رہی ہیں۔ لندن اور پیرس کے ڈاکخانوں نے ابھی حال میں کچھ حسابی نقشے شایع کیے۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ سال میں کتنے خطوط ایسے ہوے ہیں جن پر خط لکھنے والوں نے بھولے سے پتہ لکھا ہی نہیں اور گردوپیش کے حالات کے اختلاف کو پیش نظر

رکھ لینے کے بعد) سال بسال جو نقشے بنتے ہیں وہ ایک دوسرے کی نقلیں معلوم ہوتے ہیں یعنے ہر سال ایک ہی تعداد خط لکھنے والوں کی یہ تعداد بھول جایا کرتی ہے اور اس طور پر ہم ہر زمانۂ آیندہ کی بابت سچ سچ یہ پیشین گوئی کر سکتے ہیں کہ کتنے اشخاص کی قوت حافظہ اِس ذرا سی بات اور (جیسا بظاہر معلوم ہوتا ہے) اتفاقی معاملے میں خطا کر جائیگی۔

جو لوگ واقعات کی باقاعدگی کی بابت ایک مستقل خیال رکھتے ہیں اور جنھوں نے مضبوطی سے اس صداقتِ کُبریٰ کو پکڑ لیا ہے کہ افعال انسانی کی رہنمائی چونکہ واقعات ماقبل کرتے ہیں اس لیے وہ حقیقت میں ادلتے بدلتے نہیں ہیں۔ بلکہ گو بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں تلوّن ہوتا ہے لیکن اصل میں وہ ایک جزء ہوتا ہے اُس وسیع اور عالمگیر نظام عالم کا جس کا کوئی مجمل خاکہ بھی ہم کو اپنی معلومات کی اِس موجودہ حالت میں نظر نہیں آسکتا۔ وہی لوگ اس رمز کو سمجھ سکتے ہیں (جو تاریخ کی کنجی اور اسکی جڑ بنیاد ہے) کہ یہ واقعات جو ابھی پیش کیے گئے ہیں بجاے اسکے کہ عجیب ہوں وہی ہونگے جن کی توقع کی جاتی ہے اور جو پیشتر سے معلوم ہونے چاہیے تھے۔ در حقیقت ترقی تحقیقات کی یہ چال اس قدر تیز اور مستقلانہ ہے کہ مجھے اس میں بہت ہی کم شبہہ ہے کہ قبل اسکے کہ ایک اور صدی ختم ہو سلسلۂ تحقیقات کامل و مکمل ہو چکے گا اور اُس وقت مشکل سے کوئی ایک مورخ ایسا نکلے گا جو اخلاقی دنیا میں اس یک لخت باقاعدگی کو اسی طرح تسلیم نہ کرتا ہو گا جس طرح آج کوئی فلسفی ایسا نہیں مل سکتا جو مادی دنیا کی باقاعدگی کو تسلیم نہ کرتا ہو۔

یہ کہا جائے گا کہ جو شہادت پیشتر اس بارے میں دی گئی ہے کہ ہمارے افعال تابع ہیں کسی قانون کے یہ علم اعداد سے ماخوذ ہے اور یہ شاخ ایسی ہے جو اگرچہ ابھی عالم طفولیت میں ہے مگر اُس نے فطرت انسانی کے مطالعے پر ایسی روشنی ڈالی ہے جتنی جملہ علوم سائنس (تجربیات و محسوسات) نے مل کے ڈالی ہے۔ بیشک اگرچہ ماہرین علم الاعداد نے اس مبحث عظمیٰ کے طے کرنے میں اُس طریق استدلال سے جو دیگر مقامات پر کامیاب ثابت ہو چکا ہے سب سے پہلے کام لیا ہے اور اگرچہ اُنھوں نے اعداد و شمار سے کام لے کے ایک بہت زبردست انجن احقاق حق کے واسطے لگا دیا

ہے لیکن ہم کو صرف اسی بنیاد پر نہ تو یہ خیال کرنا چاہیے کہ اور ذرائع و وسائل ایسے باقی نہیں رہے ہیں جن سے اُسکی نشو و نما اسی طرح نہ ہو سکے نہ ہمکو یہ قیاس کر لینا چاہیے کہ چونکہ اب تک علوم طبیعی تاریخ پر چسپاں نہیں کیے گئے ہیں لہذا وہ اس قابل نہیں کہ اُنکو چسپاں کر سکیں حقیقت میں اس بات کو دیکھ کے کہ کس قدر پے در پے انسان عالم خارجی سے دست و گریبان ہوتا رہتا ہے یقین ہوتا ہے کہ افعالِ انسانی اور قوانین طبیعی میں کوئی قریبی تعلق ضرور ہوگا۔ پس اگر اب تک یہ کوشش نہیں کی گئی کہ فن تاریخ پر طبیعیات کے سائنس منطبق کیے جائیں تو اسکی وجہہ یا تو یہ ہے کہ اہلِ تاریخ کو یہ تعلق باہمی نظر نہیں آیا ہے، یا یہ کہ اگر اُنھوں نے اس تعلق کو دیکھ بھی لیا ہے تو وہ اُس علم سے نابلد تھے جس سے اُسکی تاثیرات کا سُراغ لگا سکتے اور اسی سے تحقیقات کے دو بڑے صیغہ جات یعنی عالم ظاہری اور باطنی کے مطالعے میں ایک خلاف فطرت تفرقہ قائم ہے اور اگرچہ اہل یورپ کے علوم و فنون کی اس موجودہ حالت میں بعض میں آثار (جن میں کوئی غلطی نہین ہے) اس کے نظر آتے ہیں کہ اس حدِ فاصل مصنوعی کے توڑ دینے کی آرزو کی گئی ہے پھر بھی یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ اس مقصد عظمیٰ کے حاصل کرنے کے لیے اب تک واقع میں کچھ بھی نہیں کیا گیا ہے۔ اہل اخلاق۔ اہل شریعت اور اہل ما بعد الطبیعیات اپنے سلسلہ مطالعہ کی ترقی مین مست ہیں اور اہل سائنس کی کوششوں کو ادنیٰ درجے کی سمجھ کے اُن کی کچھ وقعت نہیں کرتے بلکہ اکثر اوقات اُن کی تحقیقاتوں پر یہ حملہ کرتے رہتے ہیں کہ وہ مذہبِ حق میں خطرناک اور عقل انسانی کے وسائل کی بابت ہم میں اس طرح کا اعتماد پیدا کرتے ہیں جو سزاوار نہیں ہے برعکس اسکے جو لوگ حکمتِ طبیعی کی نشو و نما کر رہے ہیں وہ چونکہ اپنے آپ کو ایک ترقی کُن جماعت جانتے ہیں اس لیے قدرتی طور سے اپنی کامیابی پر نازاں ہیں اور جب وہ اپنی تحقیقاتوں کا مقابلہ اپنے مقابل فریق کی زیادہ رُکی تھمی حالت سے کرتے ہیں تو وہ ایسے مشاغل سے بیزار ہو جاتے ہیں جن کی بے تمیزی اب مشہور ہو چلی ہے۔

اب یہ ایک مورخ کا کام ہے کہ وہ دونوں فریق کے درمیان ایک صلح وسط بنے اور

یہ دکھا کر کہ کون حد ہے جہاں دونوں کے مطالعۂ علمی کو ہم آغوش ہونا چاہیے اُنکی لنترانیوں کو کم کرائے۔ اس مصالحت کی شرائط کا طے کر دینا گویا تحلۂ تاریخ کے واسطے ایک بنیاد قائم کر دینا ہوگا کیونکہ تاریخ افعال انسانی سے بحث رکھتی ہے اور چونکہ افعال انسانی صرف نتیجہ ہوتے ہیں آثار داخلی و آثار خارجی کے تصادم کے اس لیے یہ ضروری ہو کہ ان آثار و مظاہر کی اعتباری اہمیت جانچی جائے اور جس حد تک کہ اُن کے قوانین کا علم حاصل ہے اُن کی تحقیق و تفتیش کی جائے اور آئیندہ انکشاف کے جو ذرائع ان دو بڑے گروہوں (یعنی فطرت اور نفس انسان کے مطالعہ کرنے والوں) کے پاس ہیں اُن کا صحیح اندازہ کیا جائے۔ میں کوشش کروں گا کہ آئندہ دو بابوں میں یہ مہم سر کروں۔ اور اگر اس کوشش میں مَیں کامیابی سے قریب بھی ہو جاؤں تو کم از کم یہ کتاب اس بارے میں ضرور قابل تعریف ہوگی کہ اس نے اس عمیق غار کے بھرنے میں کچھ مدد کی جو ہماری معلومات کی کمی کی وجہ سے ایسے علوم کو ایک دوسرے سے جُدا کیے ہوے ہے جو (فی الحقیقت) بالکل ملے ہوے ہیں اور جن میں کبھی جدائی نہ ہونا چاہیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ونصلّی علےٰ رسولہ الکریم

باب دوم

قوانین طبیعی کی تاثیرات سوسائٹی کی ترکیب

اور

اشخاص کے خصائل پر

جب ہم اس کا کھوج لگاتے ہیں کہ وہ کون کارکنان طبیعی ہیں۔ جن کا نہایت قوی اثر نسل انسانی پر پڑتا ہے تو ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ چار عنوانوں کے تحت میں آسکتے ہیں یعنی اقلیم[1]

[1] اقلیم (یہ ترجمہ ہے انگریزی لفظ کلائمٹ کا جو یونانی لفظ کلیم۔ یا قلیم سے ماخوذ ہے اور غالباً عربی میں لفظ اقلیم یونانی لفظ کا معرب ہے۔ جس کے اصلی معنی ڈھال یا جھکاؤ کے ہیں لیکن اصطلاح میں اسے کسی خطۂ زمین کیلیے بلحاظ قطب کی طرف اُسکے جھکاؤ کے اور نیز بلحاظ اُس تاثیر کے جو شعاع آفتابی کے سیدھے یا ترچھے ہونے سے حرارت پر پڑتی ہے بولتے ہیں) اس لفظ کو نہ صرف کسی ملک یا مقام کے درجات حرارت و رطوبت کے لحاظ سے استعمال کرتے ہیں بلکہ عموماً وہاں کے موسمی حالات و کیفیات کے لحاظ سے استعمال کرتے ہیں۔ جن کا اثر عالم نباتات و عالم حیوانات پر پڑتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں نظام بطلیموسی کی رُو سے کرۂ ارض کے ربع مسکون کی تقسیم سات اقلیموں پر کی گئی تھی۔ یہ تقسیم صرف خط استوا کے قُرب و بُعد کے لحاظ سے تھی کیونکہ اُسوقت زیادہ تر شعاعِ آفتابی حرارت پیدا کرنے والی سمجھی جاتی تھیں لیکن زمانۂ حال کے محققین نے مختلف مقامات کی موسمی حالتوں کے اختلاف و تغیر کے بابت یہ طے کیا ہے کہ وہ متعدد اسباب کے متحدہ عمل سے پیدا ہوئی ہیں۔ جن میں ملا

غذا ؁ سرزمین اور تمام منظرِ فطرت۔ آخرالذکر سے میری مراد اُن مظاہر سے ہے جو اگرچہ بصوت مخصوص کے ساتھ نظر کے سامنے ہوتے ہیں لیکن خواہ بذریعۂ نگاہ یا اور حواسوں کے توسط سے تلازم تصورات کی (یعنی ایک خیال سے دوسرے خیال کی ملنے کی طرف) رہنمائی کرتے ہیں اور یہی

؁ یہ چار سبب زیادہ سربرآوردہ ہیں (۱) اُس مقام کا خط استوا سے فاصلہ۔ اس کا اثر یہ ہے کہ جو مقام جس قدر زیادہ خط استوا سے قریب ہے اُس میں اُسی قدر زیادہ سیدھی شعاعیں آفتاب کی پڑتی ہیں اور اُسی قدر زیادہ وہ مقام آفتاب سے اکتسابِ حرارت کرتا ہے اور اسی طرح اسکے برعکس۔ یعنی جو مقام سب سے زیادہ دور ہے وہاں خطوطِ شعاعی کے بہت ترچھے ہوجانے سے حرارتِ آفتاب کا اثر سب سے کم پڑتا ہے۔ چنانچہ جو ملک خط استوا کے بالکل نیچے ہیں وہ سب سے زیادہ گرم ہیں اور جو ملک قطبین سے قریب ہیں وہ سب سے زیادہ سرد ہیں (۲) اُس مقام کی سطح سمندر سے بلندی اس کا اثر یہ ہے کہ جس قدر کوئی مقام سمندر سے زیادہ بلند ہوتا ہے اُسی قدر (بوجہ کرۂ زمہریر سے قرب کے) وہاں درجات حرارت گھٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ منطقۂ حارّہ میں بھی جو خط استوا سے قریب تر ہیں، بلند پہاڑوں کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ (۳) اُس مقام کا سمندر سے فاصلہ۔ اس کا اثر یہ ہے کہ جس قدر کوئی مقام سمندر سے قریب ہوتا ہے اُسی قدر وہاں کی آب و ہوا میں مساوات اور یکرنگی ہوتی ہے۔ چنانچہ جو مقامات سمندر سے بالکل قریب اور ایک ہی عرض البلد کے نیچے ہیں وہاں دن کے مختلف گھنٹوں اور سال کے مختلف مہینوں میں اوسط موسمی حالت میں بہت ہی کم اختلاف ہوتا ہے۔ اور وہاں درجات حرارت میں یکایک انقلاب بہت کم ہوا کرتا ہے۔ (۴) اُس مقام پر جو ہوائیں چلا کرتی ہیں عملی طور سے کسی مقام کے موسم کا تصفیہ ہوا سے محیط کی حرارت اور رطوبت سے ہوتا ہے۔ کیونکہ جو ہوائیں کسی مقام پر چلا کرتی ہیں اُن کی وجہ سے ایک طرف تو سمندر میں تموّج پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف بادل آتے اور برستے ہیں۔ اور یہ دونوں امر ایسے ہیں جو موسمی حالت پر نمایاں اثر ڈالتے ہیں۔ اگر ہوا نے کسی مقام تک پہونچنے میں زیادہ حصہ سمندر کا طے کیا ہے تو وہاں بارش زیادہ ہوگی۔ لیکن اگر وہ سمندر کی طرف سے آئی ہیں مگر انھوں نے سمندر کو طے نہیں کیا ہے تو بارش زیادہ نہ ہوگی۔

بنا پر اُنھوں نے مختلف ملکوں کے رہنے والوں کو خاص تصورات کا عادی بنادیا ہے انھیں چار عنوانوں میں سے کسی ایک کے تحت میں وہ سب آثار خارجی آسکتے ہیں جن سے انسان پر مستقل اثر پڑا کیا ہو ان میں سے آخر الذکر (جسے میں نے عام منظر فطرت سے تعبیر کیا ہے)

لہذا - اقلیم سے ہماری مراد وہ حالت طبیعی کسی مقام کی ہے جو اپنی ہیئت اور ساخت کے لحاظ سے خاص قسم کے اثر حیوانات اور نبات پر ڈالتی ہے - اور اسی معنوں میں یہ لفظ یہاں استعمال کیا گیا ہو بالفاظ دیگر اسے آب و ہوا کا مترادف سمجھنا چاہیے -

۲ غذا - واضح ہو کہ انسان کو بقاے حیات کے واسطے ابتدا ہی سے اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ کھاتا پیتا رہے - یہی غذا بدل ما یتحلل کرتی اور جسم کے نقصانات کو پورا کرتی رہتی ہے - انسان کی زندگی کے واسطے غذا کی ضرورت ہر شخص جانتا ہے - اس مقام پر صرف یہ بتانا ہے کہ اُس سے کون کون غرضیں پوری ہوتی ہیں -

• زمانۂ حال کے محققین نے عناصر کی جو تحقیق کی ہو اُس کی رُو سے ساٹھ اجزاے مفردہ ایسے ہیں جن سے کل اشیاء عالم مرکب ہیں اور جن کا تجزیہ نہیں ہو سکتا - انسان بھی ایک مخلوق ہے جسکی ترکیب جسمانی منجملہ ان ساٹھ اجزا کے صرف چند اجزا سے ہوئی ہو جیسے کاربن ہائیڈروجن - نائٹروجن - آکسیجن فاسفورس - البومن وغیرہ وغیرہ - اب جو غذا انسان کھاتا ہو اُسکی سب سے پہلی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ وہ ان اجزاے مفردہ کو اُس کے جسم مین مہیا کرتی رہے -

چونکہ مختلف ملکون کی آب و ہوا وغیرہ کے لحاظ سے جسم انسانی میں ان اجزا کا باہمی تناسب مختلف ہوا کرتا ہو اور یہ اختلاف موسم کی تبدیلیوں سے اور بھی بڑھ جایا کرتا ہے اس لیے مختلف ملکوں اور مختلف موسموں کے لحاظ سے انسانوں کی غذاؤں میں اختلاف ضروری ہو جاتا ہو - اور انسان کے لیے ہر حال میں یہ لازمی ہوتا ہے کہ جس وقت اُس کے اجزاے بدنی میں سے کسی میں کمی واقع ہو اُسوقت وہ ایسی چیزیں کھائے پیئے جو اُنھیں اجزا کی پوری کر دینے والی ہوں تاکہ اعتدال مزاجی قائم رہے مثلاً جن انسانوں کے بدنوں میں آکسیجن - کاربن نائٹروجن یا ہائیڈروجن کی ضرورت زیادہ ہو اُنکو ایسی غذائیں زیادہ کھانا چاہیے جنمیں یہی چیزیں زیادہ ہوں جیسے جانوروں کے گوشت - دودھ - انڈا - غلہ - ترکاریاں

قوتِ متخیلہ کو مشتعل اور برانگیختہ اور متعدد اوہام اور وساوس کو (جو علم کی ترقی میں بڑے سدِّ راہ ہیں) پیدا کر کے اپنے نتائج ظاہر کرتی ہے اور چونکہ کسی قوم کے عالمِ طفولیت میں اس طرح کے اوہام اور وساوس کی قوت سب پر غالب ہوتی ہے اسلیے یہ ایک واقعی امر ہے

شکر۔ نشاستہ۔ تھن۔ چربی۔ گھی۔ مکھن۔ جن انسانوں کو فاسفورس کی ضرورت ہو انکو گوشت۔ ہڈیاں ترکاریاں اور مچھلی زیادہ کھانا چاہیے۔ جس طرح انسانوں کی غذاؤں میں ملکوں اور موسموں کے اختلاف سے تغیر ہوا کرتا ہے اسی طرح مختلف غذاؤں کے عادی ہوجانے سے انسانوں کے شمائل و خصائل بھی مختلف ہوجایا کرتے ہیں۔ پس غذاؤں کی تحقیق سے دو نتیجے مرتب ہوتے ہیں۔ ایک تو بعض قسم کی غذاؤں کے استعمال سے اُسکے مذاقِ طبیعت اور رُجحانات کا پتہ لگتا ہے اور اُسکی جسمانی ترکیب میں اخلاط کا باہمی موازنہ معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً جس قسم کی غذائیں وہ کھاتا ہے وہ دلالت کرتی ہیں اس بات پر کہ اُسکی طبیعت میں کون خلط کس پر غالب ہے جس کی وجہ سے تقاضائے طبیعت یہی ہوتا ہے کہ وہ اُس خاص قسم کی غذا کا استعمال کرے۔ دوسرے یہ کہ اُنھیں غذاؤں کے اثر پر انسانوں کے توالد و تناسل اور باہمی معاشرت موقوف ہے۔ اور انسانوں کے کسی گروہ کی روزانہ خورش کے معلوم ہوجانے سے ہم اُسکی معاشرتی تعلقات کی بابت نہایت کارآمد نتائج نکال سکتے ہیں۔

۵۳ سرزمین - ترجمہ ہے انگریزی لفظ سوائل کا جس سے زمین کا وہ طبقہ بالائی مراد ہوتا ہے جس پر پودے اُگتے ہیں۔ واضح ہو کہ زمین کے طبقات کی تحقیقات سے یہ ثابت ہُوا ہے کہ مختلف ملکوں کی زمین میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف سطح بالائی کے چند طبقات میں ہے۔ نیچے کے طبقات میں زیادہ فرق نہیں (ہے) اسی سطح بالائی کے اختلاف سے ہر ملک کے نباتات میں یہ رنگارنگی نظر آتی ہے کہ بعض قسم کے درخت بعض زمینوں میں پیدا ہوتے ہیں اور بعض میں نہیں ہوتے۔ اور یہی اختلاف و تفرقہ بالواسطہ ایک سبب ہُوا کرتا ہے مختلف ملکوں کے حیوانات کے شمائل و خصائل کے اختلاف کا۔ اگرچہ نباتات کی پیدائش میں ہر مقام کی اقلیمی حالت بھی موثر ہوتی ہے لیکن تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ اکثر مقامات جن کی اقلیمی حالت یکساں ہے وہاں ایک ہی قسم کے درخت یا تو زمین پر جمتے ہی نہیں یا جم بھی جاتے ہیں تو پھل پھول نہیں لاتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سرزمین کے اجزائے ترکیبی کو بھی بہت کچھ

کہ مناظرِ فطرت کی رنگارنگی نے انسانی طبیعتوں اور خصلتوں کو گوناگوں کردیا ہے اور قوموں کے مذاہب و ملل میں وہ مخصوص شانیں پیدا کردی ہیں جن کا مٹانا بعض موقعوں پر ناممکن ہوتا ہے۔ جہاں تک ہماری واقفیت ہے باقی تین ارکان یعنی اقلیم۔ غذا اور سرزمین کا کوئی دخل نباتات کی روئیدگی و بالیدگی اور برگ و بار لانے میں ہے۔

۵ عام منظر فطرت ۔ واضح ہو کہ کسی ملک کے عام منظر فطرت سے مراد علی العموم وہ کل موجودات فطری ہیں جن کو ہم عالم خارجی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جن میں سے زیادہ تر بذریعہ نگاہ کے ہمارے پیش نظر ہوتے ہیں جیسے سمندر۔ دریا۔ پہاڑ۔ ریگستان و بیابان صحرا و مرغزار۔ آسمان کی مخصوص کیفیت اور فضائے محیط کی ایک خاص حالت وغیرہ وغیرہ۔

یہ بدیہی بات ہے کہ ان سب آثار فطری کو انسان مختلف حواسوں کے ذریعے سے محسوس کرتا ہے اور اس احساس سے اُسکے قلب پر گوناگوں کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ مثلاً سمندر کا مد و جزر۔ اُس کا زور شور سے بہنا۔ نگاہ کے سامنے ایک ناپیدا کنار چادر آب کا پھیلا ہونا۔ اُسکی موجوں کا تلاطم۔ اُنپر آفتاب کی کرنوں کا بیچینی سے پڑنا۔ پہاڑوں کا سربفلک کشیدہ ہونا۔ اُنکی چوٹیوں کا برف سے ڈھکا ہونا۔ اُنپر نباتات کی افراط یا تفریط۔ اُنکے دروں کا دشوار گذار اور ہولناک ہونا۔ اُنکی وادیوں میں کہیں رنگارنگ قدرتی چمن کھلے ہونا کہیں سبزہ زار کے درمیان کسی چشمے کے مصفا پانی کا بہنا۔ جنگلوں میں بڑے بڑے جھلارے درختوں کا مہیب صورت سے استادہ ہونا اُنکے اوپر اور نیچے موٹی مہین بیلوں کا پھیلا ہونا۔ اُن میں خوفناک درندوں کا ڈھکنا اور غُرانا ریگستان میں ریگ کے تودوں کا ادھر سے اُدھر ہو جانا۔ اُن میں لُوؤں کا چلنا۔ اور دُور دور تک درختوں کا سایہ تک نظر نہ آنا۔ مرغزاروں میں سبزۂ مخملی کا بچھا ہونا اُن میں خوبصورت اور نازک کمر جانوروں کا کلیلیں کرنا اور زقندیں بھرنا۔ آسمان پر کسی جگہ تاروں بھری رات میں کہکشاں کی ٹھنڈی سڑک کا لطف دکھانا۔ کہیں چاندنی چھٹکنا۔ کہیں آفتاب کا نیلگوں آسمان میں طلوع ہونا۔ کبھی شفق پھولنا۔ کبھی دھنک کا اپنی رنگارنگی دکھانا۔ کبھی بادلوں کا گرجنا۔ بجلی کا چمکنا۔ گھنگھور گھٹاؤں کا اُٹھنا۔ ٹھنڈی ہواؤں کا چلنا۔ کوئل اور پپیہے کا کوکنا۔ پانی کا رم جھم برسنا۔ قدرتی چمنوں سے خوشبوؤں کی لپٹوں کا آنا

براور است اثر اس قسم کا نہیں ہو لیکن (جیسا میں ابھی ثابت کروں گا) اُنھوں نے بہت ہی مہتم بالشان نتائج اور تاثیرات سوسائٹی کے عام نظم و تربیت میں پیدا کیے ہیں اور اُن کے سبب سے قوموں میں وہ عظیم اور نمایاں اختلاف نمودار ہوے ہیں کہ جنکی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ جن مختلف اقوام میں نوع انسانی منقسم ہے اُن میں ضرور کوئی اصولی اور بنیادی اختلاف ہے۔ اگرچہ ہر ایک قوم کی وہ اصلی مخصوصات جو اُسے دوسری قوموں سے ممیز و ممتاز کرتے ہیں بالکل فرضی ہیں پھر بھی اقلیم۔ غذا اور سرزمین کے اختلاف سے جو نیرنگیاں پیدا ہو گئی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ اُنکی قابل اطمینان توجیہ و تشریح کی جائے۔ اور اگر یہ سمجھ میں آ جائیں گی تو پھر اُن سے ساری مشکلیں حل ہو جائیں گی جو اب تک تاریخ کے مطالع کو تاریکی میں ڈالے ہوے ہیں۔ نظر بریں میرا یہ قصد ہے کہ اوّلاً میں اِن تین کارکنانِ اعظم کی جانچ پرتال اُس حد تک کروں جہاں تک کہ وہ انسان سے (اُسکی حالتِ معاشرت میں) واسطہ رکھتے ہیں اور اُن قوانین کا (اسقدر تیقن کے ساتھ جس قدر

نسیم سحر کا چلنا مرغان سحر کا زمزمہ سنج ہونا۔
یہ اور اسی قسم کی ہزارہا باتیں ہیں جنھیں ہم اپنے حواسوں کے ذریعے سے محسوس کرتے ہیں اور اُن کی وجہ سے کبھی ہماری طبیعتیں شگفتہ ہوتی ہیں کبھی پژمردہ و افسردہ۔ کبھی دلوں میں اُمنگ پیدا ہوتی ہے کبھی خوف غالب آتا ہے۔ کبھی گذرے ہوے زمانے کی یاد ستاتی ہے اور کبھی بچھڑے ہوے دوستوں اور عزیزوں کی جدائی بیقرار کرتی ہے۔ کبھی کام کرنے کی ہمت اور عزیمت پیدا ہوتی ہے اور کبھی شوقِ آسایش پاؤں پھیلا کر لیٹنے پر اُبھارتا ہے۔ کبھی شعر و سخن پر دل مائل ہوتا ہے۔ کبھی راگ راگنی کے چھیڑنے کی دھن سماتی ہے۔
چونکہ ہر مُلک کی مخصوص حالت کے لحاظ سے وہاں عالم خارجی کی کیفیت بھی جداگانہ ہوتی ہے اس وجہ سے اُس کی مختلف تاثیرات نے مختلف ملکوں کے باشندوں کے شمائل و خصائل پر عجیب و غریب اثر دکھائے ہیں۔ کسی ملک کے باشندے کالے ہیں تو کسی ملک کے گورے۔ کسی ملک کے باشندے قد آور۔ تنومند اور قوی الجثہ ہیں تو کسی ملک کے کمزور نحیف اور پستہ قد کسی مُلک کے باشندے سخت محنتی۔ جفاکش بُردبار ہیں تو کسی ملک کے آرام طلب محنت سے

کہ علوم طبیعی کی موجودہ حالت سے حاصل ہو سکے) سراغ لگا کے پھر باقی ماندہ کارکن یعنی عام منظر فطرت کی جانچ کروں گا اور پھر میں یہ کوشش کروں گا کہ اُن نہایت اہم اختلافات کو دکھادوں جو اُسکی رنگا رنگی سے مختلف ممالک میں ظاہر ہوے ہیں۔

لہذا۔ اقلیم۔ غذا اور سرزمین سے میں آغاز کلام کرتا ہوں۔ یہ ایک بدیہی بات ہو کہ یہ تینوں قوتیں بجدے ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ یعنی۔ کسی ملک کی اقلیم میں اور جو غذا وہاں پیدا ہوتی ہو اُسمیں بہت ہی قریبی تعلق ہوتا ہو۔ پھر یہی غذا بہت کچھ اُس سرزمین سے متاثر ہوتی ہے جسمیں وہ پیدا ہوتی ہے۔ جیسے مثلاً زمین کی بلندی یا پستی اور ہوا کی حالت وغیرہ۔ یعنی۔ مختصر الفاظ میں یہ غذا اُن تمام حالات و کیفیات سے اثر پذیر ہوتی ہو جن کے مجموعہ کو وسیع معنوں میں جغرافیۂ طبیعی سے موسوم کرتے ہیں۔

پس جب اِن کارکنانِ طبیعی میں ایسا گہرا اتحاد ہو تو یہ مناسب معلوم ہوتا ہو کہ انکی ہر ایک عنوان پر جُدا جُدا غور نہ کریں بلکہ اُن سب کی متحدہ کارروائی سے جس قدر نتیجے ظاہر ہوتے ہیں اُن میں سے ہر ایک نتیجہ کا جداگانہ عنوان قائم کرکے اسکے اوپر غور کریں۔ اس طور سے ہم اس پورے مسئلہ کے جزئیات پر نہایت وسیع نظر سے احاطہ کر سکیں گے اور اُن آثار کو (جو بجاے خود غیر منفک ہیں) جدا کر دکھانے میں جو زحمت اور پریشانی پیش آتی اُس سے بچ جائیں گے۔ اور پھر ہم نہایت صاف صاف طور سے یہ دیکھ سکیں گے کہ کسی سوسائٹی کی ابتدائی حالت میں فطرت کی قوتیں انسان کی قسمت پر کس حد تک قابل لحاظ اثر ڈالتی ہیں۔

اقلیم۔ غذا اور سرزمین سے جس قدر نتیجے کسی گروہ پر مترتب ہوتے ہیں اُن سب میں دولت کا فراہم ہونا سب پر مقدم اور متعدد حیثیتوں سے سبسے زیادہ اہم بھی ہو۔ کیونکہ اگرچہ علم کی ترقی تا لِ کار میں دولت کی افزونی میں آسانی اور سہولت پیدا کرتی ہو لیکن سوسائٹی کی پہلی ترکیب و قوام میں اول دولت جمع ہولیگی تب علم آسکے گا۔ جس وقت تک

ہر متنفس خود اپنی ضروریاتِ زندگی کے مہیا کرنے میں مصروف اور مشغول ہوگا نہ تو کسی کو اعلیٰ مشاغل کا ذوق و شوق ہوگا نہ اسکی فرصت - اور اُسوقت کوئی سائنس بھی پیدا نہ ہو سکے گی - اُس وقت انتہا سے انتہا اسی قدر ہو سکتا ہو کہ محنت بچانے اور مشقت میں کفایت شعاری کرنے کے واسطے کچھ بدنما بد قوارہ آلات اور اوزار ایسے ایجاد ہو جائیں جن کو وحشی اور نا تربیت یافتہ انسان بھی (باقتضاے ضرورت) ایجاد کر سکتے ہیں -

سوسائٹی کی اس طرح کی حالت میں پہلی اور بڑی ضروری کارروائی جو ہو سکتی ہو وہ دولت کا جمع کرنا ہو کیونکہ بغیر دولت کے فرصت و اطمینان نصیب نہیں ہو سکتا اور بغیر فرصتُ اطمینان کے علم ہاتھ نہیں آسکتا - اگر کسی سوسائٹی کی یہ حالت ہو کہ اُسکے افراد جس قدر کماتے ہوں اُسی قدر خرچ بھی کر ڈالتے ہوں تو اُس سوسائٹی میں کسی کے پاس نہ کچھ باقی بچتا ہوگا نہ کوئی پونجی جمع ہوتی ہوگی اور جب کوئی سرمایہ ہی جمع نہوگا تو سوسائٹی کے وہ افراد جو بیکار[۵] ہوں گے اور کسی کام سے لگے ہوے نہوں گے اُنکی بسر اوقات کا کوئی سامان ہی نہ ہوگا - لیکن اگر اُس سوسائٹی کی کمائی اُسکے خرچ سے زیادہ ہوگی تو اُسکی کمائی میں سے کچھ نہ کچھ ضرور پس انداز ہوتا رہیگا - اور یہی تو فیر مسلمہ اصول کے بموجب خود بخود بڑھتی ہی رہیگی اور بالآخر ایک ایسا اندوختہ فراہم ہو جائیگا جس سے اُسیوقت یا بعد چندے ہر ایسے شخص کی اعانت اور دستگیری ہو سکے گی جو اپنی پیدا کی ہوئی دولت پر بسر کرنے والا نہ ہوگا اور اُسوقت سب سے پہلے اہل دانش و بینش کی ایک جماعت کا وجود حیزِ وقوع میں آجانا ممکن ہو جائیگا - کیونکہ اب جا کے پہلے پہل سوسائٹی میں ایک اندوختہ ایسا موجود ہوگا جسکے ذریعے سے بعض افراد اُس شے کو اپنے مصرف میں لا سکیں گے جسے خود اُنھوں نے پیدا نہیں کیا ہو - اور اس طور سے وہ اس قابل ہوں گے کہ اپنے آپ کو ایسے اشغال میں

[۵] اس گروہ کو بیکار یا بے مشغلہ بھی کہہ سکتے ہیں اور بے کمائی والا بھی - یعنی وہ گروہ جو اپنی مشقت سے کچھ پیدا نہیں کرتا اور اپنی پیدا کی ہوئی دولت پر بسر نہیں کرتا ۱۲

مصروف کریں جن میں وہ اس ابتدائی حالت میں پڑ ہی نہیں سکتے تھے جبکہ اُنکی روزمرہ کی ضرورتوں کا تقاضہ یہ تھا کہ اُنھیں فرصتِ اطمینان نصیب ہی نہ ہو [۵۶]

اسی سے یہ بات ہے کہ معاشرت کی کُل ترقیوں میں دولت کی فراہمی سب پر مقدم ہونا چاہیے - کیونکہ دولت کے بغیر وہ علم جس پر (مَیں آگے چل کر ثابت کرونگا کہ) ساری تمدنی ترقی کا دار و مدار ہے اُسکی تحصیل کا نہ شوق پیدا ہوسکتا ہے نہ اُسکے واسطے فرصت میسر آسکتی ہے - اب یہ بدیہی بات ہے کہ ایک ایسی جماعت میں جو بالکل جاہل ہو جس سرعت کے ساتھ دولت پیدا ہوگی وہ (ابتداءً) موقوف ہوگی اُس جماعت کے مرزبوم کی خصوصیات پر - پھر زمانہ مابعد میں اور جب دولت کا کچھ سرمایہ جمع ہوچکے گا اُسوقت کچھ اور اسباب اپنا فعل کرنے لگیں گے - لیکن قبل اسکے کہ ایسا واقع ہو ترقی صرف دو باتوں پر منحصر ہوگی - اول - اُس توجہ اور باقاعدگی پر جس سے لوگ محنت و مشقت کریں گے - دوسرے اُس پیداوار پر جو فطرت کی فیاضی سے محنت و مشقت کے صلہ میں ملیگی - اور یہ دونوں سبب بھی بجائے خود نتیجہ ہونگے اپنے طبعی پیشرو اسباب کے - کیونکہ محنت و مشقت کے صلہ میں جو پیداوار حاصل ہوتی ہے وہ زمین کی زرخیزی اور حیثیت کے بموجب ہوتی ہے - اور یہ زرخیزی زمین کے بجائے خود کچھ تو زمین کے اجزائے کیمیائی کے اتصال باہمی کے موافق ہوتی ہے - کچھ اس حساب سے کہ کس قدر وہ زمین دریاؤں یا دیگر اسباب فطری کے ذریعے سے سیراب ہے اور کچھ اُس حرارت اور رطوبت کے تناسب سے کہ جو گرد و پیش کی ہوا میں ہوتی [۵۷]

---

۵۶ یعنی اب یہ نوبت آئے گی کہ بعض افراد محنت کریں گے اور محنت کرکے دولت جمع کریں گے اور بعض افراد فکر معاش سے فارغ ہو کے حقائق اشیا کی تلاش و فکر میں مصروف ہوں گے -

۵۷ مصنف کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمین کی زرخیزی کے تین سبب قرار دیتا ہے اور انھیں تین اسباب کے تناسب پر زمین کی زرخیزی کو مبنی بتاتا ہے - (۱) زمین کے اجزائے کیمیائی کا باہمی اتصال - (۲) زمین کی سیرابی کے وسائل بذریعۂ آبپاشی - (۳) ہوائے محیط کی حرارت و رطوبت - اُسکی تفصیل آگے چل کر بیان ہوگی -

ہے۔ پھر جس توجہ اور باقاعدگی سے لوگ محنت و مشقت کرتے ہیں وہ بالکل موقوف ہوتی ہے اقلیم کے اثر پر اور اُس کے اظہار کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ پہلی شکل (جو زیادہ صاف ہے) یہ ہے کہ اگر حرارت بہت سخت ہو گی تو آدمی نہ تو کام کرنے پر راغب ہوں گے نہ (ایک حد تک) وہ چالاکی اور پھرتی کے ساتھ اُس قسم کی محنت کے شایاں ہوں گے جو زیادہ دھیمی آب و ہوا (یا اقلیم) میں وہ بطیب خاطر کر گزرتے۔ دوسری شکل (جس پر اگرچہ بہت کم نظر ڈالی گئی ہے مگر ہے وہ بھی بہت اہم) یہ ہے کہ ایک محنت کرنے والے پر اقلیم کا اثر صرف اسی قدر نہیں ہوتا کہ وہ اُس میں مستعدی یا چستی و چالاکی پیدا کرتی ہے بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اُسکی عادتوں میں ایک باقاعدگی پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ اقصاے شمال میں رہتے ہیں اُن میں کبھی وہ مستقل اور ایک لخت محنت کیے جانے کی شانیں نہ پیدا ہوئیں جن کے واسطے منطقۂ معتدلہ کے باشندے معروف اور ممتاز ہیں۔ اسکی وجہ اُسوقت صاف نظر آنے لگتی ہے کہ جب ہم اس بات کو پیش نظر رکھتے ہیں کہ اقصاے شمال کے ملکوں میں موسم کی سختی و شدت اور بعض فصلوں میں روشنی کی کمی کے سبب سے وہاں کے باشندوں کے واسطے یہ ناممکن ہو جاتا ہے کہ وہ گھروں سے باہر نکل کے اپنے معمولی کاروبار میں مصروف رہ سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کاروباری لوگ مجبوراً اپنے معمولی کاروبار بند کر کے غیر منتظم عادتوں کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ اُنکی محنت و مشقت کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور اُن میں وہ حزم و استقلال باقی نہیں رہتا جو عرصۂ دراز کے مسلسل اور بے خلل جاری رہے ہوئے عملدرآمد سے ہمیشہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس طور پر اُن لوگوں کا یہ خاصۂ طبیعت ہو جاتا ہے کہ وہ بمقابلۂ ایسے اشخاص کے کہیں زیادہ متلوّن اور غیر مستقل مزاج ہوتے ہیں جنکے یہاں کی اقلیمی حالت معمولی کاروبار کو ایک ترتیب اور قاعدہ سے چلاتی رہتی ہے۔ بیشک یہ اصول اس قدر زبردست ہے کہ ہم اُسکی تاثیر عملی کو نہایت ہی متضاد حالات میں بھی مشاہدہ کرتے ہیں مثلاً بلحاظ آئین حکومت۔ قوانین۔ مذہب اور طرز معاشرت کے جس قدر فرق سویڈن اور ناروے سے اسپین اور پرتگال میں ہے اُس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ لیکن ان چاروں ملکوں میں ایک امر

خاص قدرِ مشترک ہے۔ یعنی ان میں سے ہر ایک ملک میں زراعت میں لگاتار مشقت کرنا ممکن نہیں ہو۔ ان میں سے دونوں جنوبی ملکوں (اسپین اور پرتگال) میں موسم کی حرارت اور یبوست سے اور اُسکے سبب سے جو حالت زمین کی ہو اُس سے مشقت میں خلل پڑ جایا کرتا ہے اور دونوں شمالی ملکوں (سوئیڈن اور ناروے) میں جاڑے کی شدت اور دن کے چھوٹے ہونے سے یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے۔ انجام یہ ہے کہ چاروں قومیں (جو اُن ملکوں میں آباد ہیں) اگرچہ اور حیثیتوں سے بہت کچھ مختلف الحال ہیں لیکن بلحاظ خصائل طبعی کے اپنے تلوّن اور بے استقلالی میں مشہور اور ضرب المثل ہیں۔ اور یہ لوگ مقابلے میں اُن لوگوں کے بالکل عکس معلوم ہوتے ہیں جو ایسے ملکوں میں رہنے کے سبب سے منضبط اور معیّن عادتیں رکھتے ہیں جہاں کا موسم کاروباری لوگوں کے معاملات میں بہت کم خلل انداز ہوا کرتا ہے اور اُنھیں مجبور کردیتا ہو کہ وہ زیادہ مستقل اور مسلسل اشغال میں مصروف ہیں۔

یہ ایسے بڑے اسباب طبیعی ہیں جن پر دولت کا پیدا کرنا منحصر ہے۔ اگرچہ کچھ شک نہیں کہ ان کے سوا اور بھی حالات و اسباب ہیں جو معقول قوّت کے ساتھ اپنا فعل کر رہے ہیں۔ اور سوسائٹی کی ترقی یافتہ حالت میں وہ بھی انھیں کے برابر بلکہ بعض اوقات ان سے بھی زیادہ اپنا اثر دکھاتے ہیں لیکن یہ کسی قدر زمانۂ مابعد میں ہوتا ہو اور دولت کے ابتدائی مدارج کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہی معلوم ہوتا ہو کہ اُس کا دار و مدار بالکل سرزمین اور اقلیم (کی نوعیت) پر ہوتا ہے۔ یعنی جس قدر محنت و مشقت کی جاتی ہے اُس کے حسب حیثیت صلہ تو سرزمین سے ملتا ہو اور خود محنت و مشقت کرنے والے میں اقلیم کے اثر سے ہمت و حوصلہ اور استقلال پیدا ہوتا ہو۔ اَب اِن دونوں اسباب طبعی کے بیحد زور و قوّت کے ثابت کرنے کے واسطے گزشتہ واقعات (تاریخی) پر صرف سرسری نظر ڈالنے کی حاجت ہے۔ کیونکہ تاریخ میں کوئی شہادت اِس امر کی نہیں ملتی ہے کہ کسی ملک میں خود اُسکی اپنی کوشش سے تمدن کا سایہ اُس وقت پڑا ہو جبکہ وہاں ان دو اسباب میں سے کوئی ایک سبب بھی عمدہ طور سے

موجود نہ ہو۔ چنانچہ ایشیا میں تمدن ہمیشہ اُس وسیع خطہ میں محدود رہا جہاں زرخیز اور دریا بر آمد سرزمین نے انسان کے لیے وہ سرمایۂ دولت مہیا کیا کہ جس سے حصہ پائے بغیر کوئی دماغی ترقی شروع ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ وسیع خطہ (بعض استثناء کے ساتھ) مشرقی چین سے شروع ہو کر ایشیاے کوچک۔ فنیشیا۔ اور فلسطین کے سواحل تک چلا گیا ہے اور اسی چوڑے چکلے منطقہ کے شمال میں ایک طویل سلسلہ اُس ویران مُلک کا ہے جس میں ہمیشہ وحشی اور خانہ بدوش جرگے بستے رہے ہیں اور یہ لوگ زمین کی بے فیضی کے سبب سے برابر غربت اور افلاس کے پنجے میں گرفتار رہے ہیں اور جب تک اُس سرزمین میں رہا کیے کبھی اپنی وحشیانہ حالت سے سر نہ اُٹھا سکے۔ اب یہ امر کہ کس قدر اسباب طبعی پر موقوف و منحصر ہے اِس بات سے واضح ہوتا ہے کہ اُنھیں منگول اور تاتاری جرگوں نے چین۔ ہندوستان اور فارس میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں اور اُنھیں نے ہر ایسے موقع اور مقام پر تمدن کا وہ درجہ طے کیا جو زمانۂ قدیم

۵ فنیشیا۔ اسے کنعان بھی کہتے ہیں۔ وہ مُلک جو قریب ۳۴ - ۳۶ درجے عرض البلد شمالی کے واقع ہے۔ اس کے مغرب میں بحر مڈیٹرینین۔ شمال و شرق میں ملک شام اور جنوب میں کوہِ جودی ہے۔ اس کا مجموعی رقبہ دو ہزار میل مربع ہے۔ طول میں دو سو میل تک چلا گیا ہے۔ لیکن عرض میں کسی جگہ بیس میل سے زائد نہیں۔ اس مُلک کی پیداوار کی برآمد نے جس میں سرو۔ شمشاد۔ صنوبر۔ دیودار۔ کھجور۔ انجیر۔ تاڑ۔ زیتون وغیرہ کے پھل اور درخت بھی تھے اس کو بہت شہرت دے رکھی ہے۔ یہاں میووں میں شفتالو۔ خوبانی۔ انار۔ بادام۔ ترنج۔ گنا۔ انگور۔ اور کیلا بافراط ہوتا ہے۔ پھر ریشم روئی۔ نیل اور تمبا کو بھی یہاں پیدا ہوتے ہیں اور چونکہ بکثرت بھیڑیں۔ بکریاں اور شہد کی مکھیاں ہوتی ہیں اس وجہ سے گوشت۔ دودھ اور شہد کی بھی کمی نہیں ہوتی اس ملک میں قیمتی دھاتیں نہیں ہوتیں لیکن لوہا بہت ہے۔

۶ فلسطین۔ (ارض مقدس) جنوب و غرب ایشیا کا ایک مُلک ہے جس میں شام کا جنوبی حصہ شامل ہے اس کے مغرب میں بحر مڈیٹرینین۔ مشرق میں وادی جارڈن۔ شمال میں کوہ لبنان کا سلسلہ اور جنوب میں دشت سینا ہے۔ انھیں حدود کے اندر ارض یہودا واقع ہے جس میں تاریخ عالم کے نہایت اہم واقعات پیش آئے اور معرکہ آرائیاں ہوئی ہیں۔ ۱۲

کی عروج یافتہ سلطنتوں کے تمدن سے کسی طرح رتبہ میں کم نہ تھا۔ وجہ یہ ہوئی کہ جنوبی ایشیا کے شاداب و سیراب میدانوں میں فطرت نے دولت کے تمام سامان جمع کر دیے تھے اور جب یہ وحشی قومیں وہاں پہونچیں تو انھوں نے پہلے پہل وہیں کچھ شایستگی پائی[نله]۔ پھر تو خود انھوں نے اپنی قوم کے علوم و فنون قائم اور مدوّن کیے۔ اور حسنِ معاشرت قومی کے واسطے ادب آداب قرار دیے۔ حالانکہ جب تک وہ اپنے اصلی وطن میں رہے اُن میں سے ایک بات بھی نہ کر سکے۔ اسی طور پر عرب لوگ جب اپنے مُلک میں تھے تو وہاں کی سرزمین کی بےحد یبوست کے سبب سے بالکل وحشی اور غیر متمدن تھے۔ کیونکہ اُن کے یہاں (اُسی طرح جیسے اور مقامات میں) بےحد غربت و افلاس کا نتیجہ بےحد جہالت تھی۔ لیکن ساتویں صدی (عیسوی) میں انھوں نے فارس کو فتح کر لیا۔ آٹھویں صدی میں اسپین کا بہترین حصہ اُن کے قبض و دخل میں آ گیا۔ نویں صدی میں پنجاب اور بعد چندے قریب قریب کُل ہندوستان پر اُن کا عملدخل ہو گیا۔ اور ابھی اُن کو اپنے نئے مفتوحہ ممالک میں قدم جمائے ہوے بہت زمانہ بھی نہیں گزرا تھا کہ اُن کی عادتوں اور خصلتوں میں ایک انقلاب ہوتا نظر آنے لگا۔ یعنی وہ لوگ جو اپنے وطن مالوف میں خانہ بدوش وحشیوں سے بہتر حالت میں نہ تھے پہلی مرتبہ دولت جمع کرنے کے قابل ہوے اور اس لیے اول اول اُنھوں نے کچھ ترقی اسباب تمدن میں کی۔ مُلک عرب میں ان کی حیثیت ایک خانہ بدوش چرواہوں کی قوم کی تھی۔ اپنے نئے مسکنوں میں وہ بڑی بڑی سلطنتوں کے بانی ہوے اور انھوں نے شہر بسائے، مدرسے قائم کیے۔ کتب خانے کھولے۔ اور ان کے مصارف کے واسطے جائدادیں وقف کر گئے چنانچہ اُن کی عظمت و شوکت کی یادگاریں اب تک قرطبہ۔ بغداد اور دہلی میں دکھائی دیتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح عربستان کے قریب شمال کی جانب ایک ریگستانی قطعہ ہے جو بحر احمر کے حائل ہونے کے سبب سے عرب سے کچھ تھوڑا جدا ہو گیا ہے۔ یہ قطعہ پورے افریقہ کو چھائے ہوے

نله مثلاً تبت کے تاتاریوں کی بابت اس بات کے باور کرنے کے وجوہ ہیں کہ انھوں نے اپنی الف بے ہندوستان سے پائی۔

ہے۔ ایک ہی عرض البلد کے نیچے واقع ہے۔ اور پچھم طرف بحر اطلانطک کے سواحل تک چلا گیا ہے۔ عربستان کی طرح یہ بالکل بیڑا اور بنجر ہے اور اسی سبب سے عربستان کی طرح وہاں کے باشندے بھی ہمیشہ وحشی اور غیر متمدن رہے اور محض اس وجہ سے کہ اُنھوں نے کبھی دولت جمع نہیں کی اُنھوں نے کبھی کوئی علم حاصل نہیں کیا لیکن اِس بیابان عظیم کا شرقی حصہ دریاے نیل کی موجوں سے سیراب ہوتا ہے اُس کی طغیانی کے ذریعے سے وہاں کی ریگستانی زمین ایک زرخیز دریا برآرمٹی سے پٹ جاتی ہے کہ جو مشقت کا صلہ بہ افراط دیتی ہے اور سچ یہ ہے کہ اُس پر جس قدر تردد کیا جاتا ہے اُس کا معاوضہ غیر معمولی طور سے مل جاتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُس مقام پر دولت بہت سرعت کے ساتھ جمع ہوگئی اور اسی کے باشندوں کو علم کی نشو و نما نہایت عجلت کے ساتھ ہوگئی۔ اور یہی پتلی سی چٹ مصری تمدن کی مرکز ہوگئی۔ یہ تمدن اگرچہ نہایت مبالغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے بہر نوع افریقہ کی دیگر اقوام کے مقابلے میں نہایت ممتاز اور نمودار ہے۔ کیونکہ افریقہ کی کسی اور قوم نے اب تک یہ قابلیت حاصل نہیں کی کہ خود اپنی ترقی کی راہ نکالتی یا کسی حد تک بھی اُس جہالت سے سر اُبھارتی جس میں فطرت کی بے فیضی نے وہاں کے باشندوں کو ڈال رکھا ہے۔

یہ خیالات صاف صاف ثابت کر رہے ہیں کہ تمدن کے ابتدائی دو سببوں (سرزمین اور اقلیم) میں سرزمین کی شادابی و زرخیزی وہ سبب ہے جس نے دنیاے قدیم میں سب سے زیادہ اثر دکھایا ہے۔ لیکن یورپ کے تمدن میں دوسرا رکن (یعنی اقلیم) بہت قوی اور متاثر ثابت ہوا ہے۔ اور (جیسا ہم دیکھ چکے ہیں) اُس کا اثر کچھ تو محنت مشقت کرنے والوں کی محنت کرنے کی قابلیت پر ہوتا ہے اور کچھ اُن کی عادتوں کی باقاعدگی یا بیقاعدگی پر۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ جس قدر اختلاف سبب میں ہوتا ہے اُسی قدر نتیجہ میں بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ ہر ایک تمدن میں سب سے پہلے دولت کا فراہم ہونا لازم ہے لیکن جو امور بعد کو واقع ہوتے ہیں وہ (کمتر نہیں بلکہ بیشتر) اُن حالات و اسباب پر موقوف و منحصر ہوتے ہیں جن میں دولت

جمع ہوتی ہے۔ مثلاً ایشیا اور افریقہ میں حالت یہ تھی کہ زمین زرخیز اور شاداب تھی اور اُس سے پیداوار با فراط و فراوانی ہوتی تھی لیکن یورپ میں اقلیم موافق تھی جس سے محنت و مشقت میں کامیابی ہوتی تھی۔ اول الذکر حالت میں نتیجہ موقوف تھا سرزمین اور اُس کی پیداوار کے تعلق پر۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ نتیجہ موقوف تھا محض اُس عمل پر جو عالمِ خارجی کا ایک حصہ دوسرے حصّے پر کرتا تھا۔ آخر الذکر حالت میں نتیجہ موقوف تھا اقلیم اور محنت کرنے والے کے تعلق پر۔ یعنی نتیجہ موقوف تھا محض اُس عمل پر جو عالمِ خارجی (خود اپنے اوپر نہیں بلکہ) انسان پر کرتا تھا۔ ان دونوں قسم کے تعلقات میں چونکہ اول الذکر کم پیچیدہ ہے اس لیے اُس میں خلل پڑنے کا احتمال کم ہے اور اسی وجہ سے وہ بہت جلد اپنا کرشمہ دکھانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ تمدن کی رفتار میں ایشیا اور افریقہ کے شاداب قطعات گوے سبقت لے گئے۔ لیکن اگرچہ اُن کا تمدن مقدم ہوا پھر بھی وہ سب سے اعلیٰ و افضل یا سب سے زیادہ مستقل ہونے سے بہت دُور رہا۔ اور چونکہ (بلحاظ اُن حالات کے جن کو میں ابھی بیان کرونگا) اصلی ترقی جو فی الحقیقت موثر ہے وہ فطرت کی فیاضی پر منحصر نہیں ہے بلکہ خود انسان ہی کی جدوجہد پر موقوف ہے۔ اسی وجہ سے یہ بات ہے کہ یورپ کا تمدن جو اپنی ابتدائی حالت میں اقلیمی کیفیت کا محکوم تھا اُس نے نشوونما کی وہ صلاحیت ثابت کر دکھائی جس کا کوئی پتہ نشان بھی اُن تمدنوں میں کہیں نہ تھا جن کی ابتدا سرزمین سے ہوئی تھی۔ کیونکہ فطرت کی قوتیں (باوجودیکہ بظاہر اُن میں بے پایاں وسعت ہے پھر بھی) محدود اور ٹھہری ہوئی ہیں اور کم از کم یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی بھی ثبوت اُس کا نہیں ہے کہ وہ کبھی بڑھی ہیں یا یہ کہ کبھی بڑھ سکیں گی۔ برخلاف اس کے انسان کی قوتیں (جہاں تک کہ تجربہ اور قیاس کو دخل ہے) نامحدود ہیں اور ہم کوئی شہادت ایسی نہیں رکھتے جس کی بنا پر کوئی فرضی اور خیالی حد بھی اُس کی قرار دے سکیں اور سمجھ سکیں کہ بس انسان کی عقل یہیں تک پہونچ کے تھم جائے گی اور اس سے آگے نہ بڑھ سکے گی۔ اور چونکہ یہ قوت نفسِ انسان کی جو اپنے وسائلِ ترقی کو خود بڑھاتی ہے انسان ہی کے واسطے

مخصوص ہے اور نمایاں طور پر اُس کو اُس شے سے ممتاز کر رہی ہے جسے عالم خارجی سے
سے تعبیر کرتے ہیں لهذا ابداہتہً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقلیمی حالت کی جس وساطت سے اسکی ہمت
بلند ہمتی اور اُس کے پاس دولت فراہم ہوتی ہے وہ بہ نسبت سرزمین کی وساطت کے اسکی
ترقی کے واسطے زیادہ مفید اور کارآمد ہے۔ کیونکہ اگرچہ سرزمین بھی دولت فراہم کراتی ہے
لیکن وہ انسان کے قوٰی میں کوئی تحریک یا جوش پیدا نہیں کرتی بلکہ اُس کے ذریعے سے
جو دولت فراہم ہوتی ہے وہ صرف زمین کی حالت اور پیداوار (جو فوراً پیدا ہوتی ہے) اُس
کی مقدار یا قیمت کے باہمی تعلق کی وجہ سے ہے۔

یہاں تک تو اُن مختلف طریقوں سے بحث ہوئی جن میں اقلیم اور سرزمین سبب ہوئی
ہیں دولت پیدا ہونے کا۔ لیکن ابھی ایک ورا امر باقی ہے کہ وہ بھی اسی کے برابر یا اس سے
بھی بڑھ کے اہمیت رکھتا ہے۔ یعنی جب دولت پیدا ہو چکتی ہے تو اُس وقت یہ سوال پیدا ہوتا ہے
کہ وہ تقسیم کیونکر کی جائے۔ یعنی کون حصہ متناسب طبقۂ اعلیٰ کو دیا جائے اور کون طبقۂ ادنیٰ
کو۔ سوسائٹی کی ترقی یافتہ حالت میں یہ بات موقوف ہوتی ہے بعض نہایت پیچیدہ حالات پر جن کا
مطالعہ اس موقع پر ضروری نہیں ہے لیکن سوسائٹی کی نہایت ابتدائی حالت میں اور قبل اسکے
کہ معاملات میں شائستگی اپنا اثر ڈالے اور تہذیب و ترقی کا دَور شروع ہو (میرے خیال میں
یہ بات ثابت کی جاسکتی ہے کہ) دولت کی تقسیم بھی اُسکے پیدا ہونے کی طرح بالکل قوانین طبیعی
کی محکوم ہوتی ہے۔ اور طرّہ یہ ہے کہ قوانین ایسے موثر ہیں کہ انھوں نے کرۂ ارض کے بہترین
حصّے کے باشندوں کو یکساں طور سے مسلسل اور لاعلاج عالم عزبت میں ڈال رکھا ہے۔ اگر یہ
دعوے (ہمارا) پایۂ ثبوت کو پہنچ سکتا ہے تو ان قوانین کا بیحد اہم ہونا ثابت ہو جائے گا۔
کیونکہ درانحالیکہ دولت ایک یقینی ذریعہ قوت کا ہے یہ بالکل بدیہی بات ہے کہ (اگر اور سب
حالات بالکل مساوی فرض کر لیے جائیں تو) تقسیم دولت کے بارے میں کوئی تحقیق و جستجو کرنا
گویا تقسیم قوت کے بارے میں تحقیق و جستجو کرنا ہے۔ اور اس لیے ایسی تحقیق و جستجو اُس

پولیٹکل (سیاسی) اور سوشل (معاشرتی) تفاوت درجات کی اصل و بنیاد پر روشنی ڈالے گی جن کے ظہور اور باہمدگر مقابلہ و معارضہ نے ہر متمدن ملک کی تاریخ کے بڑے حصّے کو گھیر لیا ہے۔[۱۱]

اگر ہم اس مسئلے کی ایک عام حیثیت پر نظر ڈالیں تو کہہ سکتے ہیں کہ جب ایک بار

۱۱ مصنف کا یہ مطلب ہے کہ دُنیا میں انسانوں کے درمیان جو مختلف طبقات و درجات قائم ہیں ان کی اصل بُنیاد یا دولت ہے یا اقتدار دنیوی۔ مثلاً بعض گروہ بہ اعتبار دولتمندی کے دوسرے گروہ سے اعلیٰ سمجھے جاتے ہیں اور دُنیوی وجاہت و سربلندی کے اُس سے افضل مانے جاتے ہیں۔ اور یہ دنیوی سربلندی اگرچہ علمی قابلیت یا مذہبی تقدس یا فضائل اخلاق یا دلیرانہ کارنامجات وغیرہ سے وابستہ ہوتی ہے۔ لیکن دراصل ان کی بنیاد بھی دولت کی جانب سے اطمینان و فراغت حاصل ہونے پر قائم ہوتی ہے۔ پس گویا سب کی اصل دولت ٹھہرتی ہے اور اگر یہ امر دریافت ہو جائے کہ دُنیا میں کس قاعدے یا قانون سے دولت مختلف طبقوں میں تقسیم ہوتی ہے اور کس طرح دولت کی کمی یا بیشی سے ایک گروہ تو معزز و مقتدر اور سربلند ہو جاتا ہے اور دوسرا گروہ اُس کا مطیع و منقاد و فرماں بردار رہتا اور اُس کی جوتیاں اُٹھایا کرتا ہے تو اس امر کے دریافت کرنے سے یہ منکشف ہو جائے گا کہ دُنیا میں یہ جو ہزاروں قسم کی تفریقیں ذات برادری کی ہیں اور یہ جو شرافت اور نجابت۔ حکومت و امارت کے مختلف درجات قائم ہو گئے ہیں ان کی اصل و حقیقت کیا ہے۔ کیونکہ ان امور کی تحقیق سے یہ واضح ہو جائیگا کہ دنیا میں یہ جس قدر تنازع للبقا (یعنی زندگی کا جھگڑا) ہے۔ جس کی رو سے ہر زبردست اپنے زیردست کو اپنا محکوم و مطیع بنانا یا صفحۂ ہستی سے اُسے مٹا دینا چاہتا ہے اور ہر اُونچے طبقے والا اپنے سے نیچے طبقے والے کو مغلوب رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور جسکی وجہ سے طرح طرح کی خانہ جنگیاں۔ میدان داریاں ہوا کرتی ہیں اور نت نئے مناقشات برپا رہتے ہیں جن کے ذکر سے تاریخیں بھری پڑی ہیں۔ ان سب کی کنہ حقیقت سے حجاب اُٹھ جائیگا۔ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہو کہ تاریخوں کے صفحات اسکی شہادت دے رہے ہیں کہ محض دنیوی امارت و ریاست و عزت و جاہ کے واسطے ملکوں اور قوموں میں بر سہا برس جنگ و جدل رہا کی ہے۔ اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا کیا ہے کہ بہت سی قوموں کا

دولت کی پیدایش اور فراہمی ٹھیک طور پر شروع ہو جاتی ہے اُس وقت وہ دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ یعنی مشقت کرنے والے گروہ اور مشقت نہ کرنے والے گروہ میں۔ اور بحیثیت ایک جماعت کے یہ دوسرا گروہ قابلیت میں زیادہ ہوتا ہے (اسے ہم کارفرما گروہ کہتے ہیں) اور پہلا گروہ تعداد میں زیادہ (اسے ہم کارکُن گروہ کہتے ہیں) جس سرمایہ سے دونوں گروہوں کی پرورش ہوتی ہے اُسے براہِ راست طبقۂ ادنےٰ والے (یعنی کارکُن لوگ) پیدا کرتے ہیں جن کے قواے طبیعی کو (کارفرما لوگ) طبقۂ اعلےٰ والے (اپنی غالب ہنرمندی کے ذریعے سے) ایک راہ دکھاتے ہیں مجتمع اور متفق کرتے ہیں اور کفایت شعاری سے صرف کراتے ہیں[۱]۔ اب کارکُن اشخاص کو جو کچھ صلہ ملتا ہے وہ تو اُنکی اُجرت یا مزدوری سے نامزد کیا جاتا ہے اور کارفرما صحاب کو جو کچھ صلہ ملتا ہے وہ اُنکا منافع کہلاتا ہے۔ پھر آگے چل کے ایک اور گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو سرمایہ دار (یعنے

نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ گیا اور صرف تاریخ کے صفحات پر رہ گیا۔ بہت سے مُلک تباہ اور بڑے بڑے شہر خاک سیاہ ہو گئے۔ پس چونکہ ان سب انقلابات اور محاربات کی بنیاد دہی تقسیم دولت کے قوانین طبیعی ہیں اس لیے لازم ہے کہ سب سے پہلے اُن اصول کلیہ اور امور ابتدائیہ کو دریافت کریں جن کے رُو سے دولت پیدا ہوتی ہے اور مختلف طبقاتِ انسانی میں تقسیم ہوا کرتی ہے۔

[۱] اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ جیسے زمیندار اور ٹھیکہ دار تو پہلے گروہ میں ہیں اور کاشتکار اور مزدور دوسرے گروہ میں۔ زمیندار اور ٹھیکہ دار صرف یہی کرتے ہیں کہ خود کوئی محنت نہیں کرتے اور اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے بلکہ کاشتکاروں اور مزدوروں سے کام لیتے ہیں۔ جو کام دس بیس آدمیوں سے مل کے کرنے ہوتے ہیں اُن کا اہتمام کرتے ہیں اور اُس کی نگرانی رکھتے ہیں اور بہ سبب اپنی قابلیت اور تجربہ کاری کے ایسی ترکیبیں سوچتے اور اُن پر عمل کرتے ہیں جن سے تھوڑی محنت میں بڑے کام ہو جائیں اس نگرانی اور کارفرمائی کے صلے میں اُن کو ایک حصہ اُس پیداوار کا ملتا ہے جو کاشتکاروں اور مزدوروں کی محنت سے حاصل ہوتی ہیں۔

آمدنی سے پس انداز کرنے والا) گروہ ہوتا ہے۔ یہ ایسی جماعت ہوتی ہے جو نہ کارکن ہوتی ہے نہ کارفرما۔ بلکہ وہ اشخاص کا ایک ایسا مجموعہ ہوتا ہے جو اپنا اندوختہ اور سرمایہ کارفرما اشخاص کو مستعار دیا کرتا ہے اور اس قرضے کے عوض اُس صلے کا ایک جزء لے لیا کرتا ہے جو کارفرما اصحاب کو ملتا ہے۔ اس صورت سے سرمایہ دار اشخاص کو بوجہ اس کے کہ انھوں نے اپنے اندوختہ کے خرچ کرنے سے احتیاط کی (اور اُسے اپنے صرف میں لائے بلکہ کارفرما اصحاب کی ضرورت پر کام آنے کے واسطے لگا رکھا) صلہ ملا کرتا ہے اور یہ صلہ اُن کے سرمایہ کے سود سے موسوم ہوتا ہے۔ پس۔ یہ سہ گانہ تقسیم یوں ٹھہری۔ سُود منافع اور اُجرت۔ لیکن یہ انتظام بعد کو مکمل ہوتا ہے کیونکہ یہ اُسی وقت ظہور پذیر ہو سکتا ہے جب جب دولت معتدبہ طور سے فراہم ہو چکتی ہے۔ لیکن سوسائٹی کی جس حالت (ابتدائی) پر ہم غور کر رہے ہیں اُس میں یہ تیسرا گروہ علیحدہ طور سے موجود نہیں ہو سکتا[۱۲]۔ لہذا۔ ہماری موجودہ ضرورت کے لحاظ سے اُسی قدر کافی ہے کہ ہم یہ تحقیق کر لیں کہ وہ کون قوانین طبعی ہیں کہ جو دولت کے جمع ہوتے ہی اُس کی تقسیم کا تناسب کارکن اور کارفرما جماعتوں میں قائم کرتے ہیں[۱۳]۔

اَب یہ بدیہی بات ہے کہ اُجرت چونکہ قیمت ہوتی ہے محنت و مشقت کی لہذا اُس کی شرح دیگر ضروریاتِ زندگی کی طرح نرخِ بازار کی بموجب گھٹتی بڑھتی رہے گی۔ اگر کسی مقام پر مشقت کرنے والے مزدور اُس سے زیادہ ہوں گے جتنے وہاں درکار ہیں تو مزدوری

۱۲ کیونکہ ابتدائی حالت میں تو یہی کارفرما گروہ سرمایہ دار گروہ بھی ہوتا ہے اور وہ اپنی عقل اور دولت دونوں کے ذریعے سے کارکن گروہ کو مسخر کیے رہتا ہے۔ اپنی عقل کے زور سے وہ اُن پر حکومت کرتا ہے اور اپنی دولت کی وجہ سے وہ اُنھیں اپنے سے جدا ہونے نہیں دیتا۔ اور ہمیشہ قابو میں رکھتا ہے۔

۱۳ یعنی یہ بات تحقیق کرنا ہے کہ جو دولت پیدا ہوتی ہے اُس کا کون حصہ کارفرما جماعت کے ہاتھ میں جاتا ہے اور کون حصہ کارکن لوگوں کی قسمت میں آتا ہے۔

گھٹ جائے گی اور اگر مزدوروں کی مانگ رسد سے زیادہ ہوگی تو مزدوری کا نرخ چڑھ جائیگا۔ تو اب اگر ہم کسی ملک میں یہ فرض کریں کہ وہاں ایک معینہ رقم کارکنوں اور کارفرماؤں میں تقسیم کرنے کے واسطے ہے تو وہاں اگر کارکنوں کی تعداد میں کچھ بھی بیشی ہوگی تو اُس کا یہ اثر ہوگا کہ ہرایک کو جو صلہ (یا معاوضہ) ملتا ہے وہ گھٹ جائے گا۔ اور (اگر ہم اُن رخنہ پرداز اسباب کو نظرانداز کر ڈالیں جو ہر ایک عام طرز خیال پر موثر ہوتے ہیں تو) یہ معلوم ہوگا کہ مآل کار میں مزدوری کا مزدوری کا مسئلہ (گویا بالکل) آبادی کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ اگرچہ وہ رقم جو حقیقت میں بطور اُجرت (یعنے مزدوری میں) دی جاتی ہے اُسکی مجموعی مقدار اُس سرمایہ کی زیادتی پر موقوف ہوتی ہے جسمیں سے مزدوری دی جاتی ہے۔ پھر بھی ہر ایک شخص کو جو رقم مزدوری میں ملتی ہے وہ مزدوری پانے والوں کی تعداد کی زیادتی کے مطابق گھٹ جائیگی یہاں تک کہ دیگر حالات کی وجہ سے خود سرمایہ اتنا بڑھتا رہے کہ جس قدر مزید مطالبات بڑھتے جائیں اُن کے لیے کافی ہوتا چلا جائے[1]۔

اَب اِس بات کا جاننا بہت ہی کارآمد ہے کہ وہ کون اسباب ہیں جو مزدوری کے بڑھانے میں بجد معین ہوتے ہیں۔ لیکن ہم کو سردست اُس سے چنداں سروکار نہیں۔ ہمارے سامنے جو مسئلہ ہے وہ دولت کی فراہمی کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ اُسکی تقسیم کا مسئلہ ہے اور ہماری غرض یہی ہے کہ یہ جان لیں کہ وہ کون اسباب طبیعی ہیں جو آبادی کو بسرعت بڑھاکے مزدوری کے بازار میں اژدحام پیدا کردیتے اور اس طور پر اوسط شرح مزدوری کو

[1] ظاہر ہے کہ مزدوری کا گھٹنا بڑھنا یا تو اُس رقم مجموعی کی کمی زیادتی پر منحصر ہوگا جو مزدوری میں دی جاتی ہے یا اُن مزدوروں کی تعداد کی قلت و کثرت پر جو اُس میں حصہ پاتے ہیں۔ لیکن بہر نوع ایک معین سرمایہ کے تسلیم کرلینے پر یہ یقینی ہے کہ ہر ایک شخص کے حصّے میں جو کمی بیشی ہوگی وہ محض حصوں کی کمی بیشی پر موقوف ہوگی۔ یعنی جس قدر زیادہ حصوں میں اُسے تقسیم کریں گے اُسی قدر ہر حصہ گھٹ جائے گا۔ اور جس قدر کم حصوں میں اُسے تقسیم کریں گے اُسی قدر ہر حصہ بڑھ جائے گا۔

بہت ہی اُتار دیتے ہیں۔

تمام اُن کارکنان طبیعی میں جن سے مزدوری پیشہ جماعت کا اضافہ ہوتا ہی غذا سب سے زیادہ موثر اور عالمگیر کارکُن ہے۔ اگر دو مُلک جو اور حیثیتوں سے مساوی ہوں صرف اس بارے میں مختلف ہوں کہ ایک میں قومی[۱۵] غذا ارزاں اور بافراط موجود ہو اور دوسرے میں گراں اور کمیاب۔ تو جس مُلک میں غذا ارزاں اور بفراوانی ہوگی اُسکی آبادی ضرور اُس سے زیادہ سُرعت کے ساتھ بڑھے گی جس سُرعت سے اُس مُلک کی آبادی بڑھیگی جہاں غذا کمیاب اور گراں ہوگی۔ اور اسی دلیل کی رُو سے اول الذکر مُلک میں مزدوری کی شرح دوسرے مُلک کے بہ نسبت گھٹی رہے گی۔ اور یہ صرف اس وجہ سے کہ وہاں مزدوری کا بازار ہمیشہ کافی طور سے پٹا پڑا رہے گا (یعنی وہاں مزدوروں کی ریل پیل ہوگی) لہذا۔ اُن قوانین طبیعی کی بابت کوئی تحقیقات کرنا جن پر کسی مُلک کی غذا موقوف و منحصر ہوتی ہی ہمارے موجودہ اغراض و مقاصد کے اعتبار سے بیحد اہم ہی۔ اور خوش قسمتی سے یہ معاملہ ایسا ہی کہ کیمسٹری[۱۶]

[۱۵] یعنی وہ غذا جو اُس قوم کے اکثر افراد کی معمولی خورش ہوتی ہے جیسے اہل بنگال کی قومی غذا مچھلی۔ بھات۔ یا افغانیوں کی قومی غذا مختلف قسم کے گوشت اور میوہ جات ہیں۔

[۱۶] کیمسٹری۔ علوم طبیعی کی وہ شاخ ہی جس میں (۱) دو یا زیادہ چیزوں کے ملنے سے جو ایک تیسری چیز پیدا ہوتی ہے اور جس کے خواص اپنے اجزائے ترکیبی کے خواص سے جدا ہوتے ہیں۔ اُس سے یا (۲) ایک مرکب شے کی تجزی سے جو اجزائے مفرد الگ الگ ہو جاتے ہیں اُس سے بحث کی جاتی ہے۔ چونکہ اجزا کی تحصیل و تحلیل بغیر اس کے کہ اُن کے خواص کا علم کامل نہیں ہو سکتی اس لیے یہ لازم آتا ہی کہ اس علم میں بالکل مفرد اور عنصری اجزا پر اسی طرح نظر ڈالی جائے جس طرح مرکبات پر ڈالی جاتی ہی اس لیے اس کے دائرۂ بحث میں اجزائے مفردہ سے مرکب بنانا اور اشیا سے مرکب کے اجزائے مفردہ نکالنا داخل ہوتا ہے۔ اور پھر اُن اجزا کے خواص کا جاننا بھی۔

زمانۂ قدیم میں جو شائستہ قومیں گذری ہیں اُن میں سب سے زیادہ مصریوں نے اِس علم

(علم کیمیا) اور فزیالوجی[کلہ] (علم خواص اعضا) کی موجودہ حالت کے لحاظ سے ہم اس قابل ہیں کہ جانچے ہوے اور ٹھیک نتائج پر پہونچ سکتے ہیں۔

جو غذا انسان کھاتا ہے اُس سے دوا اور صرف دوا اثر ایسے پیدا ہوتے ہیں جو اُسکے

میں کمال پیدا کیا تھا۔ یہ لوگ اشیاء کے خواص سے واقف اور اُن کو بایکدگر ترکیب دے کے بڑے بڑے کام نکالنے میں ماہر تھے۔ حتیٰ کہ وہ اپنے مُردوں کی نعشوں پر ایسے مصالح لگاتے تھے جن سے وہ بیجان بدن مدت ہاے دراز تک سڑنے گلنے سے محفوظ رہتے تھے۔ ان لوگوں میں ریشم کے رنگنے۔ مختلف دوائیں تیار کرنے۔ صابون بنانے۔ انگوری شراب کھینچنے۔ سرکہ وغیرہ بنانے کا رواج تھا۔ مصریوں کے بعد چینیوں کا درجہ تھا۔ یہ لوگ بھی صنعت کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھے اور صباغی۔ بارود سازی۔ کاغذ سازی اور علی الخصوص چینی برتنوں کے بنانے کے فنون میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے۔ اہل مصر سے یہ فن رومیوں اور یونانیوں نے سیکھا۔ لیکن انھوں نے خود اسپر بہت کم اضافہ کیا بلکہ اُن کی ہمت زیادہ تر اُس شاخ پر مائل رہی جسے اب ہوسی سے تعبیر کرتے ہیں یعنی ادنےٰ درجے کے فلزات کی قلب ماہیت کر کے اُن سے سونا چاندی بنانا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے پیشتر یہ فن اہل عرب تک پہونچا اور اُن کے ہاتھوں اُس نے بہت کچھ ترقی پائی۔ سترھویں صدی کے آخر اور اٹھارہویں صدی کے آغاز میں یہ فن اہل یورپ کے ہاتھوں صحیح اصول پر قائم ہوا چونکہ اِس فن کے مہمات مسائل میں اجزاے مفردہ کی تنقیح مقدّم ہے۔ اس لیے اہل یورپ نے اشیاے عالم کی تجزی کر کے یہ طے کیا کہ کُل مفردات (یا عناصر) جن سے اشیاے عالم ترکیب پاتے ہیں اور جن کی مزید تحلیل وتجزی ہو نہیں سکتی۔ شمار میں چونسٹھ ہیں۔ یہ راے اگلی تحقیق کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ اقوام سابق چار یا پانچ عنصروں کی قائل تھیں یعنی آب وخاک وآتش وباد۔ اور اہلِ ہند کے نزدیک پانچواں عنصر اتھیر بھی تھا۔ اور اہل چین کے نزدیک آب وخاک وآتش ودھات اور لکڑی۔ لیکن جدید تحقیقات کے رُو سے یہ کُل اشیاء مرکّب ہیں۔ مثلاً پانی کی تجزی کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ وہ دو جزوں سے یعنی آکسیجن اور ہائڈروجن سے مرکّب ہے۔

کلہ فزیالوجی۔ اس فن میں علی العموم اُن آثار سے جو اشیاے ذی روح میں معمولاً پائی جاتی ہیں۔ اُن پر

بقائے حیات کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ اولاً اُس میں وہ حرارت حیوانی (یا غریزی) مہیا کرنا جس کے بغیر افعال حیات رُک جاتے ہیں اور ثانیاً اُس کے اعضائے بدن یعنی ترکیب جسمانی میں جو انحطاط ہوتا رہتا ہو اُس کا بدل کرتے رہنا (جسے اصطلاح حکماء میں بدل ما یتحلل سے تعبیر کرتے ہیں) ان میں سے ہر ایک مقصد کے واسطے ایک جداگانہ غذا ہوتی ہے۔ ہمارے جسم کی حرارت کا درجہ ایسے اشیاء سے قائم رہتا ہے جن میں نائٹروجن نہیں ہوتا اور غیر آزوتی کہلاتی ہیں اور ہماری ترکیب بدنی میں جس قدر انحطاط ہر لحظہ ہوا کرتا ہے اُس کا بدل اُن اشیاء سے ہوتا ہے جو ازوتی کہلاتی ہیں جن میں نائٹروجن ضرور ہوا کرتا ہے اول الذکر حالت میں غیر ازوتی غذا کا کاربن اُس آکسیجن سے مل جاتا ہے جسے ہم بذریعہ تنفس جذب کرتے ہیں اور اس سے وہ حرارت داخلی مشتعل ہوا کرتی ہے جس سے ہماری حرارت غریزی از سر نو پیدا ہوتی رہتی ہے۔ آخر الذکر حالت میں چونکہ نائٹروجن میں آکسیجن کے لیے کشش بہت کم ہوتی ہے اس لیے نائٹروجن والی یا ازوتی غذا مشتعل ہونے سے بچی اور (اس طور پر محفوظ رہ کر) اجزائے بدن کی بدل ما یتحلل میں معین ہوتی رہتی ہے۔ اور روزانہ زندگی میں تحلیل ہونے سے جو نقصان ترکیب بدنی کو پہونچتا ہے اُسکی تلافی کردیا کرتی ہے۔

غذا کی یہ دو بڑی تقسیمیں ہیں اور ان دونوں تقسیموں کو انسان سے جیسے تعلقات ہیں اُن تعلقات کا نظم جن قوانین کی رو سے ہوتا ہے اگر اُن کی تحقیقات ہم کریں تو ہمکو معلوم ہو جائے کہ ہر ایک تقسیم میں سب سے اہم کارکن اقلیمی حالت (یا آب و ہوا) ہے۔ جب

۴ اصول و قوانین سے جن کے وہ تابع ہوتی ہیں اور اُن اسباب سے جن پر وہ مبنی ہوتی ہیں بحث کی جاتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ یہ علم حیات کی ایک اہم شاخ ہے اور اسی وجہ سے بعض اہل فن نے اسے بیالوجی کی جگہ استعمال کیا ہے۔ اور یہ سمجھا ہے کہ دونوں فن بالکل ایک ہیں۔ لیکن درحقیقت فزیالوجی سے بیالوجی کچھ زیادہ ہے۔ کیونکہ فزیالوجی وہ شاخ بیالوجی کی ہے جو مختلف اعضا و جوارح کے اصلی اعمال و حرکات سے بحث کرتی ہے۔ ۱۲

انسان گرم ملک میں رہتے ہیں تو وہاں اُن کی حرارت غریزی سرد ملک کے برخلاف باسانی قائم و برقرار رہتی ہے - اور اس لیے وہاں اُن کو اُس غیرازوقی غذا کی بہت کم ضرورت ہوا کرتی ہے جس کا اصلی منشا یہ ہوتا ہے کہ جسم کی حرارت کو ایک معین درجے پر قائم رکھے۔ اسی طور سے وہ لوگ جو گرم ملک میں رہتے ہیں اُنھیں بہت کم ازوقی غذا کی حاجت ہوا کرتی ہے - کیونکہ بحالت مجموعی اُن کو جسمانی مشقتوں کا اتفاق بہت کم ہوا کرتا ہے اور اس لیے اُن کے بدنوں میں انحطاط زیادہ سرعت کے ساتھ نہیں ہوتا ہے -

اب چونکہ گرم ملک کے باشندے اپنی فطری اور معمولی حالت میں غذا کم کھاتے ہیں بہ نسبت سرد ملک کے باشندوں کے - لہذا - اِس سے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر اور حالات مساوی ہوں تو جو ملک گرم ہیں اُن میں سرد ملکوں کی بہ نسبت آبادی کا اضافہ بہ سرعت ہوگا - علمی اغراض کے واسطے یہ بات کچھ قابل لحاظ نہیں ہے کہ جس شے سے انسانوں کی بسراوقات ہوتی ہے اُسکی افراط و فراوانی اس سبب سے ہے کہ وہاں وہ شے مہیا زیادہ ہوتی ہے یا اس سبب سے کہ صرف کم ہوتی ہے - جب انسان کم کھاتے ہیں اُس وقت بھی وہی نتیجہ نکلتا ہے جو نتیجہ اُسوقت نکلتا ہے جب اُن کے پاس خورش کا سامان زیادہ ہوتا ہے - کیونکہ (دونوں صورتوں میں یہی ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ) ایک ہی مقدار غذا کی زیادہ دنوں تک چلتی ہے - پس اس طور سے آبادی میں بسرعت بڑھنے کی قوت سرد ملک کی بہ نسبت گرم ملک میں زیادہ ہوتی ہے کیونکہ سرد ملک میں اگر سامانِ رسد بافراط و فراوانی مہیا بھی ہو تو اقلیمی حالت کی وجہ سے وہ جلد صرف ہو جائے گا۔

یہ پہلی حیثیت ہے جس میں اقلیمی حالت کا تعلق بہ توسط غذا کی آبادی کے قوانین سے اور پھر اس کے سبب سے تقسیم دولت کے قوانین سے ہوتا ہے۔ لیکن ایک اور حیثیت بھی ہے کہ جو اسی قیاس کے قدم بقدم چلتی ہے۔ اور جو اسی مذکورۂ بالا دلیل کو اور قوت دیتی ہے

یعنی یہ کہ سرد ملکوں میں نہ صرف انسان اس پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ گرم ملک والوں کی بہ نسبت زیادہ کھائیں بلکہ اُن کی غذا گراں بھی ہوتی ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ اُس کی دستیابی زیادہ مشکل ہوتی ہے اور اُس کے واسطے زیادہ محنت و مشقت صرف کرنے کی حاجت پڑتی ہے اُس کی وجہ جس قدر مختصر طور سے ممکن ہوگا میں بیان کروں گا۔ اور بجز اُن امور کے جن کا تذکرہ اس دلچسپ بحث کے ٹھیک سمجھنے کے واسطے ضروری ہے اور کوئی جزئیات بیان نہ کروں گا۔

جیسا ہم دیکھ چکے ہیں غذا کے صرف دو مقصد ہوتے ہیں یعنی جسم کی حرارت کا قائم رکھنا بدل ما یتحلل کرتے رہنا۔ ان میں سے پہلا مقصد یوں حاصل ہوتا ہے کہ ہمارے پھیپڑوں میں ہوا کا اکسیجن داخل ہوتا ہے اور پھر ہمارے سارے بدن میں دورہ کرکے وہ اُس کاربن سے ترکیب پاتا ہے جو ہم غذا کے ذریعے سے بدن میں پہونچاتے ہیں۔ کیونکہ یہ کبھی ممکن نہیں کہ اکسیجن اور کاربن کی ترکیب صحیح بغیر ایک کافی مقدار حرارت پیدا کیے واقع ہوسکے اس لیے جب بدن انسانی میں آکسیجن اور کاربن ترکیب پاتے ہیں تو بدن انسان اپنے ضروری درجۂ حرارت پر قائم رہتا ہے۔ پھر بذریعۂ اُس قانون کے جس سے ماہرین علم کیمیا بہت اچھی طرح واقف ہیں دیگر اجزائے مفردہ (یا عناصر) کی طرح کاربن اور اکسیجن صرف ایک معین تناسب سے ترکیب پاتے ہیں۔ چنانچہ اعتدال (یا صحت) مزاج قائم رکھنے کے واسطے اس کی حاجت ہوتی ہے کہ جس غذا میں کاربن ہو وہ بمطابقت مقدار اُس آکسیجن کے بدلتی رہے جو ہمارے بدنوں میں داخل ہوتا ہے۔ پھر اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ جب کبھی خارجی سردی بدن کے درجۂ حرارت کو کم کیا کرے اُس وقت ہم ان دونوں اجزائے ترکیبی کو بڑھا لیا کریں۔ اب یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ ہر ایک سرد مقام میں یہ ضرورت (یعنی ایسی غذا مہیا کرنا جس میں بہت زیادہ کاربن شامل ہو) دو مختلف طریقوں سے بڑھ جائے گی۔ اولاً: چونکہ وہاں ہوا زیادہ ٹھنڈی

(یا کثیف) ہوگی اس وجہ سے انسان ہر مرتبہ سانس لینے میں اُس سے زیادہ مقدار آکسیجن جذب کریں گے جتنی وہ ایسے مقام پر کرتے جہاں کی ہوا بوجہ حرارت کے لطیف ہوتی رہتی ہے۔ ثانیاً۔ سردی اُن کے تنفس میں سہولیت پیدا کرکے اُنھیں اس پر مجبور کرے گی کہ ممالک حارہ کے باشندوں کی بہ نسبت زیادہ جلد جلد سانسیں لیں اور اس طور پر جو آکسیجن وہ اوسط کے حساب سے جذب کرتے ہیں اُس کی مقدار بڑھائے گی۔ انھیں دونوں وجوہ سے چونکہ آکسیجن کا انجذاب زیادہ ہوگا لہذا یہ ضروری ہوگا کہ کاربن کا صرف بھی زیادہ ہو۔ کیونکہ انھیں دونوں اجزائے ترکیبی کے ایک مقرر تناسب کے ساتھ ترکیب پانے ہی سے جسم کا درجۂ حرارت اور ترکیب بدنی کا موازنہ (یا اعتدال) قائم رہ سکتا ہے۔

علم کیمیا اور علم خواص اعضا کے اُن اصول کی رہبری سے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ جس قدر زیادہ کوئی ملک (جس میں انسان بستے ہیں) سرد ہوتا ہے اُسی قدر وہاں کے باشندوں کی غذا میں کاربن زیادہ شامل ہوتا ہے۔ اور اگرچہ یہ بالکل نرا کھرا ایک قیاس علمی ہے لیکن یہ واقعی تجربے پر مبنی ہے۔ ارض تسعین (قطبین کے نزدیک) کے رہنے والے بہت کثیر مقدار میں وہیل مچھلی کا تیل اور چربی کھاتے ہیں۔ حالانکہ منطقۂ حارہ (خطوط سرطان و جدی کے نیچے) کے رہنے والے اگر یہی غذا کھائیں تو اُن کا فی الفور خاتمہ ہو جائے۔ اور اس وجہ سے اُن کی (منطقۂ حارہ کے رہنے والوں کی) معمولی غذا کلیتاً میوے۔ چاول اور بقولات (یعنی ترترکاری اور ساگ پات) ہوتے ہیں۔ اب نہایت ہوشیاری سے کیمیائی تحلیل و تجزی کے ذریعے سے یہ محقق ہوگیا ہے کہ ارض تسعین کے باشندوں کی غذا میں کاربن زیادہ ہوتا ہے اور منطقۂ حارہ کے باشندوں کی غذا میں آکسیجن زیادہ۔ اور بغیر اس کے کہ ہم زیادہ جزئیات کی تفصیلوں میں پڑیں (کہ جو اکثر ناظرین کو نامطبوع ہونگی) عمومی حیثیت سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ دہنیات و روغنیات میں بقولات کے بہ نسبت کاربن چھ گونہ زیادہ ہوتا ہے اور آکسیجن بہت ہی کم ہوتا ہے۔ لیکن اسٹارچ (نشاستہ) جس کا رواج

بہت عالمگیر ہے اور جو بلحاظ تغذیہ کے عالم نباتات میں نہایت اہم جزء ہے۔ نصف اکسیجن ہوتا ہے۔

اس حالت اور اس مسئلے سے جو ہمارے پیش نظر ہے جیسا کچھ باہمی تعلق ہے وہ بیحد عجیب ہے کیونکہ یہ بہت حیرت انگیز امر ہے (اور ایسا امر ہے جس کی طرف میں بالتخصیص توجہ دلاؤں گا) کہ کسی زیادہ عام قانون کی وجہ سے (جس سے ہم ناواقف ہیں) جس غذا میں زیادہ کاربن ہوتا ہے وہ بہ نسبت اُس غذا کے جس میں کاربن کم ہوتا ہے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ دُنیا میں بقولات (جن میں اکسیجن نہایت قوی الفعل جزء ہے) کی بہت افراط ہے۔ وہ بغیر کسی خطرے کے بلکہ قریب قریب بلا کسی دقت اور زحمت کے دستیاب ہوتی ہیں۔ لیکن وہ غذا جس میں زیادہ تر کاربن ہوتا ہے اور جو ایک سرد ملک میں بقاءِ حیات کے واسطے بیحد ضروری ہوتی ہے وہ اس قدر آسانی سے اور خود بخود پیدا نہیں ہو سکتی اور بقولات کی طرح اُسے زمین اُگل نہیں دیتی۔ بلکہ اُس میں قوی و زبردست اور خوفناک جانوروں کی چربی اور تیل وغیرہ داخل ہوتے ہیں۔ اور اُن کی دستیابی کے واسطے آدمی کو بڑی جان جوکھم اُٹھانا اور نہایت محنت کرنا پڑتی ہے۔ اور اگرچہ یہ تقابل نہایت انتہائی حالات میں کیا گیا ہے لیکن پھر بھی یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جس قدر زیادہ کوئی انسانی جماعت کسی ایک انتہا سے قریب پہونچتی ہے اُسی قدر زیادہ وہ اُن شرائط کی تابع اور پابند ہوتی ہے جن کا وہ محکوم و متبع[1] ہوتا ہے اور بطور ایک قاعدہ کلیہ کے یہ واضح ہے کہ جس قدر کوئی ملک زیادہ برد ہوگا

[1] مصنف کا یہ مطلب ہے کہ جن سرد اور گرم ملکوں کا مقابلہ کیا گیا ہے وہ انتہا درجے کے سرد و گرم فرض کیے گئے ہیں اور اُن کے درمیان بہت سے درجے اور بھی نکلتے ہیں جن کے حالات بلحاظ وہاں کے درجات حرارت و برودت کے مختلف ہوتے ہیں لیکن بہرکیف۔ یہ قاعدہ کلیہ ہر جگہ ٹھیک اُترتا ہے کہ جس قدر زیادہ کوئی ملک سرد ہوتا ہے اُسی قدر زیادہ وہاں کے باشندوں کی غذا میں کاربن شامل ہوتا ہے اور جس قدر زیادہ کوئی ملک گرم ہوتا ہے اُسی قدر زیادہ وہاں کے باشندوں کی غذا میں اکسیجن ہوتا ہے

اُسی قدر وہاں کے باشندوں کی غذا میں کاربن زیادہ ہوگا اور جس قدر وہ ملک زیادہ گرم ہوگا اُسی قدر وہاں کے باشندوں کی غذا میں آکسیجن زیادہ ہوگا۔ پھر چونکہ کاربن والی غذا عالم حیوانات سے حاصل ہوتی ہے اس لیے اُس کا ملنا بہ نسبت آکسیجن والی غذا کے زیادہ دقت طلب ہوتا ہے کیونکہ وہ عالم نباتات سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ جن قوموں کے یہاں اقلیم کی برودت نے زیادہ کاربن والی غذا کو لازمی کر دیا ہے وہ قومیں اپنے عالمِ طفولیت ہی میں زیادہ دلیرانہ اور بہادرانہ خصلت کے جوہر دکھا یا کی ہیں بہ نسبت اُن قوموں کے جن کی معمولی قوت لایموت (چونکہ زیادہ آکسیجن والی ہوتی ہے اس لیے) آسانی سے اور حقیقت میں محض فطرت کی فیاضی سے مفت اور بلا کسی دقت یا خرخشہ کے حاصل ہوتی جاتی ہے۔ اِس ابتدائی اختلاف سے ایسے نتائج ظاہر ہوتے ہیں جن کی سراغ رسانی سے مجھے فی الحال کچھ سروکار نہیں ہے کیونکہ اس وقت میرا مقصد اسی قدر ہے کہ یہ دریافت کیا جائے کہ یہ غذا کا اختلاف کس طرح اُس تناسب پر موثر ہوا کرتا ہے جس سے دولت مختلف طبقات میں تقسیم ہوتی ہے۔

ﷺ اس کلیہ کے ثبوت میں ایک طرف ارض تسعین اور دوسری طرف منطقۂ حارہ کے باشندوں کی غذا کا تذکرہ مصنف نے کیا ہے کہ جن میں ایک انتہا درجے کے سرد اور دوسرے انتہا درجے کے گرم ملک میں رہتے ہیں پھر بطور نتیجے کے یہ دکھلایا ہے کہ ایک کی غذا میں درندوں کے لحم و شحم زیادہ ہوتے ہیں اور دوسرے کی غذا میں بقولات و میوہ جات۔ ان دونوں سروں کے درمیان ایک طرف تو منطقۂ حارہ کے قریب ملکوں میں گرمی زیادہ اور دوسری طرف ارض تسعین کے قریب کے ملکوں میں سردی زیادہ ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ منطقۂ معتدلہ تک پہونچتے پہونچتے نہ سردی زیادہ رہتی ہے نہ گرمی بلکہ ایک حالت اعتدال پیدا ہو جاتی ہے۔ پس۔ ان مقامات کے باشندوں کی غذا ابنا سبت ملک کی حرارت یا برودت کے ہوتی ہے اگر حرارت زیادہ ہوتی ہے تو آکسیجن آمیز غذا زیادہ مستعمل ہوتی ہے اور اگر برودت زیادہ ہوتی ہے تو کاربن آمیز اس طور سے یہ قاعدہ کلیہ ہر ملک پر چسپاں ہوتا ہے اور ہر جگہ ایک ہی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ فقط

جس طور سے تقسیم دولت کا یہ تناسب بدلتا رہتا ہے وہ (مجھے امید ہو کہ) مذکورۂ بالا دلائل سے واضح ہوگیا ہوگا۔ لیکن اگر اُن واقعات کا اعادہ کیا جائے گا جن پر یہ دلائل مبنی ہیں تو غالباً یہ اعادہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ وہ واقعات یہ ہیں۔ مزدوری کی شرح آبادی کے حساب سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ یعنی جب مزدوری کے بازار میں مزدوروں کی افراط ہوتی ہے اُس وقت مزدوری گھٹ جاتی ہے اور جب اُس میں تفریط ہوتی ہے تو یہ بڑھ جاتی ہے۔ اگرچہ آبادی خود متعدد اسباب خارجی سے متاثر ہوا کرتی ہے لیکن پھر بھی وہ فراہمی غذا کے اعتبار سے گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ یعنی جب غذا بہ افراط ہوتی ہے اُس وقت وہ بھی بڑھتی ہے اور جب غذا کمیاب ہوتی ہے اُس وقت یا تو وہ ایک حالت پر رُکی تھمی یا گھٹی ہوئی رہتی ہے۔ پھر بہ نسبت گرم ملکوں کے سرد ملکوں میں وہ غذا جو مدارحیات ہوتی ہو بدقت دستیاب ہوتی ہے۔ اور نہ صرف بدقت ملتی ہو بلکہ اُس کی حاجت بھی زیادہ مقدار میں ہوا کرتی ہے۔ حتیٰ کہ انھیں دونوں وجوہ سے اُس آبادی کے بڑھنے میں بہت کم مدد ملتی ہے جس سے مزدوری کے بازار میں افراط و فراوانی ہوا کرتی ہے۔ اب اگر ہم اس تقریر کے نتیجے کو نہایت ہی سادہ طور سے بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ گرم ملکوں میں تو نہایت قوی اور مستقل رجحان اس جانب ہوتا ہے کہ مزدوری کم ہو لیکن سرد ملکوں میں اس کے برعکس یہ رجحان ہوتا ہے کہ مزدوری زیادہ ہو۔

اب اگر ہم اس اصول اعظم کو عام سلسلۂ تاریخ پر منطبق کریں گے تو ہم کو معلوم ہوگا کہ ہر ایک طرف اُس کی صحت و صداقت کی شہادتیں مہیا ہیں۔ حقیقت میں کوئی ایک مثال بھی اس کے برخلاف نظر نہیں آتی۔ ایشیا میں۔ افریقہ میں۔ اور نیز امریکہ میں کُل قدیم تمدن گرم اقلیم میں قائم ہوئے۔ اور ان سب مقامات میں مزدوری کی شرحیں نہایت کم تھیں اور اسی بنیاد پر یہ مزدوری پیشہ لوگ نہایت ادنیٰ درجے کی حالت میں

رہے تھے - جب یورپ میں تمدن پھیلا تو گویا اول اول ایک سرد اقلیم میں تمدن کا دوردورہ ہوا - اسی بنیاد پر وہاں مشقت کا صلہ (یعنی مزدوری کا نرخ) بڑھ گیا اور دولت کی تقسیم اُس سے زیادہ مساوات کے طور پر ہوئی جتنی کہ اُن ملکوں میں ممکن بھی تھی جہاں غذا کی افراط نے آبادی کو بڑھا رکھا تھا - اس اختلاف وچگونگی نے (جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے) بہت سے نہایت ہی اہم پولٹیکل اور سوشل نتائج پیدا کیے - لیکن قبل اسکے کہ ہم اُن سے بحث کریں یہ کہے دیتے ہیں کہ جو کچھ ابھی بیان ہو چکا ہے اُسمیں جو ایک بظاہر مستثنیٰ ہے وہ بھی عجیب طریقے سے قانون کلّی کی تصدیق کر رہا ہے - ایک اور صرف ایک ہی مثال ایسی ہے جس میں ایک بڑی یورپین قوم کے ہاتھ میں نہایت ارزاں قومی غذا تھی - اس قوم کی بابت مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ وہ باشندہ آئرلینڈ تھے - دو سو برس سے زیادہ ہوئے کہ آئرلینڈ میں مزدوری پیشہ لوگ خاص کر کے آلو کھا کے بسر کرتے رہے ہیں - یہ آلو اُن کے ملک میں اول اول سولھویں صدی کے اواخر یا سترھویں صدی کے اوایل میں آیا تھا - اب آلو کے مخصوصات میں یہ بات ہے کہ گزشتہ وباء عام[19] سے پیشتر وہ اُن سب غذاؤں کی بہ نسبت جو اُس کے برابر صحت بخش ہیں زیادہ ارزاں تھا : اور غالباً اب تک ارزاں ہے - اگر ہم اُسکی پیداوار کی قوّت[20] کو اُسکی مقدار تغذیہ سے مقابلہ کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر معمولی زمین کے ایک ایکڑ میں آلو بوئے جائیں تو اُس سے اتنے آدمیوں کی پرورش

[19] یہ اشارہ اُس وبائے طاعون کی طرف ہے جس نے ۶۶-۱۶۶۵ء میں قریب قریب نصف لندن کو تباہ و برباد کر دیا تھا - اس وبائے عام کے دردناک واقعات پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں اور مدت تک اس کے افسانہ ہائے غم لوگوں کو رُلاتے رہتے ہیں - ۱۲

[20] آلو میں یہ قوت ہے اگر ایک بویا جائے تو اس سے کئی پیدا ہوں اور اسی کے ساتھ اُس میں یہ صفت ہے کہ تھوڑے کھا لینے سے پیٹ بھر جاتا ہے تو دو صورت سے آلو کو گیہوں پر فضیلت حاصل ہے یعنی ایک تو پیدا زیادہ ہوتا ہے اور دوسرے تھوڑے میں خورش کا کام نکل جاتا ہے ۱۲

ہوسکتی ہے جو اُس سے دو چند ہوں گے جتنے اشخاص کی پرورش اُسی زمین پر اگر گیہوں بوئے جاتے تو ہوتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ جس ملک میں انسانوں کی بسراوقات آلوؤں پر ہوتی ہے وہاں (اگر اور حالات مساوی ہوں تو) بہ نسبت اُس ملک کے جہاں انسانوں کی بسراوقات گیہوں سے ہوتی ہے آبادی دوچند سرعت سے بڑھ جائیگی اور یہی بات ہے جو حقیقت میں واقع ہوئی ہے۔ ابھی چند سال گزرے جب صورت معاملات وباء عام اور ترک وطن کے سبب بالکل تبدیل ہوگئی تھی ورنہ اس سے پیشتر آئرلینڈ کی آبادی سالانہ تین فی صدی کے حساب سے بڑھ رہی تھی اور انگلستان کی آبادی اُسی زمانہ میں ڈیڑھ فی صدی کے حساب سے اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ دولت کی تقسیم ان دونوں ملکوں میں بالکل ہی جداگانہ طور پر تھی۔ خود انگلستان میں بھی آبادی کی ترقی کسی قدر زیادہ تیزی سے ہوتی ہے اور چونکہ مزدوری کی بازار میں مزدوروں کی ریل پیل ہوتی ہے لہذا مزدوری پیشہ لوگ خاطرخواہ طور سے اپنی مشقت کا صلہ نہیں پاتے۔ لیکن جس حالت میں ابھی چند سال ہوئے آئرلینڈ والے مجبوراً بسر کر رہے تھے اُس کے مقابلہ میں انگلستان والے شاہانہ شان وشکوہ سے رہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ لوگ جس مصیبت میں مبتلا ہو رہے تھے وہ ہمیشہ اُن کے حکمرانوں کی جہالت اور نیز اُس فضیحت آمیز بدعملی کے باعث جو (ابھی تھوڑا زمانہ ہوا جب تک) انگلستان کے دامن عظمت پر نہایت سیاہ داغ تھے مضاعف ہوتی رہی تھی۔ بہرنوع۔ نہایت موثر سبب یہ تھا کہ اُن کے یہاں مزدوری کی شرح اس قدر گھٹی ہوئی تھی کہ جس کے سبب سے وہ لوگ نہ صرف آسایش سے محروم تھے بلکہ اُنھیں متمدن زندگی کے معمولی لوازمات بھی میسر نہ تھے۔ اور یہ سقیم حالت نتیجہ تھی غذا کے ارزاں ہونے اور بفراوانی ملنے کا۔ کیونکہ اسی وجہ سے انسانوں کی تعداد اس قدر سرعت کے ساتھ بڑھتی رہی کہ مزدوری کے بازار ہمیشہ پٹے پڑے تھے۔ یہ سلسلہ اس حد تک بڑھا کہ ایک ہوشیار نظرباز جس نے بیس برس ہوئے

آئرلینڈ کا سفر کیا تھا اُس نے یہ بیان کیا کہ اُس وقت مزدوری کی شرح چار پنس روزانہ تھی اور یہ کہ اُنھیں سلسل بیکاری میں اِس حقیر کفاف کے ملتے رہنے کی بھی توقع نہ تھی۔

ارزاں غذا کے یہ نتائج اُس ملک میں پیدا ہوا کیے ہیں جہاں یورپ کے دیگر ممالک سے زیادہ قدرتی وسائل موجود ہیں اور اگر ہم کسی وسیع پیمانہ پر قوموں کی معاشرتی اور تمدنی حالت کی تحقیق کریں گے تو ہم اسی اصول کو ہر جگہ عمل پیرا پائیں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ اگر اور سب حالات مساوی ہوں تو ایک قوم کی غذا اُس کی تعداد کے گھٹنے بڑھنے کا تصفیہ کرتی ہے اور اسکی تعداد میں اضافہ اُسکی مزدوری کی شرح کا تصفیہ کرتی ہے۔ پھر مزید براں ہم کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ جب مزدوری کی شرح سلسلے کے ساتھ گھٹی ہوئی ہوتی ہے اُس وقت چونکہ دولت کی تقسیم میں مساوات بالکل قائم نہیں رہتی۔ لہذا۔ پولیٹکل قوت اور سوشیل اثرات غیر مساوی ہوں گے۔ اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ ابتدائی حالت میں کسی قوم کے طبقۂ اعلیٰ اور طبقۂ ادنیٰ کا معمولی اور اوسط تعلق ان خصوصیات فطری پر موقوف و منحصر ہوتا ہے جن کے طریق عمل کے ظاہر کرنے کی میں نے کوشش کی ہے۔ اَب جو ہم ان سب باتوں کو یکجا کریں گے تو مجھے یقین ہے کہ (ایسی وضاحت سے جس کا کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا) ہم یہ دریافت کرسکیں گے کہ عالم طبیعی اور عالم اخلاقی میں کیسا قریبی تعلق ہے۔ وہ کون قانون ہیں جن کا یہ تعلق تابع اور محکوم ہوتا ہے اور وہ کیا وجوہ تھے جنسے اتنے قدیم تمدنوں نے ایک خاص حد تک نشو و نما پائی اور پھر اس طرح زوال پذیر ہوگئے جس سے وہ نہ تو فطرت کے دباؤ کو ٹال سکے نہ اُن خارجی مزاحمتوں سے سر بر ہو سکے جن کے سبب سے اُنکی ترقی کی رفتار قاطبۃً رُکی ہوئی تھی۔

اگر سب سے پہلے ہم ایشیا کی طرف رُخ کریں گے تو دیکھیں گے کہ وہ جسے آثار خارجی اور آثار دخلی کے تصادم [۱۲۱]

۱۲۱ یعنی انسانی طبیعت پر گرد و پیش کے سامان اور آثار فطری کے اثر یا گرد و پیش کے سامانوں اور آثار فطری پر انسانی طبیعت کے اثر کی تشریح ایسے ہی مقامات کے مطالعہ سے ہو سکتی ہے جہاں یہ دونوں عمدہ حیثیت سے کر رہے ہوں۔

سے تعبیر کرتے ہیں اُسکی ایک عمدہ مثال وہاں پیش نظر ہوتی ہے۔ ایشیائی تمدن (ان اسباب سے جو بیان ہو چکے ہیں) ہمیشہ سے اس زرخیز قطعہ میں محدود رہا ہے جس میں دولت آسانی سے مہیا ہو سکتی ہے۔ اسی وسیع منطقہ میں دُنیا کے بعض نہایت ہی سرسبز قطعات شامل ہیں اور اُسکے تمامی ممالک میں ہندوستان ہی وہ ملک ہے جس میں قدیم ترین زمانہ سے سب سے بڑھا چڑھا تمدن رہا ہے۔ اور چونکہ ہندوستان کے بارے میں کسی رائے کے قائم کرنے کے لیے ایشیا کے کسی دوسرے حصہ کے بہ نسبت سامان اور مواد بکثرت موجود ہے۔ لہذا۔ میں یہ قصد کرتا ہوں کہ اسے بطور نمونہ کے منتخب کرلوں۔ اور اُسی کے ذریعے سے اُن قوانین کی توضیح کروں جو اگرچہ علم سیاست مدن۔ علم کیمیا اور علم خواص اعضا سے استقراءً ماخوذ ہیں۔ لیکن اُن کی تصدیق ایسی وسعت نظری کے ساتھ ہو سکتی ہے جس کے واسطے صرف فن تاریخ سامان بہم پہونچا سکتا ہے۔

ہندوستان میں اقلیمی حرارت کی شدت وسختی سے وہ قانون اپنا عمل کر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے معمولی غذا بجائے اسکے کہ کاربن آمیز ہو آکسیجن آمیز ہوتی ہے۔ یہ ایک دوسرے قانون کی وجہ سے لوگوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی خورش عالم حیوانات سے نہ لیں بلکہ عالم نباتات سے لیں جس میں نشاستہ سب سے اہم جزو ترکیبی ہوتا ہے۔ پھر درجات حرارت کے بڑھے ہوئے ہونے سے لوگ ایسی محنت کرنے سے قاصر رہتے ہیں جس میں سخت جفاکشی اور عرقریزی کرنا پڑتی ہے اور اس سبب سے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی غذا کھائیں جس کا بدل بفراوانی ملتا ہو اور جس میں یہ بات پائی جاتی ہو کہ تھوڑی مقدار میں تغذیہ (اخلاط) کی قوت زیادہ ہو۔ اب اگر یہ مندرجہ بالا خیالات صحیح ہوں تو چاہیے کہ اقوام ہند کی معمولی غذا میں کچھ خصوصیات پائے جائیں۔ چنانچہ وہ خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ یعنی بہت ابتدائی زمانے سے ہندوستان میں عام طور سے جو غذا رائج ہے وہ چاول ہے کہ جس میں اور غلوں کے بہ نسبت تغذیہ کی قوت زیادہ ہے۔ اس میں نشاستہ کا جزو

بہت غالب ہوتا ہے اور اُس کے بونے میں مشقت کرنے والے کو بحساب اوسط اس قدر معاوضہ ملتا ہے جو کم از کم ساٹھ؎ گونہ ہوتا ہے۔

اس طور پر یہ ممکن ہے کہ چند قوانین طبیعی کی تطبیق سے اس بارے میں پیشین گوئی کی جا سکے کہ کسی ملک کی قومی غذا (یعنی وہ غذا جسے عام طور سے اُس ملک کے عام باشندے کھاتے ہوں) کیا ہوگی۔ پھر۔ اس کے بعد جو لازمی نتائج ہیں اُن کی بابت بھی پیشین گوئی ہو سکے گی۔ اس حالت میں جو بات ایسی ہے کہ کچھ کم قابل تذکرہ نہیں ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ اُس جزیرہ نما (یعنی ہندوستان) کے جنوبی حصہ میں چاول کا چلن اس قدر نہیں ہے جیسا کبھی پیشتر تھا لیکن اُسکے عوض کوئی حیوانی غذا رائج نہیں ہے بلکہ ایک اور غلہ جسے راگی کہتے ہیں چاول کا قائم مقام ہوگیا ہے۔ بہر نوع۔ اصلی چاول اُن حالات کے لحاظ سے جو میں نے بیان کیے ہیں اس قدر وہاں کے واسطے موزوں ہے کہ ایشیا کے گرم ترین ملکوں میں قریب قریب سب کہیں عام طور سے وہی کھایا جاتا ہے اور وہیں سے اوقاتِ مختلف میں وہ دنیا کے دیگر حصص میں منتقل ہوتا رہا ہے۔

اقلیم اور غذا کے اِن مخصوصات کے نتیجے کے طور پر ہندوستان میں دولت کی تقسیم اُسی طرح غیر مساوی ہوئی ہے جس طرح ہم کو ایسے ملکوں میں ہونے کی توقع ہونا چاہیے تھی جہاں مزدوری کا بازار ہمیشہ پٹا پڑا رہتا ہے۔ اگر ہندوستان کے قدیم ترین زمانے کے وقائع (یعنی دو اور تین ہزار برس کے پُرانے وقائع) پر ہم نظر ڈالتے ہیں کہ جو اب تک محفوظ رکھے گئے ہیں۔ تو ہم کو اسکی شہادت ملتی ہے کہ اُس وقت بھی یہی سب حالات، درپیش تھے جو اب پیش پا افتادہ ہیں اور ہم اس پر اعتماد کر سکتے ہیں کہ یہی حالات و معاملات ٹھیک اُس وقت تھے جب ابتدائے سرمایہ کی فراہمی واضح طور سے شروع ہوئی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ اُس وقت بھی طبقۂ اعلیٰ والے بیحد دولتمند تھے اور طبقۂ ادنیٰ والے نہایت مفلس و محتاج۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جن کی مشقت سے دولت پیدا ہوتی تھی وہ خود دولت کا سب سے کم حصہ پاتے تھے

؎ یعنی اگر چاول کا ایک دانہ بویا جائے تو کم از کم اس سے ساٹھ دانے پیدا ہوتے ہیں ۱۲

اور سب سے بڑا حصہ طبقۂ اعلیٰ والے یا تو لگان یا منافع کے نام سے ہضم کر جاتے تھے۔ اور چونکہ عقل و دانش کے بعد دولت ایک مستقل ذریعہ قوت ہے اس لیے قدرتی طور سے یہی واقع ہوتا رہا کہ دولت کی تقسیم میں جس درجہ زیادہ عدم مساوات رہی اُسی قدر زیادہ عدم مساوات پولیٹیکل اور سوشل قوت میں بھی رہی۔ پس یہ کچھ بھی حیرت انگیز نہیں ہے کہ بہت قدیم زمانے سے (یعنے جب سے کہ ہندوستان کی بابت ہماری واقفیت شروع ہوتی ہے) باشندگان ملک کا ایک بڑا گروہ جو حد درجہ غربت و فلاکت سے زچ اور انتہا سے زیادہ بے سروسامان تھا (بیخبری کے عالم میں) ذلت و خواری میں پڑا اور متواتر مصائب سے شکستہ حال رہتا چلا آیا ہے اور اُس کی زندگی کا ماحصل صرف اسی قدر رہا ہے کہ کمینہ اطاعت کے اظہار میں اپنے سے اونچے لوگوں کے سامنے سر نہوڑاتا رہے اور وہ صرف اسی قدر کام دے سکتا تھا کہ یا تو خود غلام بنجائے یا معرکۂ کارزار میں جا کے اس لیے اپنی گردنیں کٹوائے کہ اور لوگ غلام بنیں۔

ہندوستان میں کسی مدت مدید کی بابت مزدوری کی اوسط شرح کا صحیح طور سے معلوم کرنا ناممکن ہے کیونکہ اگرچہ ہم مقدار کو رقم میں بیان کر سکتے ہیں۔ لیکن روپیہ کی قیمت (یعنی اُسکی قوت خریداری) میں بیحد و حساب کمی بیشی رہتی آئی ہے جس کی علت مصارف پیداوار کے تغیرات ہوا کرتے ہیں۔ مگر ہمارے پیش نظر مقصد کے واسطے تحقیقات کا ایک طریقہ ایسا ہے جس سے ایسے صحیح اور ٹھیک نتائج ظہور پذیر ہو سکتے ہیں کہ وہ صحت میں اُن سب بیانات پر فائق ہوں جو مزدوری کی شرحوں کی مجموعی شہادتوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور وہ طریقہ صرف یہ ہے کہ چونکہ کسی ملک کی دولت کی تقسیم مزدوری۔ لگان۔ منافع اور سود میں ہوتی ہے اور چونکہ سود بدرجۂ اوسط کا ایک صحیح پیمانہ ہوتا ہے۔ لہذا یہ لازم آتا ہے کہ اگر کسی گروہ میں لگان اور سود دونوں بڑھے ہوں گے تو اُن کے یہاں مزدوری ضرور گھٹی ہوئی ہوگی۔ پس۔ اب اگر ہم رائج الوقت سود کا روپیہ تحقیق

کر سکتے ہیں اور یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ لگان میں پیداوار اراضی کا کس قدر حصہ کھپ جاتا ہے تو ہم مزدوری کی بابت بالکل ہی صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ مزدوری اُسی قدر ہوتی ہے جو باقی رہتا ہے[۵۲۲]۔ یعنی وہ وہی رقم ہوتی ہے جو محنت کرنے والے کے پاس لگان۔ منافع اور سود ادا کرنے کے بعد بچتی ہے۔

اب یہ بات حیرت میں ڈالنے والی ہے کہ ہندوستان میں لگان اور سود کا نرخ ہمیشہ بہت بڑھا ہوا رہا ہے۔ منو کے قوانین میں (جو قریب ۹۰۰ء قبل ولادت مسیح میں مرتب کیے گئے تھے) روپیہ پر کم سے کم قانونی سود پندرہ فی صدی مقرر کیا گیا تھا اور زیادہ سے زیادہ ساٹھ فی صدی۔ اور اسے ایسا کہنہ اور از کار رفتہ قانون نہیں سمجھنا چاہیے جو اب متروک ہو گیا ہو بلکہ بجائے متروک ہونے کے مَنُو کے قوانین اب تک ہندوستانی اصول قوانین کے موقوف علیہ ہیں اور ہمکو نہایت عمدہ سند سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ ۱۸۱۰ء میں روپیہ سے کام نکالنے کے بابت جو سود دیا جاتا تھا اُسکی تعداد ۳۶۔ اور ۶۰ فی صدی کے اندر اَدَلتی بدلتی رہتی تھی۔

ہمارے پیش نظر جو اجزا ہیں اُن میں سے اس ایک کے حساب کی بابت بس اسی قدر کافی ہے۔ اب رہا دوسرا جزو یعنی لگان۔ اُسکی بابت بھی ہمارے پاس ایسی ہی

۵۲۲ جب دولت کا اصلی ذریعہ انسان کی محنت قرار پا گیا۔ اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ جو دولت پیدا ہوتی ہے وہ تین گروہوں میں تقسیم ہوتی ہے یعنے کارکن گروہ۔ کارفرما گروہ۔ اور سرمایہ دار گروہ میں۔ کارکن گروہ کو جو حصہ ملتا ہے وہ اس کی مزدوری کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ کارفرما گروہ کا حصہ منافع یا لگان کہلاتا ہے اور سرمایہ دار گروہ کے حصے کو سود کہتے ہیں تو اب یہ ظاہر ہے کہ یہ سب سے پہلے مقدار دولت میں سے لگان اور سود نکال لیا جاتا ہے اور اس کے بعد جس قدر بچتا ہے وہ کارکن گروہ کے پلے پڑتا ہے۔ یعنے جس قدر دولت پیدا ہوتی اُس میں کارفرما اور سرمایہ داروں کی دستبرد سے جو رقم بچتی ہے وہی مزدوروں پر تقسیم ہوتی ہے ۱۲

جنچی ہوئی اور قابل اعتبار معلومات کا ذخیرہ موجود ہے۔ انگلستان اور اسکاٹ لینڈ میں
جو لگان بابت تردد اراضی کاشتکار ادا کرتا ہے اُس کا تخمینہ اجمالی (یا بالمقطع یعنے)
ایک کھیت کو دوسرے کے ساتھ لیکے) حاصل پیداوار کا ایک ربع ہے۔ فرانس میں
اوسط تناسب ایک ثلث ہے درآنحالیکہ ممالک متحدہ امریکہ اور شمالی امریکہ میں یہ بہت
مشہور و معروف بات ہے کہ) اور بھی کم ہے۔ اور حقیقت میں وہاں بعض حصص میں تو بالکل
برائے نام ہے۔ لیکن ہندوستان میں قانونی لگان یعنی وہ کم سے کم شرح لگان جسے
قانون نے تسلیم کیا ہے پیداوار کی نصف ہے اور اگرچہ یہ ظالمانہ آئین ہے لیکن غضب
یہ ہے کہ سختی کے ساتھ اس پر عمل نہیں کیا جاتا کیونکہ اکثر حالتوں میں لگان اتنا بڑھا
دیا ہے کہ نہ صرف یہی ہوتا ہے کہ کاشتکار کو پیداوار کے نصف سے کم ملتا ہو بلکہ اسقدر
اُس کے ہاتھ لگتا ہے کہ آیندہ فصل کے بونے کے واسطے اُس کے پاس بیارہ (تخم ریزی
کا سامان) بھی نہیں رہتا اور وہ ہمیشہ محتاج ہی رہتا ہے۔

ان واقعات سے جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ بالکل بدیہی ہے۔ چونکہ لگان اور سود
ہمیشہ بہت بڑھا ہوتا ہے اور چونکہ سود (جیسا ہونا چاہیے) منافع کی شرح کے بموجب
گھٹتا بڑھتا ہے اس لیے یہ ظاہر ہے کہ مزدوری کو بہت ہی گھٹا ہونا چاہیے۔ کیونکہ جب
ہندوستان میں ایک مقدار معین دولت کی تھی جو لگان۔ سود۔ منافع اور مزدوری
پر تقسیم ہونے والی تھی تو یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اول الذکر تین اجزا کا بڑھنا جبھی ہو سکتا ہے
جبکہ چوتھا گھٹے۔ بہ الفاظ دیگر اس کے یہ معنی ہیں کہ مزدوری پیشہ لوگوں کو جو معاوضہ ملتا تھا
وہ بمقابلۂ طبقۂ اعلیٰ والوں کے معاوضہ کے نہایت ہی کم تھا۔ اگرچہ یہ لازمی نتیجہ قیاسی ہے
لیکن اس کے واسطے کسی مزید تائید کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ
زمانۂ حال میں (جس کی بابت ہمارے پاس براہ راست شہادت موجود ہے)
ہندوستان میں مزدوری کی شرح نہایت ہی گھٹی ہوئی رہی ہے اور باشندے

سدا سے اس پر مجبور رہے اور اب تک مجبور ہیں کہ اتنی قلیل رقم کے واسطے محنت کریں جو مشکل سے اُنکی ضروریات زندگی کے واسطے کافی ہوسکے۔

ہندوستان میں قومی غذا کی افراط اور ارزانی کا یہ اولین نتیجۂ اعظم ہے جو ظاہر ہوا ہے۔ لیکن یہ خرابی اسی جگہ ختم نہیں ہوگئی ہو۔ ہندوستان میں (اُسی طرح جیسے کسی اور ملک میں) غریبی اور مفلسی موجب ذلت وحقارت اور دولتمندی باعثِ اقتدار و قوت ہوتی ہو۔ جب اور باتیں برابر ہوں تو اشخاص واحد کی طرح انسانی جماعتوں کی بھی یہی حالت ہوتی ہو کہ وہ جس قدر زیادہ دولتمند ہوتی ہیں اُسی قدر اُن کا اثر اقتدار زیادہ بڑھتا ہو۔ پس اسکی توقع ہی تھی کہ دولت کی غیر مساوی تقسیم قوت واقتدار کی غیر مساوی تقسیم کا سبب ہوگی اور چونکہ تاریخ میں اسکی کوئی مثال قلمبند نہیں ہوئی ہو کہ کسی جماعت نے اقتدار و قوت میں حصہ پایا ہو اور اسے بیجا طور سے استعمال نہ کیا ہو تو ہم یہ بات بآسانی سمجھ سکتے ہیں کہ اسکی کیا علت تھی کہ ہندوستان والے (جن کے لیے اُنکے ملک کی اقلیمی حالت کے طبیعی قوانین کے سبب سے افلاس مقدر ہوچکا تھا) ایسے نکبت وادبار میں گرفتار ہوے جس سے وہ کبھی نکل ہی نہ سکے۔ مندرجہ بالا بیانات سے جو اصول اس قدر منقح ہوگیا ہو کہ اب اُس میں کوئی شخص چون وچرا کرہی نہیں سکتا اُسکے (ثبوت کے لیے نہیں بلکہ صرف) وضاحت کے واسطے چند مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ہندوستان میں عوام الناس کو شودر کا لقب دیا گیا ہو اور اُن کی بابت ملکی قوانین میں چند تفصیلی وجزئی اور نہایت عجیب قاعدے معین کیے گئے ہیں۔ اگر اس نکبت زدہ گروہ کا کوئی شخص یہ دعوے کرے کہ اُسی جگہ پر بیٹھے جہاں اُس سے اُونچے درجے والے بیٹھتے ہیں تو وہ یا جلا وطن کردیا جائے یا کوئی دردناک اور ذلیل سزا بھگتے۔ اگر وہ اپنے سے اونچے درجے والوں کا بے ادبی سے ذکر مذکور کرے تو اُس کا مُنھ جلا دیا جائے اگر وہ درحقیقت اُن سے کچھ گستاخانہ پیش آئے تو اُسکی زبان کاٹ ڈالی جائے۔ اگر وہ

کسی برہمن کو کچھ ستائے تو اُس کی گردن ماری جائے۔ اگر وہ اُسی مسند پر بیٹھ جائے جسپر کوئی برہمن بیٹھا تھا تو وہ عمر بھر کے واسطے لُنجا کر دیا جائے۔ اگر محض معلومات حاصل کرنے کے شوق میں کسی مقدس کتاب کو پڑھتے ہوئے سُن بھی لے تو اُسکے کانوں میں کھولتا ہوا تیل ڈال دیا جائے۔ اور اگر کہیں وہ اُسے یاد کر لے تو بس جان ہی سے مار ڈالا جائے۔ اگر وہ کسی جرم کا ارتکاب کرے تو اُسکی سزا اُس سے کہیں زیادہ دی جائے جو اُس سے اُونچے درجے والوں کے واسطے مقرر ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اُس کو مار ڈالے تو قاتل کے لیے اس قتل کی سزا اُسی قدر مقرر ہو جس قدر ایک کُتے یا بلی یا کوّے کے مارنے کی ہو۔ اگر وہ اپنی بیٹی کو کسی برہمن کے ساتھ بیاہ دے تو (اُسکے ایسی چھوت لگ جاتی ہو کہ) اس جُرم کے لیے کوئی ایسا کفارہ جو دُنیا میں دیا جا سکتا ہو کافی نہیں ہو سکتا اور اس لیے یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ وہ برہمن اس خطا پر جہنم میں جائیگا کہ اس نے ایسی عورت کو چھو لیا جو اُس سے بدرجہا کم ذات تھی۔ حقیقت میں یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ مزدور کا محض نام بھی حقارت و ذلّت کا مظہر ہو گا اور اُس سے فوراً اُسکی حیثیت و منزلت ٹھیک طور سے سمجھ میں آ جائے گی اور محض اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سب باتیں اُس گروہ کی ماتحتی کے برقرار رکھنے کے واسطے کافی نہ ہوں فی الواقع ایک قانون بنا دیا گیا تھا کہ جس کی رو سے وہ لوگ دولت جمع کرنے سے ممنوع کر دیے گئے تھے۔ اور اس لیے یہ شرط بھی لگا دی گئی تھی کہ اگرچہ کسی غلام کو اُس کا آقا آزاد بھی کر دے لیکن اُس کی گردن سے غلامی کا طوق نہ نکلے گا اور وہ غلام ہی بنا رہے گا کیونکہ مقنن کا بیان ہو کہ "جو حالت اُسکی فطری ہے اُس سے کون شخص اُسکو نکال سکتا ہے"۔

سچ ہے۔ اُسے کون نکال سکتا ہو؟ میں نہیں سمجھ سکتا کہ وہ قوت کہاں تھی جس سے ایسی بڑی کرامات ظاہر ہوئی تھی۔ کیونکہ ہندوستان میں غلامی اور نہایت ہی ذلیل اور دائمی غلامی ایک قدرتی حالت تھی باشندگان مُلک کی ایک بڑی جماعت کی۔ اور

یہ وہ حالت تھی جس میں اُن کو ایسے قوانین طبیعی نے مقدر کیا تھا جن کا مقابلہ کرنا ناممکن
تھا۔ سچ یہ ہے کہ اُن قوانین کا زور اس قدر بے پناہ ہے کہ جہاں کہیں اُن کا عمل دخل
ہوا ہے وہاں اُنھوں نے (غلہ یا دولت) پیدا کرنے والی جماعتوں کو ہمیشہ ماتحتی میں رکھا ہے
اور کسی گرم ملک کی تاریخ میں (جہاں دولت بفراوانی جمع ہو گئی ہو) کوئی مثال ایسی
نہیں ملتی کہ وہاں کے باشندے اپنی قسمت کے نوشتے کو مٹا سکے ہوں۔ کوئی مثال ایسی
نظر نہیں آتی کہ اقلیمی حرارت نے غذا بہ افراط مہیا نہ کی ہو اور غذا کی افراط نے پہلے تو
دولت اور پھر پولٹیکل اور سوشل اقتدار و قوت کی تقسیم غیر مساوی نہ کی ہو۔ جو قومیں ان حالات
میں پڑ گئی ہیں اُن میں عوام الناس کسی شمار میں نہیں ہیں۔ سلطنت کے نظم و نسق میں
اُن کی آواز سنائی نہیں دیتی اور جو دولت کہ خود اُن کی مشقت سے پیدا ہوتی ہے اُس پر
اُن کا بس نہیں چلتا۔ اُن کا کام صرف اسی قدر ہے کہ محنت کیے چلے جائیں اور اُن کا فرض
یہی ہے کہ اطاعت کرتے رہیں۔ اس طور پر اُن میں کورانہ اور کمینہ اطاعت کی وہ عادتیں
پیدا ہو گئیں جنھوں نے اُنکی ایک ایسی خاص قطع بنا دی کہ جس کا پتہ ہمکو تاریخ سے ملتا ہے
کیونکہ یہ بات بالکل شک و شبہ سے پاک ہے کہ اُنکی تمام پچھلی رودادوں اور سرگزشتوں میں
کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ اُن لوگوں نے کبھی اپنے حکمرانوں سے سرتابی کی ہو۔ اُن میں
کبھی قبیلوں کی باہمی میدان داری نہیں ہوئی۔ نہ کوئی عام بلوا ہوا۔ حتیٰ کہ کسی عام
سازش کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ بیشک ان شاداب زرخیز ملکوں میں بہت سے انقلابات ہوئے
لیکن وہ سب اوپر (یعنی طبقۂ اعلیٰ) سے شروع ہوئے نہ کہ نیچے (یعنی طبقۂ ادنیٰ) سے اُن میں
جمہوریت کا جزو ہمیشہ مفقود رہا ہے۔ بادشاہوں کی جنگ و جدل اور فرمانروا خاندانوں کے
باہمی نزاع و پیکار کی بارہا نوبت آئی۔ سلطنت میں بہتیرے انقلابات ہوا کیے۔ محلات شاہی
میں بہت سے ردوبدل ہوئے اور تخت شاہی پر نہ معلوم کتنی دفعہ تغیر ہوا۔ لیکن عوام الناس
میں کوئی انقلاب نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ جو اُنکی قسمت کا لکھا تھا جسے انسان نے نہیں بلکہ قدرت

نے لکھا تھا وہ نہ مٹنا تھا نہ مٹا۔ اور وہ اپنی اُسی کم بختی اور بدبختی میں رہنے والے تھے سو رہے۔ اور جس وقت تک کہ یورپ نے تمدن میں سر نہیں اُبھارا اُس وقت تک نہ تو دیگر قوانین طبیعی نے اپنا عمل شروع کیا نہ دیگر نتائج ظہور پذیر ہوے۔ اول اول یورپ ہی میں مساوات کے قریب پہونچنے کی کوشش اور قوت و دولت کی تقسیم میں جو بے انداز غیر مساوات تھی (کہ جو قدیم تر ممالک میں ضعف و کمزوری کی اصلی بنیاد تھی) اُس کے برابر کرنے کا رجحان شروع ہوا اور بطور ایک لازمی نتیجہ کے یہ سہرا یورپ ہی کے سر بندھا ہے کہ ہر ایک شئے جو تمدن کے نام کی شایاں ہے وہیں سے شروع ہوئی۔ کیونکہ صرف یورپ ہی میں اس کی کوششیں کی گئیں کہ قوم کے مختلف اجزاے ترکیبی میں موازنہ قائم رکھا جائے اور یورپ ہی میں سوسائٹی ایسے منصوبے کے بموجب ترکیب دی گئی کہ جو اگرچہ کافی طور سے وسیع نہ تھا لیکن اُسمیں اتنی گنجایش ضرور تھی کہ سوسائٹی میں جتنے مختلف درجات اور طبقات تھے اُن سب پر حاوی ہو سکتا تھا اور اس طور سے ہر طبقہ اور درجہ کو ترقی کی جگہ دے کے کُل مجموعہ کی پیشقدمی اور استقلال کو محفوظ اور برقرار رکھ سکتا تھا۔

۲۴؎ یعنی ایشیائی ملکوں میں ذات برادری کے جھگڑے اور پیشہ اور ہنر کی تقسیم نے اعلیٰ اور ادنیٰ مدارج ایسے قرار دیے تھے کہ انسان کے واسطے ترقی کا میدان تنگ ہو گیا تھا اور آزادی کے ساتھ اپنے جوہر طبیعی دکھانے کا موقع بہت کم رہ گیا تھا اور اس وجہ سے بلحاظِ دولت۔ بلحاظ ناموری و عزت اور بلحاظ ملکی اقتدار و قوت کے متعدد گروہ ایسے بن گئے تھے جن میں سے بعض بالکل ان نعمتوں سے محروم اور بعض بلا شرکت غیرے انھیں میراث جد و پدر بنائے ہوے تھے۔ جو لوگ محروم تھے اُن کے واسطے یہ ناممکن تھا کہ کسی کوشش سے بھی وہ اُن نعمتوں کو پا سکتے اور جو لوگ اُن سے بہرہ مند تھے وہ کسی حکمت سے بھی محروم نہیں کیے جا سکتے تھے۔ مثلاً ہندوستان میں اگر ایک برہمن بچہ دیانت سمجھا جاتا تھا اور اُسکی بد اعمالی یا جہالت بھی اُس کے سر پر سے دستار فضیلت اُتار نہیں سکتی تھی۔ یا ایک چھتری برن پیدائشی سورما اور نبرد آزما حکمراں سمجھا جاتا تھا

جس صورت سے یورپ کے بعض مخصوصات طبیعی نے انسان کے اوہام وساوس کو دور کرکے اُسکی ترقی میں مدد دی ہے وہ اس باب کے خاتمہ کے قریب بیان ہوں گے لیکن چونکہ اُس کے بیان میں بعض ایسے قوانین کی تنقیح کرنا ہوگی جن پر میں نے ہنوز نظر نہیں ڈالی ہے۔ لہذا۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جس تحقیقات کو ہم نے شروع کیا ہے پہلے اُس کا تکملہ کرلیں اور اس لیے میرا یہ قصد ہے کہ میں اس بات کو ثابت کروں کہ جو سلسلۂ استدلال ابھی ہندوستان پر منطبق کیا گیا ہے وہ یکساں طور سے مصر میکسیکو [۲۵]

چاہے اُس کی طبیعت میں یہ صفات خلقی ہوں یا نہ ہوں اسی طرح ایک شودر ازلی غلام اور چاکر تھا اور وہ کسی شخص سے بھی دنیا میں موقر اور معزز نہیں ہو سکتا تھا۔ برخلاف اس کے یورپ میں یہ جھگڑے اور قصے کبھی نہ تھے۔ اور ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنے حسب مرضی کوئی پیشہ اختیار کرکے سرلبند ہو سکتا تھا۔ پس وہاں نسب کے بہ نسبت جوہر ذاتی کی پرستش زیادہ تھی۔ اور ہر شخص اپنے وہبی صفات اور کسبی کمالات کے اعتبار سے دنیا میں مقتدر ہو سکتا۔ اور نام و نمود پیدا کرسکتا تھا۔ ۱۲

۲۵ میکسیکو۔ جنوبی امریکہ کے منتہاے جنوب اور غرب کا ملک ہے۔ یہاں زمانۂ قدیم میں تمدن نے ایک خاص حد تک بہت اچھی ترقی کی تھی۔ اسکی تاریخ سے ترقی کے دو دوروں کا پتہ چلتا ہے۔ پہلا دور ساتویں صدی عیسوی سے شروع اور بارہویں صدی میں ختم ہوا۔ دوسرا دور ۱۱۰۰ء سے شروع اور ۱۵۱۹ء کو ختم ہوا کہ جس وقت سے اہل اسپین کا دور دورہ ہو گیا۔ یہاں کے اصلی باشندے جن کے دم سے تمدن نے رونق پکڑی نرم مزاج صلح جو۔ محنتی۔ مستعد اور کارگزار تھے۔ انھوں نے زمین پر کاشتکاری کی، زمین کے نیچے اور اوپر عمارتیں کھڑی کیں۔ شہر بسائے۔ عبادت گاہیں قائم کیں جن کے آثار و یادگار اب تک ہسپانیۂ جدید میں ملتے ہیں۔ وہ دھاتوں کا گلانا سخت سے سخت پتھروں کو کاٹنا اور جلا کرنا۔ مٹی کے برتن بنانا۔ اور مختلف قسم کے کپڑے بُنا جانتے تھے۔ وہ واقعات کے محفوظ رکھنے کے واسطے خطوط تصویری سے کام لیتے تھے گرہنوں کے اسباب وعلل سے واقف تھے

اور پیرؔو پر چسپاں ہو سکتا ہے کیونکہ اس طرح ایک ہی سلسلۂ بیان میں ایشیا۔ افریقہ اور امریکہ کے نہایت نمودار تمدنوں کو شامل کر لینے سے ہم اس قابل ہو جائیں گے کہ دیکھیں کہ کس طرح مندرجۂ بالا اصول مختلف اور دور اُفتادہ ممالک میں ٹھیک اُترے ہیں اور تب ہمارے ہاتھ میں ایسی شہادت ہو جائے گی جو کافی طور سے اتنی جامع اور

۴ اُنھوں نے دھوپ گھڑیاں بنائی تھیں اور سال شمسی کا حساب مقرر کیا تھا اُن میں مذہبی خیالات و معتقدات نہایت دھیمے پن کے ساتھ تھے اور دادگستری کے لیے قانون کا بھی چلن نہ تھا۔ دوسرے دَور میں مذہب نے کسی قدر خوفناک صورت اختیار کی۔ اور ارکان مذہبی میں بیم دہراس بے انتہا بڑھ گئی اور نہ صرف مذہب میں بلکہ تمدن کی ہر شاخ میں دھیمے پن کے ساتھ ہی کچھ دہشت وہیبت کی ادا سموئی ہوئی تھی۔ اسی دوسرے دَور میں شہر مکسیکو آباد ہوا۔

جب اس مُلک میں اہل اسپین کا عمل دخل ہو گیا اُس وقت سلطنت میں جمہوریت کا عنصر غالب ہوا۔ قوانین میں سختی کا برتاؤ کیا گیا۔ اگرچہ عدالتوں کے دروازے کھل گئے۔

۲۶ ۔ پیرو۔ جنوبی امریکہ کی ایک عمدہ جمہوری سلطنت جس پر تمدن کے دو دورے گذر چکے ہیں اور فی الحال تیسرا دور ہے جو سولھویں صدی کے اوائل سے (یعنے جب سے اہل اسپین کا تسلط ہوا) شروع ہوا ہے۔ اس کے تمدن کا ابتدائی عہد وہ تھا جس کی بدایت ونہایت کی بابت کوئی صحیح علم نہیں ہے لیکن اُس وقت یہاں کے باشندے بڑے بڑے شہروں میں شاد وآباد تھے اور بلحاظ تمدن زبان اور مذہب کے اس قدر ترقی کیے ہوے تھے جس حد تک دورۂ ثانی والے بھی نہ پہونچ سکے۔ اُنکی یادگاریں جو باقی ہیں وہ اُن کی تعمیرات، اُن کی نقاشی اور اُن کی مصوری کے کمال کا ثبوت دے رہی ہیں۔ ان عمارتوں میں وہ صنعت صرف کی گئی تھی کہ اُنکے جانشینوں نے اسے تسلیم کیا اور انھیں کو نمونہ قرار دیا۔ سب سے بڑھ کے حیرت انگیز امر ہے کہ انھوں نے جہاں عمارتیں بنائی تھیں وہ مقام سطح سمندر سے بارہ تیرہ ہزار فٹ بلند ہے اور اب کہ وہ بالکل برف سے ڈھکا ہوا ایک

مانع ہوگی کہ اُس کے ذریعہ سے اُن بڑے قوانین کی جانچ کی جا سکے گی جن کی بابت (بغیر اس احتیاط کے) شاید یہ خیال پیدا ہو کہ میں نے نہایت ناقص اور خفیف مواد اور مصالح سے ترتیب دے کے کچھ کلیات بنائے ہیں۔

جن وجوہ سے افریقہ کی کُل قوموں میں صرف مصر والے متمدن ہوے وہ بیان ہو چکے ہیں اور یہ ظاہر کیا جا چکا ہو کہ وہ اسباب اُنھیں مخصوص حالت طبیعی پر موقوف و منحصر تھے جن سے ملک مصر اپنے گرد و پیش کے ملکوں سے ممیز ہو رہا تھا۔ انھیں خصوصیات طبیعی نے حصول دولت کو آسان کر کے نہ صرف وہاں کے باشندوں کے پاس مادّی ساماں (ایسے ساماں جنھیں وہ کسی اور صورت سے پا ہی نہ سکتے تھے) مہیا کیے بلکہ اُن میں جو صاحب عقل و حکمت گروہ تھا اُس کو ایسی فراغت اور دلجمعی بھی بخشی اور ایسا موقع بھی دیا کہ وہ اپنے مبلغ علم اور دائرۂ آگہی کو وسیع کر سکیں درحقیقت یہ سچ ہے کہ باوجود اُن سب فوائد کے اُس نے کوئی بڑا قابل قدر کارنمایاں نہیں کیا لیکن اُسکے وجوہ جو کچھ تھے وہ آگے چل کے بیان ہوں گے۔ بہرطور۔ یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ افریقہ میں جتنی قومیں آباد تھیں اُن میں سے صرف باشندگانِ مصر نے خود اپنے آپ کو سب سے زیادہ سربلند کیا۔

چونکہ ہندوستان کی طرح مصر کا تمدن بھی سرزمین کی شادابی اور زرخیزی اور اقلیم کی شدت حرارت پر مبنی تھا اس وجہ سے دونوں ملکوں میں ایک ہی قوانین نے اپنا جلوہ دکھلایا اور قدرتی طور سے دونوں جگہ یکساں نتائج ظہور پذیر ہوے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں ملکوں میں قومی غذا ارزاں اور بافراط تھی اور اسی بنیاد پر دونوں جگہ مزدوری کا بازار مزدوروں سے پٹا پڑا رہتا تھا اور اسی سبب سے دولت اور اقتدار و قوت کی تقسیم غیرمساوی

بقیہ وحشت ہو عقلیں انھیں دیکھ کے حیران ہوتی ہیں کہ ایسے مقام پر جہاں انسان کا گذر مشکل ہو بنانے والوں نے یہ کاریگری کیسے دکھائی تھی اور کس طرح زمانۂ قدیم میں یہ مقام پایۂ تخت رہا ہوگا۔ ۱۲

تھی اور بطور نتیجۂ لازمی کے وہ تمام حالات پیش تھے جو ایسی عدم مساوات سے ضرورۃً پیدا ہوتے ہیں۔ جس طور سے اس سلسلۂ اسباب نے ہندوستان میں اپنا عمل کیا اس کی تنقیح کی کوشش میں ابھی کر چکا ہوں اور اگرچہ ملک مصر کی قدیم حالت کے مطالعہ کے لیے ساز و سامان بہت ہی کم ہیں لیکن تاہم وہ اس قدر کافی و وافی ہیں کہ جن سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ دونوں مقاموں (یعنی ہندوستان اور مصر کے تمدنوں میں کیسی عجیب مشابہت اور مماثلت ہے اور وہ اصول اعظم جنھوں نے دونوں ملکوں کی پولیٹکل اور سوشل ترقی کی رہبری کی ہے کس قدر متحد ہیں۔

جب ہم اُن اہم ترین حالات کی تحقیق اینق کرتے ہیں جو مصر کے قدیم باشندوں سے علاقہ رکھتے تھے تو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ بالکل اُن حالات کے چربے تھے جن کو ہم نے ابھی ہندوستان میں مطالعہ کیا ہے۔ کیونکہ سب سے پہلے اُن کی معمولی غذا کے مطالعے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو نسبت چانوں کو ایشیا کے شاداب ترین حصوں سے ہے وہی نسبت کھجوروں کو افریقہ سے ہے۔ دجلہ سے بحر اطلانطک تک جتنے ملک ہیں اُن میں سے ہر ایک میں کھجوروں کے درخت پائے جاتے ہیں اور عرب اور نیز خط استوا کے شمال میں (قریب قریب پورے افریقہ میں) کھجوروں سے کروڑہا مخلوق خدا کے لیے روزانہ خورش مہیا ہوتی ہے۔ بیشک افریقہ کے صحرائے اعظم کے اکثر حصص میں کھجور کا درخت پھل پھول لانے کے قابل نہیں ہوتا لیکن قدرتی طور سے وہ بہت بارآور اور سخت جان درخت ہوتا ہے۔ اس میں اس افراط سے کھجوریں پھلتی ہیں کہ صحرائے اعظم کے شمال کی جانب ان کو نہ صرف انسان بلکہ پالو جانور تک کھاتے ہیں۔ اسی طرح مصر میں (جہاں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ خودرو اُگتا ہی) کھجوریں اس کثرت سے پیدا ہوتی ہیں کہ باوجود باشندوں کی خاص خورش ہونے کے بہت ابتدائی زمانے سے وہ اونٹوں کو بھی عام طور سے کھلائی جاتی ہیں اور یہی اونٹ ہی وہ باربرداری کا جانور ہے جو عموماً اس ملک میں چلتا ہے۔

ان واقعات سے یہ واضح ہے کہ اگر مصر کو افریقہ کے تمدن کا بہترین نمونہ قرار دیں اور ہندوستان کو ایشیا کے تمدن کا بہترین نمونہ۔ تو ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ افریقہ کے تمدن سے جو نسبت کھجوروں کو ہے بالکل وہی نسبت ایشیا کے تمدن سے چاولوں کو ہے۔ اب یہ بات قابل لحاظ ہے کہ چاول میں جو اہم خصوصیات طبیعی ہیں وہی کھجور میں بھی پائی جاتی ہیں کیمیائی حیثیت سے (یہ مسلّم ہوچکا ہے کہ) دونوں کے اجزائے ترکیبی میں جزو غذائی ایک ہے۔ یعنی ہندوستانی غلّہ (چاول) کا نشاستہ اُلٹ کر مصر کی شکر[۲۷] ہوگیا ہے۔ پھر بلحاظ موسمی قوانین کے اُن کا ارتباط و اتحاد مساوی طور سے واضح ہے۔ کیونکہ چاولوں کی طرح کھجوریں بھی گرم ہی مُلک کی پیداوار ہیں۔ اور خطوط سرطان وجدی کے درمیان ہی (یعنی منطقۂ حارّہ میں) وہ زیادہ بارآور ہوتی ہیں۔ پھر بلحاظ اُنکی افراط اور سرزمین سے اُن کے تعلق کے قوانین کے دونوں میں بہت قریبی مماثلت ہے۔ کیونکہ چاولوں کی طرح کھجوریں بھی زیادہ مشقت نہیں چاہتیں۔ اور جب پیدا ہوتی ہیں تو افراط سے پیدا ہوتی ہیں اور پھر جس قدر (مخلوق کی) پرورش اُن کے ذریعے سے ہوتی ہے اُس کے مقابلہ میں وہ زمین کا بہت کم حصہ گھیرتی ہیں۔ حتّی کہ بعض اوقات ایک ایکڑ زمین میں دو سو سے زیادہ کھجوروں کے درخت نصب کیے جاتے ہیں۔

یہ وہ عجیب و غریب مشابہتیں ہیں جو مختلف ملکوں میں ایک ہی قسم کے طبیعی حالات سے قدرتی طور سے ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی تمدن حاصل کرنے سے پیشتر (انسانوں کو) ایک شاداب و زرخیز زمین ملی تھی۔ چنانچہ ایک طرف تو زمین کی زرخیزی نے یہ اعانت کی کہ دولت کے پیدا کرنے میں بہت سُرعت ہوئی اور دوسری جانب غذا کی افراط نے جس تناسب سے دولت تقسیم کی اُسے سنبھالا۔ مصر میں سب سے

[۲۷] یعنی جس طرح چاول میں جزو غذا نشاستہ غالب ہے اسی طرح کھجور میں جزو غذائی شکر غالب ہے اور بدن انسان کی ترکیب و قوام میں نشاستہ یا شکر دونوں قریب قریب ایک ہی کام دیتے ہیں ہندوستان کی ملکی خصوصیات کے لحاظ سے یہاں نشاستہ کی جیسی ضرورت ہے ویسے ہی مصر کی ملکی خصوصیات کے لحاظ سے وہاں شکر کی حاجت ہے

زیادہ شاداب مقام سعید[۲۸] ہے اور ٹھیک یہی مقام ایسا ہے جہاں ہم دیکھتے ہیں کہ علم و ہنر کا بہت عرصے تک مینھ برستا رہا - وہیں تھیبس[۲۹] - کارنک[۳۰] - لکسر[۳۱] ونڈیرا[۳۲] - اور ایڈفو[۳۳] کے کھنڈر ہیں - پھر سعید (تھیبد - جیسا کہ اکثر کہا جاتا ہے) ہی میں ایک غذا ایسی رواج پائے

۲۸ واضح ہو کہ اگلے وقتوں سے ملک مصر دو قسمتوں پر منقسم چلا آتا ہے (۱) نشیبی مصر جسے عریف کہتے ہیں - یعنی مزروعہ وسیر حاصل (۲) بالائی مصر جسے السعید کہتے ہیں یعنی خوشحال اور خوش قسمت یہ دوسرا حصہ بہ نسبت پہلے کے زیادہ خوش آب و ہوا اور صحت بخش ہے -

۲۹ تھیبس - یہ عرض البلد ۲۶ شمال میں واقع ہے - قدیم زمانے میں یہی جنوبی (یا بالائی) مصر کا صدر مقام تھا اور یہ اتنا بڑا شہر تھا جس کا طول ۹ ½ میل تھا اور جس کی آبادی ۱۶ میل کے دور میں تھی اس کے ویرانوں میں جو دور تک چلے گئے ہیں نو شہر شامل ہیں جن میں لکسر اور کارنک بھی ہیں جو دریائے نیل کے ساحل شرقی پر چلے گئے ہیں - کیونکہ تھیبس دریائے نیل کے دونوں کناروں پر آباد تھا اور دریا نے اس کے چار حصے کر دیے تھے زمانۂ قدیم میں اس کی ابتدائی آبادی کا حال تو بخوبی تحقیق نہیں لیکن اسمیں حکمرانان مصر کے گیارہویں خاندان کے عہد کی یادگاریں ہیں اور سن عیسوی سے ہزار

پندرہ سو برس پیشتر یہ اتنا شاد وآباد تھا کہ فراعنۂ مصر کے پایۂ تخت ممفس سے فوق لیگیا تھا ہومر (مشہور یونانی شاعر) کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک یہ ایک بڑا آباد شہر تھا - چنانچہ ہومر نے اسے "شہر صد دروازہ" کہا ہے - کیونکہ اس میں کوئی حصار نہ تھا اور ہمیں آمد و رفت کی صد ہا راہیں کھلی ہوئی تھیں - اب اس میں عرب فلاحین کے چند خاندان آباد ہیں - جن کی بسر اوقات سیاحوں کو زیارت کرانے اور پرانی قبروں سے بزرگوں کے تبرکات نکال کے ان کو بیچنے پر رہ گئی ہے -

۳۰ کارنک - فی الحال یہ ایک گانوں ہے اور اس معبد کے نام سے موسوم ہے جس کے سبب اسکی بڑی شہرت ہے - یہ مقام دریائے نیل سے نصف میل پر ہے اور وہاں قدیم معابد کے کھنڈروں کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا ہے ان کھنڈروں میں ایک دالان اتنا بڑا ہے جس کا رقبہ ۱۷۰ + ۳۲۹ فٹ ہے - اسکے درمیانی

ہوئے ہے جو کھجوروں اور چاولوں سے کہیں زیادہ سرعت کے ساتھ اپنی پودھ بڑھاتی ہے
یہ دھورا ہے جو ابھی تھوڑے دن ادھر تک شمالی (یعنی بالائی) مصر کے لیے مخصوص تھا
اور جسکی تولید نسل (یعنی اپنے ہمجنس پیدا کرنے) کی قوت اتنی عجیب تھی کہ وہ محنت کرنیوالے کو

گذرگاہ بارہ ستونوں پر قائم ہے جن میں سے ہر ایک ۶۰ فٹ لانبا اور ۱۲ فٹ قطر کا ہے۔ اس کے گرد ۱۲۲ ستون اور ہیں جن میں سے ہر ایک ۴۲ فٹ لانبا اور ۲۷ ½ فٹ مدور ہے اور اس میں دو مینار ہیں جن میں سے ہر ایک ۲۹ فٹ لانبا اور ۸ فٹ مربع ہے۔ ان کھنڈروں سے قدیم مصریوں کی تاریخ اور اُن کی روزمرہ معاشرت کے مرقعے ایسے واضح طور سے پیش نظر ہوتے ہیں جیسے اور کہیں نہیں ملتے۔

۵۳۱ لکسر۔ یہ اصل میں الاکسر ہے۔ یہ دریائے نیل سے ایک میل سے زائد فاصلے پر ہے اور چونکہ یہ کارنک کے معبدوں کا تتمہ ہے اس وجہ سے معمول کے خلاف اس کی عمارتیں دریا کے رُخ پر نہیں ہیں۔

۵۳۲ ڈنڈیرا۔ یہ دریائے نیل کے بائیں (جنوبی) ساحل پر ایک گانوں ہے۔ اسی مقام پر مصر کی دیوی وینس یعنی اتھر (زہرہ) کا ایک معبد ہے جو ہنوز قائم و محفوظ ہے۔ یہ معبد دریائے نیل سے ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ایک ٹیکرے پر واقع ہے اس معبد سے رومیوں اور یونانیوں کی ماتحتی میں مصر کی مذہبی عمارتوں کا جو طرز تھا اُسکا حال بخوبی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اُس وقت فن تعمیر اور فن نقاشی و مصوری کے نہایت اعلےٰ نمونے نظر آتے ہیں اس کے در و دیوار میں جو نقاشیاں ہیں اُن میں بادشاہوں کے مصروف بعبادت ہونے کے مرقعے ہیں۔ ستونوں پر زہرہ کی تصویریں ہیں اور بالاخانے پر کلیوپٹرا اور ٹپالومی کی مورتیں ہیں۔ اس کے دو اور معبد ہیں جو رومیوں کے عہد کے معلوم ہوتے ہیں۔

۵۳۳ ایڈفو۔ یہ ایک بڑا گانوں ہے اور جس معبد اعظم کی وجہ سے شہرت پائے ہوئے ہے وہ ایک حد تک اپنی اصلی حالت میں بجنسہ برقرار اور مصر قدیم کی شاندار عمارتوں کی یاد دلا رہا ہے۔ حالانکہ یہ اُسوقت کا بنا ہوا ہے جب وہاں فن تعمیر تنزل کی حالت میں تھا۔ تِس پر بھی اس کی صنعتوں سے قدیم مصریوں کی دستکاری اور کمال ہنرمندی کا حال معلوم

ایک دانے کے عوض دو سو چالیس دانے معاوضہ میں دیتا تھا۔ جنوبی (یعنی نشیبی) مصر میں سابقاً دہوڑا کا کوئی نام بھی نہ جانتا تھا۔ لیکن علاوہ کھجوروں کے وہاں کے باشندے ایک قسم کی روٹی کنول گٹے کی پکاتے تھے۔ اور یہ درخت دریاے نیل کے سیر حاصل زمین سے خود بخود اُگتا تھا۔ یہ بہت ارزاں اور سہل الحصول غذا ہوگئی اور اسی کے ساتھ دوسرے درختوں اور جڑی بوٹیوں کی افراط مستزاد تھی کہ جن پر باشندگان مصر خاص کر کے بسر اوقات کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں رسد اتنی نباتات سے تھی کہ مسلمانوں کی یورش کے وقت صرف اسکندریہ کے شہر میں چار ہزار سے کم وہ لوگ نہ تھے جن کی وجہ معاش لوگوں کے ہاتھ سبزہ فروشی تھی۔

قومی غذا کی اس افراط نے واقعات کا ایک سلسلہ نتیجۃً رونما کر دیا کہ جو اُس سلسلۂ واقعات سے بالکل مشابہ تھا جو ہندوستان میں پیش آئے تھے۔ عام طور سے افریقہ میں آبادی کے بڑھانے میں ایک طرف تو اقلیمی حرارت اعانت کرتی اور دوسری طرف زمین کی خرابی اسے روکتی بھی رہی۔ لیکن چونکہ سواحل نیل پر اس روک کا پتہ بھی نہ تھا (یعنی وہاں زمین نہایت سیر حاصل تھی) اس سبب سے وہاں وہ قوانین جو ابھی مذکور ہو چکے ہیں بے روک ٹوک اپنا عمل کرنے لگے۔ انھیں قوانین کا زور تھا کہ اہل مصر کو صرف یہی نہ تھا کہ سامان خورش ارزاں تھا بلکہ انھیں غذا کی حاجت بھی نسبتاً کم مقدار میں ہوتی تھی۔ اور یہ دوگونہ سلسلہ ایسا قائم تھا جس سے اُن کی تعداد اس حد تک بڑھی جس حد تک بڑھنا ممکن تھا۔ پھر طبقۂ ادنیٰ والے اپنے بال بچوں کو زیادہ تر آسانی سے

ہوتا ہے اُسکا بیرونی درجہ ۲۲۶ فٹ چوڑا ہے اور اُس کے در و دیوار پر بٹا لومی کی عبادت کناں تصویریں ہیں جو قیدیوں کو قتل کرتا ہوا دکھایا گیا ہے اسمیں ایک دالان (جسمیں سے ہو کے اصل معبد میں پہونچتے ہیں) ۱۹۱ فٹ لانبا اور ۱۴۰ فٹ چوڑا ہے۔ دوسرے سرے پر جو برآمدہ ہے اُسمیں ۱۸ ستون ہیں اور وہ ۸۲ فٹ چوڑا اور ۴۷ فٹ لانبا ہے۔

۵۳۴ جیسے ان ممالک میں آرام دلانے کی ٹکیاں بناتے ہیں۔

پرورش کر سکتے تھے کیونکہ درجات حرارت کے بڑھے ہوئے ہونے سے مصارف کا ایک اور دروازہ بالکل بند تھا۔ یعنی گرمی اتنی پڑتی تھی کہ سن رسیدہ لوگوں کو بھی بہت کم اور ہلکے کپڑوں کی ضرورت ہوتی تھی اور مزدوری پیشہ لوگوں کے بچوں کا تو یہ حال تھا کہ وہ قریب قریب ننگے پھرتے تھے۔ اور بمقابلہ اُن سردتر ملکوں کے جہاں معمولی صحت کے برقرار رکھنے کے واسطے بھی گرم تر اور گراں تر ملبوس لازمی ہوتے تھی۔ یہ کیفیت جو وہاں تھی بالکل ہی عجیب تھی۔ ڈائڈورس سکیولس[۳۵] (جس نے اُنیس سو برس اُدھر مصر کا سفر کیا تھا) کہتا ہے کہ ایک لڑکی کے حد بلوغ تک پرورش کرنے میں کسی طرح بیس درہم سے زیادہ صرف نہیں ہوتے تھے کہ جو انگریزی سکے میں مشکل سے تیرہ شلنگ کے مساوی ہوں گے۔ اور وہ اسی بات کو ملک کے آباد ہونے کی ایک وجہ قرار دیتا ہے اور انصاف یہ ہے کہ اُس کا خیال حق بجانب ہے۔

اب اگر ایک ہی جملے میں اس سارے مضمون کو ادا کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ مصر میں آبادی اس وجہ سے یوماً فیوماً بڑھتی تھی کہ ایک طرف تو سرزمین باشندگان ملک کے لیے رسد کا سامان بفراوانی مہیا کرتی اور دوسری طرف اقلیمی حالت اُن کی مانگ (یا خواہشات غذا) گھٹاتی رہتی تھی۔ اُس کا نتیجہ یہ تھا کہ مصر نہ صرف افریقہ کے دیگر بلاد سے بلکہ غالباً دنیاے قدیم کے تمامی بلاد سے زیادہ آباد تھا۔ بیشک اس بارے میں ہمارے

[۳۵] ڈائڈورس سکیولس۔ یہ ایک نامور مورخ گزرا ہے جس کی تاریخ عالم چالیس جلدوں میں ہے۔ اس میں ابتداے آفرینش سے ۶۰ سنہ قبل ولادت مسیح تک کے حالات تاریخی ہیں۔ اب اس میں سے صرف ۱۵ جلدیں اور کچھ اجزا زمانے کی دستبرد سے محفوظ رہے ہیں۔ اگرچہ اس میں بہت سی باتیں غلط سلط اور عقل و قیاس کے مخالف ہیں مگر پھر بھی جس قدر عمدہ واقفیت اِس سے حاصل ہوتی ہے وہ شاذ و نادر کسی اور کتاب سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ۱۲۔

معلومات کسی قدر ناکافی ہیں۔ لیکن جن ذریعوں سے وہ معلومات حاصل ہوئی ہیں اُنکی صحت و واقعیت میں کچھ بھی شک و شبہہ نہیں ہے۔ ہیروڈوٹس[536] (جس کا حال یہ ہی کہ جس قدر زیادہ اُس کی بات کو سمجھو اُسی قدر زیادہ اُس کی صادق البیانی معلوم ہو) بیان کرتا ہے کہ ایمسس[537] کے عہد حکومت میں یہ کہا جاتا تھا کہ بیس ہزار شہر آباد ہیں۔ غالباً لوگ اس بیان کو مبالغہ آمیز سمجھیں گے لیکن یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ڈائڈورس سکیولس (جس نے ہیروڈوٹس سے چار سو برس بعد مصر کا سفر کیا تھا اور) جس کے دل میں اپنے متقدم (یعنی ہیروڈوٹس) کی شہرت اور ناموری سے ایسا رشک حسد سمایا ہوا تھا کہ وہ اُسکے بیانات کی تردید و تکذیب پر تُلا ہوا تھا وہ بھی اس اہم معاملے میں اس کی تائید کرتا ہے کیونکہ وہ صرف یہی نہیں کہتا کہ اُس زمانے میں مصر میں ایسی گنجان آبادی تھی جیسی شاید کسی دوسرے مُلک میں ہو بلکہ (اُن روئدادوں کی بنیاد پر جو اُس وقت

۵۳۶ ہیروڈوٹس۔ ایک مشہور و یگانۂ آفاق یونانی مورخ جسے ابو التاریخ کا خطاب زمانے نے دیا تھا۔ اس نے یونان۔ افریقہ۔ ایشیا اور یورپ میں سیاحت کی تھی اور اسی سیاحت میں اُس نے اپنی بے مثل تصنیف کا مواد جمع کیا تھا۔ اس کی تصنیف نو جلدوں میں ہے اور قدما میں وہ نہایت معتبر و مستند ہے۔ چنانچہ وہ متعدد السنۂ یورپ میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ ولادت قریب ۴۸۴ء قبل ولادت مسیح۔

۵۳۷ ایمسس۔ یہ معمولی حیثیت کا ایک شخص تھا اپنے جوہر ذاتی کی وجہ سے پہلے تو ایک جنرل اور پھر ۵۶۹ء قبل ولادت مسیح میں بادشاہ ہو گیا تھا۔ اس نے یونانیوں سے مراسم اتحاد و ارتباط پیدا کیے۔ ایک یونانی عورت سے شادی کی۔ یونان سے سلسلۂ تجارت قائم کیا اور اہل یونان کا ایک رسالہ اپنے باڈی گارڈ میں بھرتی کیا فیثا غورث اور سولن نے اس سے ملاقات کی تھی۔ اس نے ۴۴ برس بادشاہت کی اور اپنے عہد حکومت میں اُس نے مصر کو بہت خوشحال بنایا اور سنوارا تھا۔ اسی کے مرنے کے بعد مُلک کو اہل فارس نے فتح کر لیا۔

موجود تھیں) وہ یہ بھی کہتا ہے کہ سابق میں وہ اتنا آباد تھا کہ دنیا کے آباد ترین ملکوں میں یگانہ و یکتا تھا اور اس میں اٹھارہ ہزار شہر بسے ہوئے تھے۔

قدیمی مصنفین میں یہی دو شخص تھے جو اپنے ذاتی علم و واقفیت کی رو سے مصر کی حالت سے بخوبی آگاہ تھے۔ اور اُن کی شہادت اس وجہ سے اور بھی زیادہ قیمتی ہے کہ درحقیقت وہ مختلف ذرائع سے حاصل کی گئی تھی۔ ہیروڈوٹس کی معلومات زیادہ تر ممفس[۳۵] میں حاصل ہوئی تھی اور ڈائڈورس کی بمقام تھیبس۔ اور اگرچہ ان دونوں بیانات میں کتنا ہی اختلاف و تناقض کیوں نہ ہو لیکن باشندگانِ مُلک کی بسرعت زیادتی اور جس کمینہ و غلامانہ حالت میں وہ لوگ پڑے ہوے تھے اس کی بابت دونوں متفق اللفظ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف اُن عظیم الشان اور کثیر المصارف عمارتوں کی (جو ابتک کھڑی ہوئی ہیں) ظاہری ہیئت ایک ثبوت اُس قوم کی حالت کا ہے جس نے اُنھیں تعمیر کیا تھا۔ ایسی بلند و بالا اور پھر بے سود عمارتوں کے تعمیر کرنے کے واسطے لازم ہے کہ حکمرانوں میں جور و تعدی اور محکوموں میں غلامی کا مادّہ ہو۔ اگر یہ ایسے آزاد انسانوں کا کام ہوتا جنھیں اپنی محنت و مشقت کا واجبی صلہ انصاف اور دیانت سے ملتا ہوتا تو چاہے کتنی ہی بڑی دولت ہوتی اور کتنے ہی بیدریغ طریقہ سے وہ دولت لُٹائی جاتی وہ ان عمارتوں کے مصارف کو کبھی کافی وافی نہ ہوتی۔ لیکن ہندوستان کی طرح مصر میں ایسے (یعنی انصاف و دیانتداری کے ساتھ مزدور کو مزدوری

[۳۵] ممفس۔ مصر کا مشہور و معروف شہر جو زمانۂ قدیم میں اُس کا پایۂ تخت تھا۔ اسے مینس نے (جو مصر کے اول حکمران خاندان کا پہلا بادشاہ تھا) آباد کیا تھا۔ اس شہر کے معابد نہایت عالیشان اور خوشنما تھے ۶۳۹-۴۰ء میں اسے عمر بن عباس نے (عاص ؟) فتح کیا اور اُس کے آثار شکستہ سے فسطاط اور قاہرہ کو تعمیر کرایا۔ اب اس کے جو کچھ کھنڈر باقی ہیں وہ بالکل زمین کے نیچے دبے پڑے ہیں۔ ۱۲

دینے کے) خیالات نظر انداز ہو چکے تھے۔ کیونکہ ہر امر کا رجحان اس طرف تھا کہ سوسائٹی میں اعلیٰ طبقہ والوں کو بڑھاتی اور ادنیٰ طبقہ والوں کو گراتی چلی جائے اور ان دونوں طبقوں کے درمیان ایک سدِ سکندری حائل تھی۔ اگر مزدوری پیشہ گروہ کا کوئی شخص اپنے معمولی کاروبار کو تبدیل کر دیتا تھا۔ یا اُسکی بابت یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ مُلکی معاملات کی طرف کچھ توجہ کر رہا ہے تو اُسے نہایت سخت سزا دی جاتی تھی۔ اور کسی حالت میں بھی ایک زراعتی مزدور کو یا ایک کاریگر کو یا کسی ایسے شخص کو جو بادشاہ یا پیشوائے دین یا اہلِ سیف نہ ہو یہ اجازت نہیں دی جاتی تھی کہ وہ زمین پر قبضہ کرے اور جائداد اراضی کا مالک بنے۔ عوام الناس کی حالت باربرداری کے جانوروں سے کچھ ہی بہتر تھی اور اُن سے جس قدر توقع رکھی جاتی تھی اسی کی رکھی جاتی تھی کہ وہ برابر یک لخت محنت کرتے چلے جائیں اور ذرا بھی دم نہ لیں۔ اگر وہ اپنے کام میں کچھ بھی تساہل کرتے تھے تو اُن کے دُرّے لگائے جاتے تھے۔ اور یہی سزا اکثر اوقات خانگی ملازموں بلکہ عورتوں تک کو دی جاتی تھی۔ یہ اور اسی طرح کے اور معاملات اچھی طور سے سوچ سمجھ کے اختیار کیے گئے تھے اور اُس وسیع طریق معاشرت کے لیے بخوبی موزوں تھے جو (محض اس وجہ سے کہ اُسکی بنیاد خود مختاری اور شخصیت پر قائم تھی) ظلم و ستم ہی پر قائم رہ سکتا تھا۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ ساری قوم کی محنت و مشقت قوم کے ایک چھوٹے سے حصّے کے اختیار میں آگئی تھی اور اُسکی وجہ سے یہ ممکن ہو گیا تھا کہ ایسی یادگار زمانہ عمارتیں قائم ہو جائیں جو بے غوری سے مطالعہ کرنے والوں اور عام تماشائیوں کے نزدیک (اگلے تمدن کا ثبوت) دیتی ہیں حالانکہ حقیقت میں یہ عالیشان عمارتیں ایسی حالت معاملات پر شاہد ہیں جس میں سراسر نکبت و فلاکت تھی اور کچھ نہ تھا۔ اور یہ وہ حالت تھی کہ جس میں ایک ناقص اور ناممکل تمدن کی کل ہنرمندی اور کاریگری اُنھیں لوگوں تک نہ پہونچاتی تھی جنکو اُس سے نفع اُٹھانا چاہیے تھا۔[۴۳] حتیٰ کہ عوام الناس جو ذریعے جلب منفعت

۴۳ یعنی جو لوگ صناع دستکار اور کاریگر تھے وہ بجائے اسکے کہ اپنی ہنرمندی کا خاطرخواہ صلہ پاتے اور اُلٹے اِس عذاب میں گرفتار رہتے تھے کہ جابر فرمانروا اُنھیں تھوڑا سا معاوضہ دیکے دن رات محنت میں مصروف

کے پیدا کیے تھے وہ اُلٹے انھیں کے واسطے عذاب جان ہو گئے تھے۔

یہ کہ سوسائٹی کی ایسی حالت میں (جیسی کہ وہاں تھی) انسانی مصائب یا تکالیف پر زیادہ لحاظ ہونا چاہیے تھا ایک ایسی بات ہے جس کی توقع رکھنا ہی بالکل فضول ہے تاہم اس بات سے ہم خود دنگ ہیں کہ مصر میں کس بے پروائی سے طبقہ اعلیٰ والے ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کی محنت اور اُن کی جانوں کو بیدریغ ضایع اور برباد کرنے میں مشاق تھے۔ بیشک اس بارے میں (جیسا کہ ان یادگاروں سے جو کہ ہنوز باقی ہیں بہت اچھی طرح ثابت ہوتا ہے) یہ لوگ فرد تھے اور اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ جس قدر یقین نہ آنے والی تضیع اوقات کی گئی ہے اُس کا کچھ اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ تین برس تک دو ہزار آدمی صرف ایک پتھر کو الفنٹائن[۵۴۰] سے سئیس[۵۴۱] تک لے جانے میں مصروف رہے تھے یا یہ کہ بحر احمر کی نہر میں ایک لاکھ بیس ہزار مصریوں کی جانیں کھپا دی گئی تھیں۔ اور یہ کہ اہرام مصری میں سے صرف ایک کی تعمیر کے واسطے تین لاکھ[۵۴۲] ساٹھ ہزار آدمیوں کو بیس برس تک کام کرنا پڑا تھا۔

۴ رکھتے تھے۔ فرمانرواؤں کی اس تعدی کی وجہ سے باوجود ہنرمند ہونے کے یہ لوگ ہمیشہ افلاس۔ غلامی اور مظلومی میں پڑے رہے۔ نہ آزادی سے بسر کر سکے نہ فراغت اور خوشحالی سے زندگی گزار سکے۔ اُن کی قسمت میں ہمیشہ تنگدستی اور بے دست و پائی ہی رہی۔

۵۴۰ الفنٹائن۔ دریاے نیل کا ایک چھوٹا سا جزیرہ جو اسوان کے محاذ میں مصر اور نوبیا کی سرحد پر ہے۔ یہ عرض البلد شمالی کے ۲۴ درجہ ۵ دقیقہ اور طول البلد شرقی کے ۳۲ درجہ ۵۴ دقیقہ میں واقع ہے۔

۵۴۱ سئیس۔ مصر میں ایک قدیم شہر تھا جو دریاے نیل کی ایک شاخ کے کنارے عرض البلد شمالی کے ۳۱ درجہ ۴ دقیقہ میں واقع تھا۔ اب اسکے معبدوں اور ایوان کے آثار و یادگار تک باقی نہیں رہے ہیں۔ البتہ یہاں سے اکثر نفیس سنگی مورتیں جو یورپ میں پہونچ گئی ہیں وہ محفوظ ہیں۔ اگلے زمانہ میں یہ مقام مذہبی پایۂ تخت کی حیثیت سے مرجع خلائق تھا۔ مصر کے چھبیسویں حکمران خاندان نے اسکو دارالسلطنت قرار دیا تھا۔ لیکن اُسکے بعد ممفس کو یہ شرف حاصل ہوا۔ حکماء یونان میں سے سولن اور فیثا غورث نے اس شہر کی زیارت کی تھی اور افلاطون نے یہاں کی درسگاہوں میں تعلیم پائی تھی

۵۴۲ اہرام مصری۔ یہ مخروطی

اگر ہم ایشیا اور افریقہ کی تاریخ کو چھوڑ کے نئی دنیا کی طرف مُڑتے ہیں تو مندرجۂ بالا خیالات کی صحت و واقعیت کے تازہ ثبوت ہمکو ملتے ہیں۔ اہل یورپ کے داخل ہونے سے پیشتر امریکہ کے جن مقامات میں کسی قدر تمدن تھا وہ مکسیکو اور پیرو تھے اور انھیں میں وہ پتلی سی چٹ بھی مستزاد کر دی جاتی ہے جو مکسیکو کے دکھن سے خاکنائے پناما تک چلی گئی ہے۔ اسی ملک میں جو اب وسطی امریکہ سے نامزد ہے) یہ معلوم ہوتا ہے کہ باشندگان ملک نے اپنی سرزمین کی شادابی کی مدد سے محنت کر کے خود ہی کسی قدر علم حاصل کر لیا تھا۔ کیونکہ جو کھنڈر اب تک موجود ہیں اُن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ میکانکس میں اسقدر درک اور فن عمارت میں اتنا سلیقہ رکھتے تھے جس کا حاصل کرنا ایک وحشی قوم کے لیے امکان سے خارج تھا۔ اس سے زیادہ اُن کی تاریخ کی بابت کچھ معلوم نہیں ہے۔ لیکن مثلاً کوپن[۱۲۳] پیلنکی[۱۲۴] اور اکسمل[۱۲۵] جیسے مقاموں کی شکل کی عمارتیں ہیں جو نئی اور پُرانی دونوں دنیاؤں میں پائی جاتی ہیں۔ پُرانی دُنیا میں مصر اور نئی دُنیا میں مکسیکو وہ مقام ہے جہاں یہ عمارتیں نظر آتی ہیں مصر کے اہرام دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیے جاتے ہیں اور تعداد میں ستر ہیں جو رقبہ اور وسعت کے لحاظ سے بہت متفاوت ہیں۔ اہرام مصری کے موضوع و مقصد کے بابت مدتوں قیاسات قائم ہوتے رہے۔ اور اسپر بہت کچھ عقل آرائی ہوا کی کہ یہ عالیشان عمارتیں کس غرض وغایت سے بنائی گئی تھیں۔ بعضوں نے یہ سمجھا کہ رصدگاہ کی ضرورت سے بنائی گئی ہونگی بعضوں نے یہ قیاس لگایا کہ وہ ریگ کے طوفانوں کو روکنے کے واسطے بنائی گئی ہونگی۔ بعضوں نے اُنھیں انبارخانے اور بعضوں نے خزانے سمجھا۔ بالآخر جنرل ہاورڈ وایس نے دس ہزار پونڈ صرف کر کے یہ عقدہ حل کر دیا اور اسکی تحقیق انیق نے ثابت کر دیا کہ یہ اُن بادشاہوں کے مقابر ہیں جنھوں نے چوتھے حکمران خاندان سے لیکر بارھویں حکمران خاندان تک کے سلسلے میں کچھ جاہ و جلال پیدا کیا اور عروج و اقبال کی منزل اعلیٰ میں قدم رکھا تھا۔

۱۲۳ کوپن۔ کوپالا (جو وسطی امریکہ میں ہے) اُس کا ایک برباد شدہ شہر جو اسی نام کے دریا کے کنارے تھا۔ اسکے کھنڈر تقریباً دو میل تک لب ساحل چلے گئے ہیں۔ انھیں میں ایک قدیمی معبد کے آثار شکستہ بھی ہیں جس کا طول ۶۲۴ فٹ ہے اور اسکے علاوہ بہت سی مخروطی شکل کی تعمیریں ہیں جنمیں سے ایک ڈیڑھ سو فٹ

عمارتوں کے جو حالات ہم کو ملے ہیں اُن سے یہ (قیاس) بہت زیادہ ممکن الوقوع معلوم ہوتا ہے کہ وسطی امریکہ ایک ایسے تمدن کا مستقر ہوگا جس کو تمام ضروری امور میں ہندوستان اور مصر کے تمدن سے مشابہ سمجھنا چاہیے۔ یعنی اس بارے میں مشابہ کہ دولت، اقتدار، قوت

بلند ہے۔ ان پر بتوں کی مورتیں نقش ہیں جو مصر اور ہندوستان کی مورتوں سے زیادہ مشابہ ہیں۔

۴۴ پیلنکی۔ سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں جب اہل اسپین نے میکسیکو کے صوبہ چیاپس کے دشوار گزار اور گھنے گھنیرے جنگل کو طے کیا تو انھیں وہاں ایک قدیم شہر کے آثار و یادگار نظر آئے جس کے وجود سے سارا عالم بے خبر تھا۔ اسی کو اُن لوگوں نے پیلنکی کے نام سے شہرت دی جو درحقیقت یہاں سے قریب ایک موضع کا نام ہے۔ یہاں ترشے ہوئے پتھروں کی دیواریں ہیں جو گارے سے جوڑے اور خوبصورتی کے ساتھ چنے گئے ہیں۔ دیواروں پر خط تصویری میں نہایت عمدہ کتبے ہیں اور جابجا نہایت اعلیٰ درجے کی نقاشی اور مصوری کی ہوئی ہے۔ لداؤ کی چھتیں ہیں۔ عمدہ مینارے ہیں جن میں دیوتاؤں کی تصویریں اور خط تصویری میں نوشتے اور کتابے ہیں۔ صدہا برس سے یہ عہد سلف کی یادگاریں گنجان جنگل میں چھپی ہوئی رہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ یہاں سے نصف میل کے فاصلہ پر بھی رہتے تھے انھیں بھی انکی خبر نہ تھی۔ یہاں اکثر عمارتوں میں نہایت چمکدار رنگ آمیزی کی ہوئی ہے عمارتیں اکثر ایک منزلی ہیں۔ بعض دو منزلی سہ منزلی اور چہار منزلی بھی ہیں۔ اکثر معبد نہایت وسیع۔ خوشنما اور سجے بنے ہوئے ہیں۔ سب سے بڑی عمارت جو یہاں ہے وہ ایک سنگی چبوترے پر ہے اس کا طول ۲۱۰ فٹ عرض ۲۶۰ فٹ ہے اور اس پر جو عمارت ہے اُس کا طول ۲۰۰ فٹ اور عرض ۱۸۰ فٹ ہے اسکی دیواریں ۲۵ فٹ بلند ہیں۔ یہاں کی مورتیں بعض سیدھی کھڑی ہیں اور بعض چارزانو بیٹھی ہوئی ہیں۔ اور اُس کے گرد جس قدر پتھر جڑے ہیں سب رنگے ہوئے ہیں۔ قصص پارینہ سے اسکا کچھ پتہ چلتا ہے کہ نہایت قدیم زمانہ میں میکسیکو کا ایک پایۂ تخت ایسا تھا جس میں تمدن کی گرم بازاری تھی عجب نہیں وہ مقام یہی ہو۔

۴۵ اُکسمل۔ یہاں بھی نہایت شاندار عمارتوں کے آثار شکستہ پائے جاتے ہیں۔ ان میں منقش مینار ہیں جن کے صدر دروازوں پر مورتیں بیٹھی ہوئی ہیں جو غالباً دیوتاؤں کے بت ہیں۔ انکے چہروں پر آثار لطف و محبت نظر آتے ہیں اور ہاتھ سینے پر رکھے ہوئے ہیں میناروں کے دیگر اطراف و جوانب میں خط تصویر کے کچھ کتبے ہیں۔

کی تقسیم وہاں بھی غیر مساوی ہوگی اور عوام الناس کا کثیر الانفار گروہ نتیجۃً نہایت غلامی میں پڑا ہوا ہوگا۔

لیکن اگرچہ وہ شہادت جس سے ہم وسطی امریکہ کی حالت سابقہ کا اندازہ کر سکتے قریب قریب معدوم ہو چکی ہے تاہم مکسیکو اور پیرو کی تاریخوں کی بابت ہم زیادہ خوش نصیب ہیں کیونکہ ابتک متعدد اور قابل وثوق سامان ایسے موجود ہیں جن سے ان دونوں ملکوں کی قدیم حالت اور اُن کے تمدن کی ماہیت اور وسعت کی بابت ہم کو رائے قائم کرنے کا موقع ہے۔ بہرکیف قبل اسکے کہ ہم اس مسئلہ کو شروع کریں یہ زیادہ آسان ہوگا اگر ہم یہ بتادیں کہ وہ کون کون قوانین طبیعی تھے جن کی وجہ سے یہ دونوں امریکہ کے مرکز تمدن قرار پائے تھے یا بالفاظ دیگر۔ کیا وجہ تھی کہ صرف انھیں ملکوں میں سوسائٹی ایک معین اور مقررہ نظام سے قائم ہوگئی۔ درانحالیکہ نئی دُنیا کا بقیہ حصہ نہایت جاہل اور وحشی لوگوں سے آباد رہا۔ اس قسم کی تحقیقات نہایت ہی دلچسپ ہوگئی کیونکہ اُس سے ایک مزید ثبوت اُس غیر معمولی اور درحقیقت بے پناہ قوت کا ہم پہونچ جائیگا جس سے انسانی قسمت نوامیس فطرت کی تابع رہی۔

یہاں کی سب سے بڑی عمارت سہ منزلی ہے جس کی ہر منزل میں سامنے کی طرف ترشے ہوئے پتھر لگے ہیں اور زاویہ خوشنمائی کے ساتھ گول کر دیے گئے ہیں۔ پہلی منزل ۵۰۵ فٹ طویل ہے اور ۱۵ فٹ عریض اور ۳ فٹ بلند ایک چبوترا ہے دوسری منزل ۴۵۵ فٹ طویل ۵۰ ۲ فٹ عریض اور ۲۰ فٹ بلند ہے اور تیسری منزل ۲۷۰ فٹ طویل ۳۰ فٹ عریض اور ۱۹ فٹ بلند ہے دوسری منزل کے وسط میں ایک نہایت نفیس زینہ بنا ہے جسکا عرض ۱۳۰ فٹ ہے اسی پر چڑھکر مندر میں پہونچنا ہوتا ہے جسکا رو کار ۲۲۳ فٹ ہے لیکن بلندی ۲۵ فٹ سے زیادہ نہیں اس مندر کا عظم وشان اسکی اعلیٰ درجہ کی نقاشی کی وجہ سے بہت بڑھ گیا ہے۔ اسکی دیواروں کے وسط میں ایک خوبصورت کارنس برابر چلی گئی ہے اور اسکے اوپر دیواروں میں صنعت ونقاشی مصوری کے نہایت نفیس نمونے نظر آتے ہیں۔ پیلنکی اور کوپن کے برخلاف یہاں چھت سنگی محرابوں پر قائم نہیں ہے بلکہ چوبی ستونوں پر قائم ہے جن کی لکڑی غالباً صدہا کوس کے فاصلے سے لائی گئی ہوگی۔ ان ستونوں پر بھی خط تصویری کندہ ہیں۔

سب سے پہلی حالت جس پر فوراً نگاہ پڑتی ہے یہ ہے کہ ایشیا اور افریقہ کی طرح امریکہ میں بھی کُل ابتدائی تمدن گرم ہی ملکوں میں قائم ہوے۔ خاص پیرو کا پورا ملک جنوبی خطوط سرطان و جدی کے تحت (یعنی منطقۂ حارہ جنوبی) میں تھا۔ اور وسطی امریکہ اور میکسیکو کا پورا ملک شمالی خطوط سرطان و جدی کے تحت (یعنی منطقہ حارہ شمالی) میں تھا۔ اب یہ امر کہ اقلیمی حرارت نے ہندستان اور مصر کی پولیٹکل اور سوشل انتظامات پر کس طرح عمل کیا اسکی تحقیق کی کوشش میں کرچکا ہوں اور اس کوشش میں قابل اطمینان طور سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ نتیجۃً باشندگان مُلک کی ضرورتیں اور حاجتیں گھٹ گئی تھیں۔ اور اس طور پر دولت اور اقتدار و قوت کی تقسیم بالکل غیر مساوی ہوگئی تھی۔ لیکن علاوہ اس کے ایک اور بھی صورت ہے جس سے کسی ملک کا اوسط درجہ حرارت وہاں کے تمدن پر اثر ڈالتا ہے اور اس بحث کو میں نے اسوقت کے واسطے اُٹھا رکھا تھا۔ کیونکہ دیگر مقامات کے بہ نسبت اُسکی توضیح امریکہ میں زیادہ خوبی سے ہوسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس پیمانہ پر نئی دنیا میں فطرت اپنا عمل کرتی ہے وہ اُس پیمانہ سے وسیع تر ہے جس پر وہ پُرانی دنیا میں عمل کرتی ہے۔ اور چونکہ قوائے فطرت زیادہ غالب رہنے والے ہوتے ہیں اس لیے یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس مقام میں نسل انسانی پر اُسکے آثار فطری کا مطالعہ اُس سے زیادہ فائدہ مند ہوگا جتنا ایسے ملکوں میں ہوسکتا ہے جہاں وہ نسبتاً کم زور دار ہے اور جہاں اسوجہ سے اُسکے حرکات کے نتائج کم نمایاں ہیں۔

اگر اس کتاب کا پڑھنے والا یہ بات اپنے ذہن نشین رکھے گا کہ قومی غذا کی افراط کی بابت یہ ثابت ہوچکا ہے کہ اُس کا کیسا بڑا اثر ہوتا ہے تو وہ بآسانی سمجھ لے گا کہ آثار طبیعی کے دباؤ سے امریکہ کا تمدن لازمی طور پر انھیں مقامات تک محدود رہا تھا جہاں نئی دنیا کے سُراغ لگانے والوں نے اُسے پایا تھا۔ کیونکہ سرزمین کی ترکیب کیمیائی اور طبقات ارضی کی خصوصیات کو علحدہ رکھ کے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہر ایک ملک کی سرسبزی و شادابی صرف دو سببوں

۴۶ یعنی جب پرانی دنیا والے نئی دنیا میں پہونچے تھے اُسوقت جو مقامات متمدن تھے بس یہی مقام وہ تھے جہاں کبھی تمدن کا گزر ہوا تھا۔

یعنی حرارت اور رطوبت پر مبنی ہوا کرتی ہی۔ جہاں انکی زیادتی ہوتی ہے وہاں زمین زرخیز اور سیر حاصل ہوتی ہی اور جہاں انکی کمی ہوتی ہی وہاں زمین اوسر بنجر ہوتی ہے - کچھ شک نہیں کہ عملی طور پر اس کلیہ کے ساتھ بعض استثناء لگے ہوئے ہیں اور وہ استثناء ایسے کیفیات طبیعی سے پیدا ہوتے ہیں جو اُسکے تحت میں نہیں ہوتے لیکن اگر اور سب حالات یکساں ہوں تو پھر یہ قاعدہ (کلیہ) ایسا ہوتا ہی کہ جو کسی حالت میں بدلتا نہیں۔ اور وہ امور خطوط تساوی

۲۷۵ نقشۂ دنیا میں باعتبار تجربے کے خطوط کھینچے گئے ہیں جو مختلف مقامات کے درجاتِ حرارت ایک ہی وقت اور فصل میں ظاہر کرتے ہیں۔ ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کن کن اقطاع وبلاد عالم کی اوسط حرارت کس زمانے میں مساوی ہوتی ہی۔ آلۂ مقیاس الحرارت کے ذریعہ سے جن آباد یا غیر آباد مقاموں کے درجات حرارت مساوی نکلے ہیں وہ ایک ہی خط میں ڈالے گئے ہیں۔ اُنھیں خطوط کو خطوط تساوی حرارت سے موسوم کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ اقلیمی تغیرات چونکہ مبنی ہیں ہوائے محیط کے داب - حرارت - رطوبت اور کشش کہربائی پر انھیں پر ہواؤں کا سال کے مختلف مہینوں میں کسی سمت سے چلنا موقوف ہوتا ہی کیونکہ جو ہوائیں کسی مقام پر چلا کرتی ہیں وہ صرف ہوائے محیط کے حجم وداب وغیرہ سے چلا کرتی ہیں جیسے مثلاً ہوا کا رخ ہمیشہ زیادہ داب والے مقام سے کم داب والے مقام کی طرف ہوتا ہی یا جیسے اُن مقامات میں جہاں سال کے ہر مہینے بارش ہوا کرتی اور بہت

تھوڑے زمانے تک برف زمین پر جمی رہتی ہی وہاں سرزمین کا درجۂ حرارت قریب قریب ہوائے محیط کے درجہ حرارت کے مساوی ہوا کرتا ہی لیکن جہاں سال کے ایک حصہ میں موسم مرطوب اور دوسرے حصہ میں خشک ہوتا ہی اور برف ایک مدت زمانے تک جمی رہتی ہے وہاں سرزمین کا درجۂ حرارت ہوائے محیط کے درجۂ حرارت سے کم وبیش ہوتا ہے۔

اس تحقیقات سے بہت اہم نتائج پیدا ہوئے ہیں کیونکہ حرارت ہوائے محیط کی سبب ہوا کرتی ہی ہواؤں کے کسی رُخ چلنے کی۔ اور ہواؤں کا کسی رخ پر چلنا سبب ہوا کرتا ہی بارش کا۔ اور بارش پر بہت کچھ دارومدار ہوتا ہے ملک کی فلاح وبہبود کا۔ چنانچہ۔ ہمبولٹ نے جب اسکی تحقیقات شروع کی کہ کس شرح سے اوسط درجۂ حرارت سطح سمندر کی بلندی کی نسبت سے گھٹتا بڑھتا ہی تو اس سلسلے میں اُس نے منطقۂ حارّہ کے طوفان ہوا کی ایک کُہنہ دریافت کی۔ اور اس کا پتہ لگایا کہ بلند تر عرض البلد میں موسمی اختلال کس طرح واقع ہوئے ہیں - ۱۲

حرارت کے قائم کیے جانے کے بعد سے جغرافیائی علم نباتات کے متعلق ہمارے علم میں آئے ہیں اُنکی بنیاد پر ہم اسے فطرت کا وہ قانون کہ سکتے ہیں جو نہ صرف اُن دلیلوں سے ثابت ہے جن کا ماخذ طبیعت نباتات کا علم ہے بلکہ جو اُس تناسب کے بغور مطالعہ سے واضح ہوا ہے جس سے مختلف ملکوں میں نباتات حقیقتاً تقسیم ہوے ہیں۔

برِ اعظم امریکہ پر وسیع نگاہ ڈالنے سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس قانون کو کیسا تعلق اُس مبحث سے ہے جو پیش نظر ہے۔ اولاً۔ بلحاظ رطوبت کے نئی دنیا میں کُل بڑے بڑے دریا مشرقی ساحل پر ہیں اور مغربی ساحل پر کوئی ایک بھی نہیں۔ اس عجیب معاملے کے اسباب وعلل معلوم نہیں ہیں لیکن یہ تو یقینی ہے کہ شمالی یا جنوبی امریکہ میں کوئی ایک بھی بڑا دریا بحرِ پاسفک (بحر الکاہل) میں نہیں گرتا۔ حالانکہ اُس کے دوسرے رُخ پر متعدد دریا بہ رہے ہیں جن میں سے بعض تو بڑے زخار دریا ہیں اور سبھی تو ایسے ہیں جو نہایت کارآمد ہیں مثلاً نگرو۔ لاپلاٹا۔ سین فرانسکو۔ امیزان۔ آورنیکو۔ مسی سپی۔ الاباما۔ سنٹ جان۔ پوٹومار سسکھانا۔ دلاوری۔ ہڈسن۔ سنٹ لارنس۔ اس وسیع سلسلۂ آبی سے مشرق کی طرف زمین علی الاتصال سیراب ہوتی رہتی ہے لیکن مغرب کی جانب شمالی امریکہ میں صرف ایک دریاے اوریگان ہے جو کسی قدر نفع بخش ہے۔ پھر جنوبی امریکہ میں خاکناے پناما سے لے کر آبناے میگلان

۴۵ اِس علم کا موضوع عالم نباتات کی تقسیم زمان و مکان میں ہے۔ یعنی اس میں صرف اس بات سے بحث کی جاتی ہے کہ کون کون نباتات کن کن وقتوں میں کہاں کہاں پائے جاتے ہیں۔ جسوقت تک انسان کے ذہن میں یہ خیال سمایا ہوا تھا کہ عالم میں کوئی نظم و ترتیب نہیں ہے اور ہر شے بطور خود موجود ہے یا ہوتی ہے اُس وقت تک یہ بات کہ وہ کس قطعۂ ارض یا کس زمانے میں پائی جاتی ہے کچھ کارآمد نہ تھی لیکن مسئلہ ارتقا اور بتدریج ترقی کے ثبوت کے بعد سے جب ہر حیوان یا نبات کی ترکیب ساخت میں اُن حالات طبیعی کا اثر ثابت ہوا جس میں وہ موجود ہوا ہے اُسوقت یہ امر زیادہ قابل غور نظر آیا اور اب یہ بات تاریخ عالم میں نہایت اہم ہے کہ ایک خاص جنس کس وقت پہلے پہل ظاہر ہوئی کس مقام پہ سب سے پہلے پیدا ہوئی اور کس قدر میں اب وہ پائی جاتی ہے۔ ۱۲

تک کوئی بڑا دریا ہی نہیں ہے۔

اب ہم شادابی و زرخیزی کے دوسرے خاص سبب یعنی حرارت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو معلوم ہوتا ہو کہ شمالی امریکہ میں حالت بالکل برعکس ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آبپاشی کے وسائل تو مشرق میں ہیں لیکن حرارت مغرب میں ہو۔ درجات حرارت کا یہ اختلاف جو دونوں سواحل میں پایا جاتا ہو غالباً کسی قانون موسمی سے علاقہ رکھتا ہو۔ کیونکہ کُل شمالی نصف الارض میں براعظموں اور جزائر کے حصص شرقی بہ نسبت حصص غربی کے زیادہ سرد ہیں۔ اب یا تو یہ امر کسی بڑے اور وسیع سبب پر مبنی ہوگا یا ہر ایک صورت خاص کے لیے کوئی علت مخصوص ہوگی (یہی دو شکلیں ہیں جن میں سے ایک کوئی ماننا پڑے گی) اس کا قطعی تصفیہ کرنا اپنی معلومات کی موجودہ حالت میں ہم سے ممکن نہیں۔ لیکن بہرطور جو امر واقعی ہو اُس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اور امریکہ کی ابتدائی تاریخ پر اس کا جو کچھ اثر پڑا ہو وہ بیحد عجیب ہو۔ اُسی کا یہ نتیجہ ہو کہ میکسیکو کے شمال میں اُس براعظم کا کوئی حصہ ایسا نہیں جس میں شادابی کے یہ دو بڑے سبب یکجا جمع ہوگئے ہوں۔ چنانچہ ایک سمت کے ملکوں میں تو حرارت کی کمی رہی اور دوسرے سمت کے ملکوں میں آبپاشی کی۔ اور چونکہ ان اسباب سے فراہمی دولت میں خلل پڑ گیا اس لیے سوسائٹی کی ترقی رک گئی اور اُس وقت تک کہ سولھویں صدی میں یورپ کے علم کا پرتو امریکہ پر پڑا کوئی مثال اسکی نہیں ملتی کہ بیسویں مقنطرہ (دائرۂ متوازی خط استوا) کے جانب شمال کے رہنے والوں میں سے کسی نے بھی اُس قدر نا مکمل تمدن کا درجہ بھی طے کیا ہو جس درجے تک ہندوستان اور مصر کے باشندے بآسانی پہونچ گئے تھے۔ برخلاف اسکے بیسویں مقنطرہ کے جانب جنوب میں براعظم (امریکہ) کی وضع یکایک بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔

۴۹ مقنطرہ دوائر متوازی افق کو کہتے ہیں مگر یہاں ہم نے مدارات یومیہ کے واسطے اطلاق کر لیا ہے۔ مدارات یومیہ وہ دوائر متوازی خط استوا ہیں جن پر ستارے زمین کی روزانہ گردش کے سبب سے مشرق سے مغرب کی طرف حرکت کرتے نظر آتے ہیں ۱۲۔

اور سمٹ سمٹا کے زمین کی ایک چھوٹی سی چٹ بنجاتی ہے کہ جو خاکنائے پناما تک پہونچی ہوئی ہے۔ یہی تنگنائے تھی جو میکسیکو کے تمدن کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ مندرجۂ بالا دلائل کے تقابل سے یہ بآسانی واضح ہوگا کہ یہ حالت کیوں پیدا ہوئی کیونکہ زمین کی ایک مخصوص وضع پر واقع ہونے نے اُسے بہت بڑا ساحل بنا دیا اور شمالی امریکہ کے جنوبی حصے کو ایک جزیرہ کی شکل پر قائم کردیا۔ اس طور سے وہاں ایک جزیرے کی سی آب و ہوا کی شان پیدا ہوگئی یعنی رطوبت کی زیادتی شروع ہوئی جو سمندر کے بخارات آبی سے پیدا ہوئی۔ پھر۔ چونکہ میکسیکو خط استوا سے قریب واقع تھا اس لیے وہاں حرارت بھی مل گئی۔ اور اسکی وضع خاص نے زمین میں رطوبت تو پہلے ہی سے مہیا کر رکھی تھی۔ اس صورت سے شمالی امریکہ کا ایک یہی حصہ تھا جسمیں یہ دونوں سبب جمع ہوگئے اور اسی بنیاد پر صرف یہی حصہ تھا جو کسی حد تک متمدن تھا۔ اسمیں شک نہیں کہ اگر کلیفورنیا اور جنوبی کولمبیا اتنے جلتے بھنتے ہوتے کہ وہاں کی زمین بالکل بیہڑ بنجر ہوگئی ہوتی یا ساحل شرقی کے دریاؤں سے وہ سیراب ہوتے یا اگر شرقی ساحل کے دریاؤں کے ساتھ غربی ساحل کی گرمی موجود ہوتی تو ان میں سے ہر ایک متحدہ صورت یہ نتیجہ پیدا کرتی کہ زمین میں وہ زرخیزی آجاتی جو (جیسا کہ تاریخ عالم قطعی طور سے ثابت کر رہی ہی) ہر ایک قدیمی تمدن کا دیباچہ ہوتی رہی ہی۔ لیکن شادابی اور سیرابی کے دو اجزائے ترکیبی میں ایک کی کمی امریکہ کے ہر حصہ میں (بیسویں نقطہ کے شمال کی طرف) رہی لہذا نتیجہ یہ نکلا کہ اُس دائرہ کے اِدھر تمدن کا کوئی ٹھکانا نہ ملا۔ اور اسکی بابت نہ اب تک کوئی شہادت ملی ہے اور (ہم وثوق کے ساتھ یہ اعتراف کرسکتے ہیں کہ کبھی نہ ملے گی کہ اس کُل براعظم میں کوئی ایک قدیمی قوم بھی اس قابل تھی کہ فنون زندگی میں کچھ معتدبہ ترقی یا اپنے یہاں ایک معین اور مستقل سوسائٹی کا نظم درست کرتی

اس حد تک تو ہم نے اُن ارکان طبیعی کا بیان کیا جو شمال امریکہ کی ابتدائی قسمتوں کا فیصلہ کرتے رہے تھے۔ لیکن جنوبی امریکہ کے بارہ میں حالات واسباب کا ایک جدا اگانہ

سلسلہ اپنا عمل کرتا رہا ہے۔ کیونکہ جس قانون کی رو سے سواحل شرقی بہ نسبت سواحل غربی کے سرد تر ہیں وہ صرف یہی نہیں ہے کہ جنوبی نصف الارض پر چسپاں نہیں ہوتا بلکہ اسکی جگہ ایک اور قانون نے لی ہے جو بالکل اُس کا عکس ہے۔ خط استوا کے شمال میں مشرق بہ نسبت مغرب کے زیادہ سرد ہے لیکن خط استوا کے جنوب میں وہ زیادہ گرم ہے۔ اب اگر ہم اس واقعہ کو اُس حالت سے ملاتے ہیں جس کا تعلق اُس وسیع سلسلہ آبی سے ہے جو امریکہ کے حصہ شرقی کو حصہ غربی سے ممیز کرتا ہے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جنوبی امریکہ میں حرارت و رطوبت کی وہ یکجائی پائی جاتی ہے جس کی شمالی امریکہ میں کمی ہے اور انجام یہ ہے کہ جنوبی امریکہ کا شرقی حصہ اپنی سیرابی اور زرخیزی کے سبب سے نہ صرف منطقۂ حارہ میں بلکہ اُس سے بہت آگے بڑھکے بھی نہایت معروف و ممتاز ہے۔ یعنی برازل[۵۵] کے جنوب میں بلکہ اُروگوے کے ایک حصہ میں وہ شادابی ہے کہ جس کا شمالی امریکہ کے کسی مُلک میں (اگرچہ وہ اُسی کے مطابق عرض البلد میں کیوں نہ ہو) کہیں پتہ نشان بھی نہیں۔

مندرجۂ بالا کلیات پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ اُمید ہو سکتی ہے کہ چونکہ جنوبی امریکہ کا شرقی حصہ فیضان فطرت سے اس طرح معمور ہے اس لیئے جس طرح کے تمدن دیگر قطاع عالم میں اسی قسم کے حالات اور اسباب سے ظہور پذیر ہوا کیئے ہیں ویسے ہی ایک تمدن کا مستقر وہ بھی ہوگا۔ لیکن اگر ہم ذرا آگے بڑھ کے نظر ڈالیں گے تو ہمکو معلوم ہوگا کہ جو کچھ ابھی بتایا گیا ہے اُس سے کسی طرح اُن تاثیرات طبیعی کا خاتمہ نہیں ہو گیا ہے جنکا پرتو اس مسئلہ پر پڑتا ہے اور یہ کہ ہمکو ابھی ایک تیسرے بڑے کارکن (طبیعی) پر غور کرنا چاہیے کہ جس نے ان دونوں ارکان طبیعی کے فطری نتائج کو اعتدال پر قائم رکھا ہے اور جسنے اُن مقامات کے باشندوں کو جنکو (اگر دوسری حالت ہوتی تو) نئی دنیا کے سب سے بڑھ کے خوشحال باشندے ہونا چاہیئے تھا جہالت اور وحشت سے نکلنے نہ دیا۔

[۵۵] برازل - جنوبی امریکہ کی نہایت وسیع مملکت ہے۔ یہ مقام دنیا کے اور مقامات کے مقابلے میں بلحاظ حالات طبیعی نہایت عجیب ہے یہاں نہ کوہ آتش فشاں ہیں نہ زلزلے آتے نہ قحط پڑتے ہیں۔ یہاں سونے اور ہیرے کی کانیں ہیں اور لوہا بھی نفیس قسم کا پایا جاتا ہے۔

یہ کارکن طبیعی جسکی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا ہے ٹریڈونڈ (ہوائے موسمی) ہے اور یہ ایسا آثار عجیبہ (یا عجیب الفعل کارکن) ہی جس سے (جیسا کہ ہم ابھی ثابت کریں گے) یورپ کے بعد کل تمدنوں پر نہایت عظیم اور ضرر رساں اثر پڑا کیا ہی۔ یہ ہوا خط استوا سے ۲۸ درجہ جانب شمال اور ۲۸ درجہ جانب جنوب یعنی کل ۵۶ درجہ عرض البلد تک چلا کرتی ہی۔ اس بڑے قطعہ میں جسکے اندر بعض نہایت ہی شاداب ممالک عالم داخل ہیں۔ یہ ہوا یا تو گوشۂ شمال و شرق سے یا گوشۂ جنوب و شرق سے سال بھر تک چلتی رہتی ہی۔ اس باقاعدگی کے اسباب اب اچھی طرح معلوم ہیں اور یہ دریافت ہو گیا ہی کہ وہ کچھ تو خط استوا کے نیچے ہوا کے ردوبدل اور کچھ زمین کی حرکت پر

۵۵ ٹریڈ ونڈ۔ واضح ہو کہ جسقدر ہوائیں کسی ملک میں چلتی ہیں وہ صرف درجات حرارت کے تغیرات کے سبب سے چلتی ہیں۔ مثلاً اگر دو مقاموں کے درجات حرارت کسی وجہ سے مختلف ہوں تو گرم تر مقام کی ہوا بہ نسبت سرد تر مقام کی ہوا کے زیادہ ہلکی ہو گی لہذا وہ اوپر آجائیگی اور اُسکی جگہ سرد تر ہوا بوجہ کثافت کے نیچے۔ اسی تبادلہ سے جو حرکت پیدا ہوتی ہے اُسے ہوا کے چلنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ پس درجات حرارت کے اس تغیر کی وجہ سے ہوا کی دو موجیں (یا دھارے) پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک سرد تر مقام سے گرم تر مقام کی طرف سطح زمین کے برابر برابر اور دوسری گرم تر مقام سے سرد تر مقام کی طرف فضائے عالم کی سطح بالا پر جاتی ہے اور یہ دونوں موجیں اُسوقت تک چلا کرتی ہیں جبتک اُنمیں معادلہ قائم نہیں ہوتی۔

اسی اصول پر منطقہ حارہ میں دو موجیں ہوا کی رہتی ہیں۔ ایک سطحی موج جو بلند تر عرض البلد سے خط استوا کیطرف چلتی ہی دوسری بالائی موج جو قطبین کی طرف چلتی ہی اب اگر زمین ساکن ہوتی تو شمالی نصف الارض میں شمالی اور جنوبی نصف الارض میں جنوبی ہوا ہمیشہ چلا کرتی لیکن چونکہ زمین اپنے محور پر مغرب سے مشرق کی طرف گھومتی رہتی ہی اس لیے اختلال واقع ہوتا ہے چنانچہ خط استوا کے شمال میں ہوا کی کشش دو طرف سے ہوتی ہی ایک اسے جنوب کی طرف کھینچتی ہے دوسری مغرب کی طرف اور تحلیل قوتین کے قاعدہ (جسکی رو سے دو متقابل کششوں میں پڑکے ہر شئے سمت وسطی اختیار کرتی ہی) کے بموجب وہ سمت وسطی یعنی گوشۂ شمال و شرق سے گوشۂ جنوب و غرب کی طرف چلتی ہی اسی کو ٹریڈ ونڈ (جسکے اصلی معنی ہیں ہوائے تجارتی) کہتے ہیں کیونکہ اس ہوا سے بحری مسافروں و تاجروں کو بہت سے منافع پہنچتے ہیں۔ اس ہوا کا اصلی زور صرف بحر الکاہل اور بحر اطلانٹک میں ہی۔ ۱۲

بنی ہیں کیونکہ قطبین سے علی الاتصال ہوائے سرد خط استوا کی طرف جاتی ہے اور اس سے شمالی نصف الارض میں شمالی اور جنوبی نصف الارض تک جنوبی ہوائیں چلا کرتی ہیں لیکن زمین کی حرکت کے سبب سے یہ ہوائیں اپنے بہاؤ کے اصلی رُخ سے پلٹا کھا جایا کرتی ہیں۔ کیونکہ زمین اپنے محور پر مغرب سے مشرق کی طرف گھومتی ہے۔ پھر چونکہ درحقیقت زمین بہ نسبت دوسرے حصوں کے خط استوا کے قریب زیادہ تیزی سے گھومتی ہے لہذا اُس کی سرعتِ رفتار خط استوا کے قریب اتنی بڑھ جاتی ہے کہ قطبین سے موسموں کی جو تحریکات ہوتی ہیں وہ اُن پر سبقت لے جاتی ہے۔ اور اُن کو دوسری سمت پر چلنے کے لیے مجبور کرکے وہ مشرق رویہ بہاؤ شروع کرتی ہے جو ٹریڈ ونڈ (ہوا موسمی) سے موسوم کی جاتی ہے۔ اب جس بات سے ہمکو اس وقت واسطہ ہے وہ ٹریڈ ونڈ (ہوائے موسمی) کی تشریح کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اس بات کا بتا دینا ہے کہ کس طور سے یہ عظیم آثار طبعی امریکہ کی تاریخ سے علاقہ رکھتا ہے۔

یہ ہوائے موسمی جنوبی امریکہ کے ساحل شرقی سے اُٹھ کے اور مشرق سے آگے بڑھ کے بحر اطلانٹک کو عبور کرتی ہے اور جب زمین پر آتی ہے تو اُن بخارات سے مملو ہو کے آتی ہے جو راہ میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ بخارات جب ساحل سے ٹکراتے ہیں تو وقتاً فوقتاً بادل کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں اور چونکہ مغرب کی طرف انکے بہاؤ میں (کوہستان) انیڈ کے عظیم الشان سلسلے کی وجہ سے ایک مزاحمت ہو جاتی ہے اور وہ اُس مزاحمت کو عبور نہیں کر سکتے لہذا وہ اپنی کُل رطوبات کو برازل پر نازل کر دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ برازل میں اکثر نہایت برباد کُن طوفان برپا ہو جاتے ہیں۔ بارش کی اس افراط نے اُس وسیع سلسلۂ دریائی سے جو شرقی حصۂ امریکہ کے واسطے مخصوص ہے) ملکے اور پھر حرارت نے مستزاد ہو کر برازل کی سر زمین میں ایسا جوش نمو پیدا کر دیا ہے کہ جس کی برابری دنیا کا کوئی دوسرا حصہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ برازل (جو قریب قریب اسقدر بڑا ہے جتنا کُل یورپ ہے اُس) میں نباتات کی وہ افراط ہے جس کا یقین نہیں ہو سکتا۔ حقیقت میں واں قوتِ نامیہ کا ایسا جوش ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے جیسے فطرت

اپنی قوّت کے زعم میں جامہ سے باہر ہوئی جاتی ہے"۔ اس وسیع ملک کا ایک بڑا حصہ نہایت گھنے گھنیرے اور پیچ در پیچ جنگلوں سے چھایا ہوا ہے۔ ان جنگلوں کے عمدہ درخت جو بنظیر خوشنمائی سے پھولتے ہیں اپنی رنگارنگی سے بہار کا ایک عالم دکھاتے اور اپنی پیداوار کو بحد فیاضی کے ساتھ زمین پر بکھراتے رہتے ہیں۔ اُنکی چوٹیوں پر ایسی چڑیاں چہچہاتی ہوتی ہیں جنکے پروبال کی رنگینی دبوقلمونی دل لبھاتی ہے اور جنکی خوش الحانیاں درختوں کے تاریک اور بلند گوشوں سے سامعہ افروز ہوتی ہیں۔ ان درختوں کے تنوں کے نیچے تھالوں کے اندر ایسی گھنی جھاڑیاں اور بیلیں زمین پر لوٹتی ہوئی اور شاخ در شاخ درخت تلے اوپر اُگے ہوے ہوتے ہیں جن کے رنگ برنگ پتے عجب بہار دیتے ہیں۔ پھر اُن کے نیچے لکھوکھا مختلف نوع اور جنس کے کیڑے کوڑے بھی ہوتے ہیں۔ عجیب و غریب قطع کے حشرات الارض۔ ناگ ناگنیں جاں ستاں خوشنمائی کے ساتھ کوڑیالے بنے ہوے چھپکلیاں اور گرگٹ گھڑی گھڑی رنگ بدلتے ہوے اور ان سب کو مبدأ فیاض کے اس عجیب کارخانے یا مودی خانے میں ازوقہ مل جاتا ہے اور تاکہ اس عالم طلسمات میں کسی بات کی کمی نہ رہ جائے انھیں جنگلوں کے حاشیوں میں ایسی بڑی چراگاہیں اور مرغزاریں ہیں جنھیں حرارت و رطوبت نے یکجا ہو کے وحشیان صحرائی کے بیشمار قطار جھنڈوں کے واسطے روزی کا سامان مہیا کر دیا ہے۔ یہ وحشیان صحرائی انھیں سبزہ زاروں میں چرائی کر کے موٹے تازے ہوا کرتے ہیں پھر قریب ہی کے میدانوں میں (جو زندگی اور روئیدگی کی دوسری صورت سے مالامال ہیں) نہایت ہی خوفناک اور نہایت ہی چست و چالاک درندوں کے منتخب مسکن ہیں جنھیں سے بعض ایک دوسرے کا شکار کرتے رہتے ہیں اور جن کی بابت (یہی معلوم ہوتا ہے کہ) کسی انسانی قوت سے اسکی توقع بھی نہیں ہو سکتی کہ وہ اُن کا استیصال کر سکے۔

یہ حالت ہے زندگی اور روئیدگی کی اُس افراط و فراوانی کی جس کے سبب سے برازیل کو تمام دیگر ممالک عالم پر فضیلت حاصل ہے لیکن فطرت کے اس شان و شکوہ کے اندر انسان کا کہیں ٹھکانا نہیں ہے اور جو عظم و شان اس کے گرد و پیش ہے اُس کے شکوہ میں وہ دب کے

رہ گیا ہے۔ کیونکہ جو قوتیں اُسکی مزاحمت کر رہی ہیں وہ اتنی خطرناک ہیں کہ وہ کبھی اس قابل نہ ہوا کہ اُن سے سر بر ہو سکتا اور اُن کے مجموعی غلبہ کے سامنے پامردی دکھاتا۔ اسی سبب سے باوجود بیحد کثیر المنفعت ہونے کی برازل ہمیشہ بالکل ہی غیر متمدن رہا اور وہاں کے باشندے خانہ بدوش وحشی بنے رہے۔ اُن میں کبھی بھی اتنی سکت نہ تھی کہ قدرت کی فیاضی کی وجہ سے جو مزاحمتیں اُنکے لیے سدراہ تھیں اُن کو دور کر سکتے۔ کیونکہ جس طرح اور کُل قومیں سوسائٹی کے عالم طفولیت میں کسی سعی بلیغ سے جی چُراتی ہیں وہی حال یہاں کے باشندوں کا بھی ہے اور چونکہ وہ اُن فنون سے نابلد ہیں جن سے طبیعی مزاحمتوں پر غلبہ حاصل کیا جاتا ہے اس وجہ سے اُنھوں نے کبھی اُن مشکلات کے مقابلہ کرنے کی کوشش ہی نہ کی جو اُنکی ترقی معاشرت میں سدراہ تھیں۔ حقیقت میں وہ مشکلات ایسی سخت ہیں کہ تین سو برس سے زیادہ زمانے سے یورپ کے علم و دانش کے تمام ساز و سامان اس سعی بیحاصل میں مصروف ہیں کہ اُن (مشکلات) کو دور کریں چنانچہ برازل کے ساحل کے قریب یورپ سے لاکے تھوڑا بہت وہ تمدن پھیلایا گیا ہے کہ جسے باشندگان مُلک خود اپنی کوشش سے کبھی پا نہیں سکتے تھے۔ لیکن ایسا تمدن (جو بجائے خود ناقص و ناکمل ہو) کبھی مُلک کے اندرونی حصوں میں نہیں پہونچ سکتا اور رگ و پے میں جاری نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ باوجود اس کے وہاں اب تک وہی حالت پائی جاتی ہے جو ہمیشہ سے چلی آتی ہے۔ باشندگانِ مُلک جاہل ہیں اور جاہل ہونے کی وجہ سے وحشی ہیں۔ نہ قید و بند کے پابند ہیں نہ کسی ضابطہ و قانون کو تسلیم کرتے ہیں۔ بلکہ اپنی اُسی پُرانی جاہلانہ وحشت پر قائم ہیں۔ اُن کے مُلک میں اسباب طبیعی اس قدر عمل پیرا ہیں اور وہ ایسی بے نظیر کشادہ دلی سے اُنکی خدمت کر رہے ہیں کہ اب تک تو یہ بات ناممکن معلوم ہوئی ہے کہ وہ لوگ اُنکے متحدہ عمل کے اثروں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ زراعت کی ترقی ناقابل گذار جنگلوں کی وجہ سے رُکی ہوئی ہے اور فصلیں جو تیار بھی ہوتی ہیں اُنھیں بیحد و شمار کیڑے مکوڑے ضائع کر دیتے ہیں۔ پہاڑ اتنے بلند ہیں کہ اُن پر کوئی چڑھ نہیں سکتا۔ دریا ایسے ذخار اور پایداد

ہیں کہ انیرپل بن نہیں سکتے - غرضکہ ہرشے اسی پر آمادہ ہے کہ طبیعت انسانی کو آگے بڑھنے نہ دے بلکہ پیچھے ہی پلٹا دے اور اُسکے بڑھتے ہوے حوصلہ کو دبا دے - اس طور پر فطرت کی قوتوں نے انسان کی ہمت کو پست کر رکھا ہے اور سوا اُس مقام کے اور کہیں یہ بات پائی نہیں جاتی کہ عالم طبیعی کے شان و شکوہ کے مقابلہ میں ذہن انسانی اسقدر حقیر و خوار نظر آتا ہو - اور چونکہ طبیعت انسانی ایسے غیر مساوی تنازع سے ہمت ہارے ہوے تھی اس وجہ سے صرف یہی نہیں ہوا کہ اُس نے کچھ ترقی نہ کی اور جولانی نہ دکھائی بلکہ اگر خارجی مدد نہ ملتی تو بیشک وہ رجعتِ قہقری ہی کرتی - کیونکہ اب بھی جبکہ یورپ کی ترقیاں علی الاتصال وہاں پہونچائی جاتی ہیں خود اِس مُلک میں اصلی ترقی کی کوئی علامت نظر نہیں آتی - باوجودیکہ کثرت سے نوآبادیاں قائم کی گئی ہیں پھر بھی ہنوز زمین کے پچاسویں حصہ سے بھی کم زیر زراعت ہے اور باشندگان مُلک کے عادات و اطوار ویسے ہی وحشیانہ ہیں جیسے سدا سے چلے آتے ہیں اب اگر اُنکی تعداد کو پوچھو تو یہ بات خاص طور پر قابل تذکرہ ہے کہ برازل میں جہاں اسباب طبیعی سب سے زیادہ زبردست ہیں - جہاں حیوانات اور نباتات دونوں نہایت افراط سے ہیں - جہاں کی زمین عمدہ ترین دریاؤں سے سیراب ہے - اور جہاں کے سواحل نفیس ترین بندروں سے آراستہ ہیں - وہاں (اُس وسیع مُلک میں کہ جو رقبہ میں مُلک فرانس کا چھ گونہ ہے) ساٹھ لاکھ سے زیادہ آدمیوں کی آبادی نہیں ہے -

یہ حالات کافی طور سے اس کی توجیہ کرتے ہیں کہ کیا سبب ہے کہ برازل میں کسی نہایت ہی ناکمل تمدن کی کچھ بھی یادگاریں نہیں ہیں اور نہ کوئی شہادت اسکی موجود ہے کہ کسی زمانہ میں بھی وہاں کے باشندوں نے اپنے آپ کو (اُس حالت سے جسمیں وہ اُسوقت پائے گئے تھے - جبکہ پہلے پہل اُن کا مُلک دریافت ہوا تھا) کسی بہتر حالت میں پہونچایا تھا - لیکن برازل کے مقابلے ہی میں ایک اور مُلک ہے جو (اگرچہ اُسی براعظم میں اور ایک ہی عرض البلد کے تحت میں واقع ہے لیکن) دوسری قسم کے حالات طبیعی کا محکوم ہے اور اسی بنا پر وہ مقام جداگانہ قسم کے سوشل

نتائج کا منتظر رہا ہے - یہ مشہور و معروف سلطنت پیرو ہے جسمیں کُل جنوبی منطقۂ حارّہ کا ملک شامل تھا اور جو (ان حالات و اسباب سے جنکا ابھی بیان ہو چکا ہے) فطرتی طور سے جنوبی امریکا کا وہ فرد فرید قطعہ تھا جسمیں کوئی ایسی حالت جو تمدن کی حد تک پہونچتی ہو پائی جا سکتی تھی - برازل میں اقلیم کی حرارت کے ساتھ آبپاشی کا دوہرا سامان موجود تھا یعنی اولاً وہ مجمع الانہار (یا سلسلۂ دریائی) جو ساحل شرقی میں واقع ہو گیا تھا اور ثانیاً وہ کثیر رطوبت جو ٹریڈ ونڈ (ہوائے موسمی) کے ذریعہ سے جمع ہو جاتی تھی - اسی یکجائی سے ایسی بینظیر شادابی اور سیرابی پیدا ہوئی کہ جس نے اپنے بے انتہا جوش نمو سے (جہانتک انسان کو تعلق تھا) انسان کی ترقی کو روک کے اپنی علت غائی کو پورا نہ ہونے دیا - حالانکہ اگر یہ افراط نہ ہوتی تو انسانی ترقی میں اُسی سے مدد پہونچتی کیونکہ (جیسا ہمنے وضاحت سے بیان کیا ہے) جب فطرت کی قوت پیداوار ایک حد معین سے آگے بڑھتی ہے تو غیر متمدن لوگوں کی ناقص معلومات اُسے احاطہ نہیں کر سکتی اور اُسے اپنے مفید مطلب نہیں بنا سکتی - پھر چونکہ قولے فطرت نہایت کارگزار ہوتی ہیں اس لیے اگر کسی طور سے وہ ایسی حدود میں محدود کر دی جاتی ہیں جن پر دسترس ہو سکتا ہے تو وہاں ایسی صورت معاملات پیدا ہو جاتی ہے جیسے ایشیا اور افریقہ میں پیش نظر ہو چکی ہے کہ جہاں فطرت کی فیاضی نے دولت کی فراہمی کا (جسمیں سے حصہ پائے بغیر ترقی کرنا ناممکن ہے) سامان کر کے سوشل ترقی کو روکا نہیں بلکہ اور اُسے آگے بڑھا دیا -

پس اب اگر اُن حالات طبیعی کا تصفیہ کرنا ہو جنکی وجہ سے ابتداءً تمدن نے ایک راہ اختیار کی تو ہمکو صرف فطرت کی فیاضی پر نظر نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ انسان کے قابو میں آنے کی صلاحیت کس قدر رکھتی ہے یعنی یہ کہ جس طرح ہم کل ساز و سامان کی مقدار و کمیت پر غور کرتے ہیں اُسی طرح اس امر پر بھی نظر کرنا چاہیے کہ اُس ساز و سامان کو استعمال میں لانے کے واسطے آسانی کس قدر حاصل ہے - اب اگر ہم یہ اصول مکسیکو اور پیرو کے ملکوں پر منطبق کرتے ہیں تو ہمکو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں بس یہی دو ملک ایسے تھے جہاں یہ ترکیب نہایت

حسن کے ساتھ واقع ہوگئی تھی (یعنی وہاں ساز و سامان بھی وافر موجود تھے اور اُنکو کام میں لانا بھی آسان تھا اور کچھ دشوار نہ تھا) کیونکہ اگرچہ وہاں یہ ساز و سامان برازل سے بہت ہی کم تھے لیکن جس قدر تھے اُنپر قابو پا جانا بہت زیادہ سہل تھا - پھر اسی کے ساتھ ہی حرارت طبعی کے سبب سے اُن دیگر قوانین نے اپنا فعل شروع کیا جن سے کُل ابتدائی تمدن (جیسا میں نے ابھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہی) بہت ہی متاثر ہوے ہیں - یہ بات نہایت قابل غور ہے اور میرا یہ خیال ہے کہ اب تک اُسپر کسی نے توجہ نہیں کی ہے کہ بلحاظ عرض البلد کے بھی پیرو کی موجودہ حدِ جنوبی میکسیکو کی قدیم حدِ شمالی کے مطابق ہے - پھر ایک عجیب (مگر میرے نزدیک بالکل قدرتی) اتفاق یہ ہے کہ دونوں سرحدیں منطقۂ حارّہ کے طے ہونے سے پیشتر مل جاتی ہیں - یعنی میکسیکو کی سرحد درجہ ۲۱ شمالی عرض البلد ہے اور پیرو کی درجہ ۲۱ جنوبی عرض البلد[۵۲]-

یہ ہے وہ حیرت انگیز نظام جسے تاریخ ہمارے پیشِ نظر کرتی ہے بشرطیکہ ہم تاریخ کا مطالعہ وسعت نظر کے ساتھ کریں - اور اگر ہم میکسیکو اور پیرو کا مقابلہ پُرانی دنیا کے اُن ملکوں سے کریں گے جن پر ہم نظر ڈال چکے ہیں تو ہمکو یہ معلوم ہوگا کہ اُن سب تمدنوں کی طرح جو یورپ کے تمدنوں سے مقدم ہوئی ہیں اُن کی سوشل آثار بھی وہاں کے قوانین طبعی کے تابع رہے ہیں - سب سے پہلے مثلاً اُنکی قومی غذا کی خصوصیتیں جو نمایاں تھیں وہ بالکل وہی تھیں جو ایشیا اور افریقہ کے نہایت شاد و آباد مقامات میں تھیں - کیونکہ اگرچہ نئی دُنیا میں پُرانی دُنیا کے پرورش کنندہ (یا تغذیہ والی) نباتات میں سے بہت کم تھے لیکن اُنکی جگہ وہاں بالکل اُنھیں کے مشابہ ایسے میووں و ترکاریوں نے لے لی تھی کہ جو کھجوروں اور چاولوں کے ہمجنس تھے

[۵۲] واضح ہو کہ خط استوا سے جو ملک برابر فاصلوں پر شمال و جنوب میں واقع ہیں اُنکی آب و ہوا اپنی کیفیت میں بالکل یکساں ہونا چاہیے - البتہ وقتوں میں تقابل ہوگا یعنی اگر ایک مقام پر گرمی ہے تو دوسرے مقام پر جاڑا ہوگا - ایک مقام پر خزاں تو دوسرے مقام پر بہار ہوگی جو ممالک خط استوا کے بالکل قریب یا عین خط استوا کے نیچے واقع ہیں وہاں آٹھ فصلیں ہونا چاہیے یعنی دو بہاریں دو خزائیں وغیرہ - ۱۲

یعنی یہ کہنا چاہیے کہ اُن میں بھی وہی کثرت و افراط - وہی پیدائش میں سہولیت - اور وہی بعید معاوضہ ملنے کی سب شانیں تھیں اور اس وجہ سے وہاں بھی وہی سب سوشیل نتائج (جو ارزاں غذا سے حاصل ہوتے ہیں) ظاہر ہوے - مکسیکو اور پیرو میں اشیاے خوردنی میں سب سے زیادہ چھوٹی جوار کا چلن رہا ہے اور اُس کی بابت من جمیع الوجوہ ہم یہ تسلیم کرسکتے ہیں کہ وہ براعظم امریکہ کے واسطے مخصوص تھی - وہ کھجور اور چاول کی طرح زیادہ تر ایک گرم اقلیم کی پیداوار ہے اور اگرچہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ سات ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر اُگتی ہے لیکن چالیسویں منطقہ سے آگے شاذ ہی نظر آتی ہے اور درجات حرارت کے تنزل کے ساتھ ہی اُسکی رفتار بھی بسرعت گھٹتی چلی جاتی ہے - مثلاً نیو کلیفورنیا میں اُسکی اوسط پیداوار (یعنی ایک دانہ بونے سے جتنے دانے پیدا ہوتے ہیں) صرف ستر یا اسی گونہ ہے لیکن خاص مکسیکو میں بھی غلہ تین چار سو گونہ پیدا ہوتا ہے اور اگر اسباب مساعد ہوں تو آٹھ سو گونہ تک نوبت پہونچ جاتی ہے -

پس جن لوگوں کا ازوقہ ایسے غیر معمولی جوش نمو والے درخت سے بہم پہونچتا تھا اُنکو اسکی بہت کم ضرورت تھی کہ محنت و جفاکشی کی طرف اپنی ہمت مصروف کریں - اور خواہ مخواہ مشقت کرکے اپنے ہاتھ پانوں تھکائیں - پھر - اسی کے ساتھ ہی اُن کو اس کے پورے موقع حاصل تھے کہ اپنی تعداد بڑھاتے چلے جائیں اور اس طور پر اُن سب پولیٹکل اور سوشیل نتائج و ثمرات کو جلوۂ ظہور میں لائیں جو بالکل ان نتائج و ثمرات کے مشابہ ہوں جنکو ہمنے مصر اور ہندوستان کے تذکرہ میں بیان کیا ہو - ماورا اسکے - وہاں علاوہ جوار کے اور قسم کی غذائیں بھی ایسی تھیں کہ اُنپر بھی یہی خیالات چسپاں ہو سکتے ہیں - وہی آلو جسنے آئرلینڈ کی آبادی کی افزونی میں تحریک کرکے ایسے مضر نتائج پیدا کیے تھے اُسکی بابت یہ کہا جاتا ہے کہ اُس کا منبت (یا جاے پیدائش) ملک پیرو ہی تھا - اور اگرچہ اس بات کی تکذیب ایک نہایت مستند شخص نے کی ہے - لیکن پھر بھی ہمیں تو ذرا شک نہیں کہ

وہ پیرو میں اُسوقت بکثرت پایا گیا تھا جبکہ پہلے پہل اُس مُلک کو اہل یورپ نے دریافت کیا تھا۔ مکسیکو میں اہل اسپین کے آنے سے پیشتر کوئی شخص آلو کا نام بھی نہیں جانتا تھا لیکن مکسیکو اور پیرو دونوں مقامات کے باشندوں کی بسراوقات زیادہ ترکیلے کی پیداوار پہ تھی۔ اور یہ کیلا ایسا پھل ہے جس کی تولید مثل کی قوت ایسی عجیب و غریب ہو کہ اگر وہ واقعات جو ہمکو معلوم ہیں اور جنکی صحت و واقعیت لاکلام ہیں موجود نہ ہوتی تو کسی کو اُس کا یقین ہی نہ آتا۔ عجیب درخت امریکہ میں وہاں کے قوانین موسمی سے نہایت قریبی تعلق رکھتا ہو کیونکہ جس وقت حرارت ایک معین حد سے تجاوز کرتے ہیں اُس وقت انسان کی پرورش کے واسطے وہ ایک نہایت مفید شئے ثابت ہوتا ہے۔ اُسکی پرورش کنندہ قوتوں کے بارے میں اسی قدر کہنا کافی ہے کہ اگر وہ ایک ایکڑ زمین میں بویا جائے تو پچاس آدمیوں کی بسراوقات کے لیے کافی ہو۔ حالانکہ اگر یورپ میں اتنی ہی زمین میں گیہوں بوئے جائیں تو وہ صرف دو آدمیوں کے لیے کفایت کریں گے۔ اب اُسکی پیداوار کی افراط کے لحاظ سے دیکھو تو یہ تخمینہ کیا گیا ہو کہ (اگر اور سب حالتیں یکساں ہوں تو) اس کی پیداوار آلو سے چوالیس[۴۴] گونہ اور گیہوں سے ایک سو تینتیس[۱۳۳] گونہ زیادہ ہوتی ہے۔

اب یہ بات بہ آسانی سمجھ میں آجائیگی کہ کیا سبب تھا کہ کُل اہم امور کے لحاظ سے مکسیکو اور پیرو کے تمدن ٹھیک مشابہ تھے ہندوستان اور مصر کے تمدن سے ان چاروں ملکوں میں اور جنوبی ایشیا اور وسطی امریکہ کے اور بھی ملکوں میں اسقدر علم موجود تھا کہ جسے اگر یورپ کے معیار پر جانچیں تو وہ بالکل حقیر و قابل تحقیر ثابت ہو لیکن اگر اُس کا مقابلہ اُس جہالت بحت سے کریں تو جو اُن کے ہمسایہ ملکوں اور معاصر قوموں میں پھیلی ہوئی تھی تو وہ نہایت ممتاز نظر آئے۔ لیکن ان سب میں یہ معذوری تھی کہ جو تھوڑا سا تمدن درحقیقت اُن کے قبضے میں تھا وہ اُسے پھیلا نہیں سکتے تھے۔ اور اُن میں ہر ایک ایسا امر جو جمہوری خیال کے قریب بھی ہو بالکل معدوم تھا۔ ہر جگہ طبقۂ اعلیٰ والوں میں وہی ایک خودمختارانہ اور شخصی قوت چھائی ہوئی تھی اور طبقۂ ادنیٰ والونمیں

ایک وہی ذلیل غلامی و اطاعت - کیونکہ یہ کل تمدن (جیسا ہم ابھی صاف صاف دکھا چکے ہیں) چند اسباب طبعی سے اثر پذیر ہوئی تھی اور وہ اسباب اگرچہ دولت کی فراہمی کے واسطے موافق تھے لیکن دولت کو ٹھیک طرح سے تقسیم کرنے کے واسطے موافق نہ تھے اور چونکہ ہنوز انسان کا علم طفولیت کے عالم میں تھا اس وجہ سے یہ ناممکن تھا کہ ان کارکنان طبیعی کے مقابلہ میں کوئی جدو جہد کیجاتی یا عالم کے نظم و ترتیب پر جو اثر یہ کارکنان طبیعی پیدا کیا کرتے ہیں (اور جن کے کھوج لگانے کی کوشش ہیں نے کی ہے) اُن سے وہ باز رکھے جاتے - مکسیکو اور پیرو میں صنعت و حرفت نے (اور خاص کر اُس صنعت و حرفت نے جو دولتمند گروہوں کے عیش و آرام میں معین ہوتی ہے) نہایت فروغ پایا - چنانچہ طبقۂ اعلیٰ والوں کے مکانات آرائش کے سامانوں اور عمدہ کارگری کے برتنوں سے سجے ہوے اور اُن کے کمروں میں نفیس پردے لٹکے ہوے ہوتے - اُنکے ملبوس اور ذاتی بناؤ چناؤ کی چیزیں ایسی گرانبہا ہوتی تھیں کہ جنکی قیمت سُن کے حیرت ہوجاتی تھی - اُن کے جواہرات نہایت پُرآب و تاب اور نفیس و نادر شکل و صورت کے ہوتے تھے - اُنکی قیمتی قباؤں میں بہت ہی نایاب پر ٹکے ہوتے تھے کہ جو سلطنت کے دور و دراز مقامات سے لاکر جمع کر کے لائے جاتے تھے - اور یہ سب امور اس بات کی شہادت دیتے تھے کہ وہاں دولت بے اندازہ ہے اور وہ دولت نمود اور نمائش میں بیدریغ لُٹائی جاتی ہے - لیکن اِس مصروفِ آرایش و آسایش طبقہ کے نیچے عوام الناس کا دوسرا طبقہ تھا اور اُسکی جو کچھ حالت تھی اُسکا تصور بآسانی ہوسکتا ہے - پیرو میں کُل محاصل سرکاری یہی گروہ ادا کرتا تھا کیونکہ عمائد اور علماء ملت ٹکسوں سے مستثنیٰ تھے - چونکہ سوسائٹی کی ایسی حالت میں عوام الناس کے واسطے یہ ناممکن تھا کہ وہ دولت جمع کرتے اس لیے وہ مجبور تھے کہ اپنی ذاتی محنت سے دولت پیدا کریں اور حکومت کے کُل اخراجات کے متکفل ہوں - پھر اسی کے ساتھ ملک کے فرمانروا یہ بخوبی جانتے تھے کہ ایسے نظم حکومت کے ساتھ شخصی آزادی کے خیالات میل نہیں کھاتے اس لیے اُنھوں نے ایسے قوانین وضع کیے تھے

جن کے ذریعے سے نہایت ہی خفیف خفیف اُمور میں بھی آزادی افعال کی روک تھام کر دی گئی تھی۔ عوام الناس قوانین کی زنجیروں میں اس درجہ جکڑ دیے گئے تھے کہ وہ بغیر حکام وقت کی اجازت کے نہ اپنے مسکن تبدیل کر سکتے تھے نہ اپنے کپڑے بدل سکتے تھے۔ ہر ایک شخص کے واسطے قانون ہی نے وہ کاروبار بنا دیا تھا جو اُسے کرنا چاہیے تھا۔ وہ لباس بتا دیا تھا جو اسے پہننا چاہیے تھا۔ وہ عورت بتا دی تھی جس سے اُسے شادی کرنا چاہیے تھا۔ اور وہ مشاغل تفریح سمجھا دیے تھے جن میں اُسے اپنا دل بہلانا چاہیے تھا۔ باشندگان مکسیکو کے یہاں بھی صورت حال ایسی کچھ تھی۔ یعنی ایک ہی طرح کے حالات طبیعی سے ایک ہی طرح کے نتائج امور معاشرت میں پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ۔ نہایت ضروری امر خاص یعنی باشندوں کی حالت کے معاملے میں مکسیکو اور پیرو بالکل ایک دوسرے کا چربہ یا مثنے تھے۔ کیونکہ اگرچہ امور اختلافی بہت جزئی تھے لیکن اس بارے میں دونوں بالکل یکساں اور یکرنگ تھے کہ دونوں ملکوں میں دو ہی طبقے تھے اور طبقۂ اعلیٰ جابر اور طبقۂ ادنیٰ غلام تھا۔ یہ وہ حالت تھی جو مکسیکو میں اُس وقت پائی گئی تھی جبکہ اہل یورپ نے اُس کا سراغ لگایا تھا۔ اور یقیناً اسی حالت کی طرف وہ لوگ اپنے بہت ابتدائی زمانے سے مائل تھے۔ رفتہ رفتہ کرکے یہی امور ایسے ناقابل برداشت ہو گئے تھے کہ ہم نہایت قطعی شہادت کی رو سے یہ جانتے ہیں کہ عوام الناس میں (جفائیں جھیلتے جھیلتے اور سختیاں اُٹھاتے اُٹھاتے) جو عام ناراضی اور بددلی پھیل گئی تھی وہ فاتحان اسپین کی ترقی میں معاون ہو کے ایک سبب منجملہ اُن اسباب کے ہو گئی تھی جن سے سلطنت مکسیکو کے زوال میں تعجیل ہوئی۔

جس قدر یہ جانچ پڑتال آگے بڑھتی ہے اُسیقدر زیادہ حیرت انگیز مشابہت اُن ملکوں کے تمدنوں کی معلوم ہوتی ہے جو نفس انسانی کی ترقی کے معاملے میں عہد یورپ سے پیشتر پھلے پھولے ہیں۔ یورپ کے بڑے بڑے ملکوں میں ایک نیشن (قوم) کی تقسیم ذاتوں میں ناممکن تھی لیکن نہایت قدیم زمانۂ مصر و ہندوستان میں اور بظاہر فارس میں ایسی تقسیم موجود تھی۔ اور یہی ایک کارروائی

ایسی تھی جس پر سختی کے ساتھ پیرو میں عملدرآمد کرایا گیا تھا۔ اور یہ امر کہ ایسی کارروائی اُس وقت کی سوسائٹی کی حالت کے لحاظ سے کس قدر موزوں تھی اس بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مکسیکو میں بھی جہاں ازروے قانون ذات پات کوئی چیز نہ تھی یہ ایک سسٹم رواج ہوگیا تھا کہ ہر بیٹے کو اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرنا چاہیے۔ یہ ایک شان تھی اُس رُکی تھمی اور کنسروٹیو (قدامت پرست) طرز خیال کی جس نے (جیسا کہ ہم آگے چل کے دیکھیں گے) اُن سب ملکوں کو ممیز کر رکھا ہے جہاں طبقۂ اعلیٰ والوں کے ہاتھوں میں کل اقتدار رہا ہے اور اسی طرز خیال کی مذہبی شان وہ تھی جو قدامت سے اُس قلبی تقدس آبی (یا بزرگداشت) اور انقلاب سے اُس نفرت و بیزاری کے خیال میں ظاہر ہوئی تھی کہ جسے امریکہ پر جن لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں اُن میں سب بڑے مصنف نے نہایت خوبی سے یہ دکھایا ہے کہ ایک مشابہت درمیان مکسیکو اور ہندوستان کے باشندوں کے ہے اس میں اتنا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ جن حضرات نے مصر قدیم کی تاریخ کو مطالعہ کیا ہے اُنھوں نے وہاں کے باشندوں میں بھی اسی طرح کا رجحان پایا ہے۔ ولکنس (جس کی بابت یہ مشہور ہے کہ اُس نے مصر کے آثار اور یادگاروں پر نہایت توجہ صرف کی تھی) لکھتا ہے کہ وہ لوگ اور تمام قوموں سے زیادہ اپنی عبادت کے تبدیل نہ کرنے میں ضدی تھے اور ہیروڈوٹس جس نے مصر میں دو ہزار تین سو برس پیشتر سیاحت کی تھی ہمکو یقین دلاتا ہے کہ وہ لوگ اپنی قدیم رسموں کو تو قائم رکھتے تھے مگر کبھی نئی رسمیں اختیار نہیں کرتے تھے۔ ایک اور طرح سے اگر دیکھا جائے تو اُن دور اُفتادہ ممالک میں جو مشابہت تھی وہ مساوی طور سے دلچسپ تھی۔ کیونکہ بداہتہً وہ اُن اسباب سے پیدا ہوئی تھی جن پر ہم غور کر چکے ہیں کہ وہ دونوں میں قدر مشترک تھے۔ مکسیکو اور پیرو میں چونکہ طبقۂ ادنیٰ والے بالکل طبقۂ اعلیٰ والوں کے قبضہ و اختیار میں تھے اس وجہ سے وہاں بطور لازمی نتیجہ کے وہ فضول تضیع محنت ہوئی جسے ہم مصر میں معائنہ کر چکے ہیں اور جسکی شہادت اُن مندروں اور محلوں کے کھنڈروں میں بھی نظر آسکتی ہے جو اب تک ایشیا کے مختلف حصص میں پائے جاتے ہیں

باشندگان مکسیکو اور باشندگان پیرو دونوں نے بڑی بڑی عالیشان عمارتیں کھڑی کیں اور یہ عمارتیں اُسیقدر بیکار و فضول و بیکار تھیں جس قدر مصر کی عمارتیں تھیں اور ایسی عمارتیں کسی ملک میں اُسوقت تک قائم نہیں ہو سکتی ہیں جبتک کہ اُس ملک میں محنت و مشقت کا صلہ کافی نہ ہو اور اُس کا استعمال بیجا نہ کیا جائے اِن خود نمائی کی یادگاروں کی صحیح لاگت تو معلوم نہیں ہو لیکن یہ ضرور ہو کہ وہ بہت اور بے انداز ہوگی کیونکہ امریکہ والے لوہے کے فوائد اور استعمال سے بے خبر ہونے کے سبب سے اس قابل نہ تھے کہ اُن وسائل کو کام میں لاسکیں جنکے ذریعے سے بڑی بڑی عمارتوں کے بنانے میں محنت بہت کچھ بچ جاتی ہو۔ بہرنوع۔ کچھ ایسے جزئی امور محفوظ رکھے گئے ہیں جسے اس مسئلہ کا کچھ کچھ اندازہ مل جاتا ہے۔ مثلاً اُن کے بادشاہوں کے قصور و ایوان کو دیکھتے ہیں تو ہمکو معلوم ہوتا ہو کہ پیرو میں ایک شاہی محل کی تعمیر میں بیس ہزار آدمی پچاس برس تک مصروف رہے ہونگے اور مکسیکو کے قصر شاہی کی تعمیر میں دو لاکھ آدمیوں سے کم کی محنت صرف نہوئی ہوگی۔ یہ سراپا حیرت واقعات ہیں جو (اگر اور کُل شہادتیں نسیت دنابود بھی ہو جائیں تب بھی) ہمکو اس قابل کرتی ہیں کہ ہم اُن ملکوں کی حالتوں کا اندازہ کرسکیں جن میں ایسے خفیف اغراض کے واسطے اتنی زیادہ قوت صرف کیجاتی تھی۔

مندرجۂ بالا شہادت جو ایسے وسائل سے فراہم کی گئی ہے جن کے صحیح ہونے میں کچھ کلام ہو نہیں سکتا یہ ثابت کرتی ہے کہ اُن عظیم قوانین طبیعی کا زور کیسا تھا جنھوں نے یورپ سے باہر نہایت آسودہ و خوشحال ملکوں میں دولت فراہم کرنے میں تو اعانت مگر اُس کے نشر و تقسیم کی ممانعت و مزاحمت کی۔ اور جن کے سبب سے طبقۂ اعلیٰ والوں نے سوشیل اور پولٹیکل قوت و اقتدار کے ایک نہایت اہم جزو کو اپنا حق سمجھ لیا اور انجام یہ ہوا کہ اُن سب تمدنوں میں عوام الناس کے گروہ کثیر نے قوم کی ترقیوں سے کچھ بھی فائدہ نہ اُٹھایا اور اس وجہ سے چونکہ ترقی کی بنیاد نہایت ہی تنگ تھی اس لیے خود وہ ترقی بالکل مخدوش اور

بے ثبات تھی۔ پھر جب خارج سے کچھ اسباب ناموافق پیدا ہوگئے تو اُسوقت پورے سلسلے کا درہم برہم ہو جانا ایک نتیجۂ لازمی تھا۔ ایسے ملکوں میں چونکہ سوسائٹی میں باہم نزاع رہتی ہی اسوجہ سے اُس میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ قائم رہ سکے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ کہ جسوقت اصلی بربادی پیش آئی تھی اُس سے بہت پہلے یہ یک رُخے اور بیقاعدہ تمدن رُو بتنزل ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ اُنکی نکبت نے بیرونی حملہ آوروں کی پیش قدمی میں مددی اور اُن قدیم سلطنتوں کی بساط اُلٹنے میں اُن کی دستیاری کی جن پر اگر حکومت زیادہ عاقلانہ طریقہ کی ہوتی تو وہ آسانی سے بچ جاتیں اور اپنے حال پر قائم رہتیں۔

یہاں تک تو ہمنے اُس طریقہ کو بتایا ہے جس سے یورپ سے باہر کے بڑے بڑے ملکوں کے تمدن اپنے اپنے مقامات کی غذا۔ اقلیم اور سرزمین کی تاثیرات سے متاثر ہوا کیے ہیں۔ اب یہ باقی رہا ہے کہ میں اُن دیگر کارکنان طبیعی کی تاثیرات پر غور کروں جنکو میں نے بحیثیت مجموعی مناظر فطرت سے تعبیر کیا ہے اور جنسے اُس اثر کی بابت بعض وسیع اور محیط تحقیقاتوں کی طرف خیال رجوع ہو گا جو عالم خارجی اُس طور پر کرتا ہے کہ انسانوں میں بعض قسم کے طرز خیال کا رجحان پیدا کرکے مذہب۔ فنون لطیفہ اور علوم ادبیہ (یعنی مختصر الفاظ میں نفس انسانی کے خاص خاص شیون و مظاہر) کو ایک سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ اب اسکا تحقیق کرنا کہ یہ کیونکر واقع ہوتا ہے ایک ضروری تتمہ اُس تحقیقات کا ہے جو ابھی ختم ہوئی ہے کیونکہ جس طرح ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ اقلیم۔ غذا۔ اور سرزمین خصوصیت کے ساتھ دولت کے اجتماع اور تقسیم سے واسطہ رکھتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ مناظر فطرت خیالات کے اجتماع اور تقسیم سے واسطہ رکھتے ہیں۔ اول الذکر حالت میں ہمکو انسان کے مادّی فوائد اور معاملات سے سروکار رہتا ہے اور آخر الذکر حالت میں اُسکے عقلی فوائد و معاملات سے۔ اول الذکر کی تحلیل و تجزی اُس حد تک ہو چکی ہے جتنی میرے امکان میں تھی بلکہ غالباً اُس حد تک جتنی کہ موجودہ حالت معلومات اجازت دیتی ہے لیکن آخر الذکر (یعنے مناظر فطرت اور نفس

انسانی کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے اُس) میں ایسی وسعت بے پایاں والے تخیلات مضمر ہیں اور اُس کے واسطے اتنی شہادت کثیرہ ہر گوشہ وزاویہ سے درکار ہے کہ مجھے خود معلوم نہیں اُس کا حشر کیا ہوگا میں ہرگز یہ دعوے نہیں کرتا کہ میں اتنا بھی کرسکوں گا جسے ایک جامع و مانع تحلیل یا تجزی کے قریب قریب کہہ سکیں اور نہ مجھے امید ہے کہ میں اس سے کچھ بھی زیادہ کرسکوں گا کہ وہ جو ایک پیچیدہ اور ہنوز غیر منکشف (یا سربستہ) کارروائی جاری ہے (جس سے عالم تارجی نے نفس انسانی پر ایسا اثر ڈالا ہے کہ اُس کی قومی ترقیوں میں سدِّراہ ہوئی ہے اور اکثر اوقات اُسکی پیش قدمی کو روک دیا ہے) اُسکے بعض قوانین کو کلیات کے تحت میں لے آؤں۔

جب اس لحاظ سے مناظرِ فطرت پر نظر ڈالی جاتی ہے اُسوقت وہ دو قسموں میں منقسم معلوم ہوتے ہیں۔ پہلی صنف میں وہ ہیں جن میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ قوت تخئیل پر زیادہ اثر ڈالتے ہیں اور دوسری صنف میں وہ ہیں جو (اُس ملکہ کو جسے عرف عام میں فہم انسانی کہتے ہیں یعنی) محض عقل کے استدلال منطقی کو اپنا مخاطب بناتے ہیں کیونکہ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ایک کامل اور سلیم الطبع نفس میں قوت تخئیلیہ اور عقل دونوں اپنا اپنا کام کرتی ہیں اور ایک دوسرے کی معین و مددگار رہوتی ہیں لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اکثر مواقع پر عقل انسانی اتنی کمزور ہوتی ہے کہ وہ نہ قوت تخئیلہ کو زیر کرسکتی ہے نہ اُسکی خطرناک بیراہہ روی کو روک سکتی ہیں۔ روزافزوں تمدن کا رجحان اس طرف ہے کہ اس عدم تناسب (یا بے اعتدالی) کا علاج کرے اور قوائے استدلالیہ کو وہ قدرت تفویض کرے جو سوسائٹی کے عالم طفولیت میں کلیتہً قوت تخئیلہ کو حاصل ہوتی ہے۔ اب یہ بات کہ آیا اسکی کوئی وجہ ہے کہ اسکا اندیشہ کیا جائے کہ یہ جو کایا پلٹ ہو رہی ہے بے انداز تو آگے نہ جائیگی اور یہ کہ قوائے استدلالیہ موقع پاکے کہیں قوت تخئیلہ کو پامال تو نہ کر ڈالیں گے۔ یہ سوال نہایت قابل غور وخوض امور سے متعلق ہے لیکن اپنی معلومات کی موجودہ حالت میں غالبًا ہم اسے حل کر نہیں سکتے۔ بہرکیف۔ یہ یقینی ہے کہ ایسا

واقعہ اب تک کبھی پیش نہیں آیا ہے۔ کیونکہ اب اُس زمانے میں بھی جبکہ قوتِ تخئیلہ اسقدر قابو میں ہے جتنی کبھی قرون ماضیہ میں نہیں ہوئی تھی پھر بھی اسے بہت کچھ قوت اور قدرت حاصل ہے اور یہ بات بآسانی صرف اُن توہمات سے ثابت ہوتی ہے جو ہر ایک ملک میں اب بھی دائر سائر ہیں بلکہ قدامت (یا زمانۂ قدیم) کی بابت اُس شاعرانہ تقدس آبی کے خیال سے بھی ثابت ہوتی ہے جو اگرچہ عرصہ سے زوال پذیر ہے پھر بھی آزادی کا خون اور قوت ممیزہ کی آنکھیں بے نور کر رہا ہی اور تعلیم یافتہ جماعت کی جدت طرازی کا گلا گھونٹ رہا ہے۔

پس جہانتک کہ آثار فطری کا تعلق ہے یہ واضح ہے کہ جس شئے سے ہول و دہشت یا استعجاب و حیرت کے خیالات برانگیختہ ہوتے ہیں یا جس شئے سے نفس انسانی میں کسی مجہول الکنہ ہستی مطلق کا تصور پیدا ہوتا ہے اُس میں ایک خاص میلان قوت تخئیلہ کے مشتعل کرنے اور زیادہ تر وسیعے اور سوچے سمجھے افعال انسانی کو اپنے تحت میں لانے کا ہوتا ہے۔ ایسی صورتوں میں جب انسان اپنا مقابلہ فطرت کی شان و شوکت سے کرتا ہے تو نہایت حسرت کے ساتھ اُسے خود اپنی ہیچمیرز ہیچکارہ ہونے کا ادراک۔ اور اپنی مغلوبیت کا خیال اُسپر مستولی ہوتا ہی ہر طرف سے بیحد و بیشمار مزاحمتیں اُسے گھیر لیتی اور اُسکی ذاتی مرضی کو محدود و مقید کر دیتی ہیں اُسکی طبیعت ایک اَن بوجھے اور سمجھ میں نہ آنے والے تصور سے مرعوب ہو کے اُسکی پروا نہیں کرتی کہ اُن جزئیات کو بہ تفصیل دیکھے جس سے اس دلفریب شکوہ و شان نے ترکیب پائی ہے۔ پھر دوسری طرف۔ جہاں فطرت کے کام حقیر و ناتوان ہیں وہاں انسان کو اپنے خیال پر اطمینان و اعتبار حاصل ہوتا ہے۔ وہاں اُسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنی قوت پر بھروسہ کر سکتا ہے۔ گویا وہ ہر طرف آزادی سے ہاتھ پاؤں چلا سکتا اور ہر سمت میں اپنا سکہ جما سکتا ہے۔ اور چونکہ وہ آثار زیادہ تر اُسکے دسترس سے باہر نہیں ہوتے ہیں اسوجہ سے اُسکے لیے یہ بھی آسان ہوتا ہے کہ اُنکے اوپر تجربے اور آزمائشیں کرے یا بہ تفصیل و تشریح اُنپر غور کرے اور اس غور و فکر سے جس طبیعت میں تحقیق و جستجو کی کاوش ہوتی ہے اُس کی

ہمت بڑھتی ہے اور وہ اس امر پر آمادہ ہوجاتی ہے کہ مناظر فطرت کی بابت کلیات قائم کرے اور اُن کلیات کو ایسے قوانین سے پیوند دے جنکے وہ تابع اور محکوم ہوتے ہیں۔

جب ہم اس طور سے نفس انسانی پر (جس حیثیت سے کہ وہ مناظر فطرت سے متاثر ہوتا ہے) نظر ڈالتے ہیں تو بیشک ہمکو یہ طرفہ ماجرا نظر آتا ہے کہ کُل بڑے بڑے ابتدائی تمدن یا تو منطقۂ حارّہ کے اندر یا بالکل اُس سے متصل واقع ہوے تھے اور وہیں یہ منظر فطرت نہایت ارفع و اعلیٰ اور نہایت مہیب واقع ہوے ہیں اور وہیں (علی العموم) فطرت ہر ایک حیثیت سے انسان کے واسطے نہایت ہی ہولناک ہی۔ حقیقت یہ ہی کہ ایشیا۔ افریقہ اور امریکہ میں عالم خارجی بہ نسبت یورپ کے کہیں زیادہ خوفناک ہے اور یہ بات صرف اُن مستقل اور معین آثار (جیسے پہاڑ یا اور بڑے بڑے قدرتی حدود فاصل) تک موقوف نہیں بلکہ اتفاقی اور ناگہانی آثار (جیسے زلزلے۔ طوفان۔ آندھیاں اور وبائیں کہ جنمیں سے ہر ایک اُن ملکوں میں اکثر وقوع پذیر ہوتے اور نہایت تباہی لاتے ہیں) کے بارے میں بھی صحیح اُترتی ہے۔ یہ متواتر اور سنگین خطرات ویسے ہی اثر پیدا کرتے ہیں جیسے اثر فطرت کی شان و شوکت پیدا کرتی ہے۔ اس لحاظ سے کہ دونوں میں اسکا میلان ہوتا ہی کہ قوتِ تخیلیہ کی تحریک کو ترقی دیں۔ وجہ یہ ہی چونکہ قوتِ تخیّلیہ کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ نامعلوم امور سے سروکار رکھے تو ہر ایک واقعہ و حادثہ جسکی توجیہ نہیں ہوئی ہی اور جو اہم ہے وہ ہمارے قواے تخیل کو براہِ راست اشتعالک دینے والا ہے۔ چونکہ منطقۂ حارہ میں اس قسم کے حوادث اور سب مقامات کے بہ نسبت زیادہ واقع ہوتے ہیں اس لیے نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ منطقۂ حارّہ میں قرینہ غالب یہی ہے کہ قوت تخیّل کے ہاتھ میدان رہے۔ اس اصول کی عملی کارگزاری چند مثالوں سے واضح و لائح ہو جائے گی اور ناظرین کو اُن دلائل کے واسطے تیار کر دے گی جو انھیں مثالوں پر مبنی ہیں۔

وہ حوادث طبیعی جو انسان کی امن وعافیت میں خلل ڈالتے اور اسے مضطر کرتے ہیں

اُن میں سب سے حیرت خیز زلزلے ہیں۔ اس حیثیت سے کہ اُن میں جانیں کتنی ضائع ہوتی ہیں اور اس لحاظ سے بھی کہ وہ بالکل یکایک اور بالکل بے شان و گمان واقع ہوتے ہیں۔ اور اس بات کے باور کرنے کے وجوہ موجود ہیں کہ زلزلوں کے آنے سے پیشتر ہمیشہ فضاے عالم میں کچھ انقلابات ہوتے ہیں کہ جو فوراً نظام اعصابی پر اثر ڈالتے ہیں اور اس طور سے اُن میں یہ میلان طبیعی ہوتا ہے کہ قواے عقلی میں فتور پیدا کر دیں۔ بہر نوع۔ یہ چاہے جو کچھ بھی ہو اس میں تو کچھ شک ہو نہیں سکتا کہ بعض خاص قسم کی عادات اور سلسلۂ خیالات کے طیار کرنے میں اُن کا کیا اثر پڑتا ہے۔ اُنکے سبب سے جو ہیبت طاری ہوتی ہے وہ قوت تخیلہ کو تکلیف دہ درجے تک برانگیختہ کرتی ہے اور جب وہ قوت فیصلہ کو جادۂ اعتدال سے منحرف کر چکتی ہے تو اُسوقت وہ انسان کا رجحان تصورات وہمی کی طرف پیدا کر دیتی ہے۔ اس سے بھی بڑھ کے جو بات عجیب ہے وہ یہ ہے کہ جس قدر ان حوادث میں تکرار اور اعادہ ہوتا ہے وہ بجاے اس کے کہ ان تصورات وہمی کو باطل ثابت کرے اُنھیں اور مضبوط ثابت کرتا رہتا ہے پیرو میں جہاں اور کُل ملکوں کے بہ نسبت زلزلے اکثر آیا کرتے ہیں ہر مرتبہ جب زلزلہ آتا ہے وہ عام حسرت و نامرادی کو اور بڑھا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ بعض صورتوں میں اتنی ہول پیدا ہو جاتی ہے کہ جو روکے نہیں رُکتی۔ اس طور سے انسانی صحت متواتر ایک خلجان۔ بیم و ہراس۔ اور بُزدلی کی حالت میں پڑ جاتی ہے۔ اور جب انسان ایسے خطرے دیکھتے ہیں کہ جن کو نہ وہ ٹال سکتے ہیں نہ سمجھ سکتے تو اُنکے قلوب پر خود اپنی ناقابلیت کا یقین اور اپنے سامانوں کی غربت و بے مائگی کا خیال نقش ہو جاتا ہے۔ جس قدر یہ خیال دل میں گھر کرتا ہے اُسی قدر قوت تخیلہ بیدار اور مصروف بکار ہوتی ہے اور اُسی قدر ما فوق الفطرۃ مداخلت کا عقیدہ مضبوط اور مستحکم ہوتا ہے۔ جب انسانی قوت کام نہیں دیتی تو ما فوق انسانی (یعنی قوت انسانی سے بالاتر) قوت جگہ لے لیتی ہے۔ اور پردۂ اسرار کی چیزیں جو نظر نہیں آتیں انکا عقیدہ قائم ہو جاتا ہے اور (نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ) انسانوں میں خوف و دہشت اور مجبوری و بیچارگی کے وہ خیالات

پیدا ہو جاتے ہیں جن پر کل توہمات باطلہ مبنی ہیں اور جن کے بغیر کسی وہم یا وسواس کا پتہ بھی نہیں لگ سکتا۔

اسکی مزید مثال یورپ میں بھی مل سکتی ہے جہاں نسبتاً ایسے آثار بہت ہی شاذ و نادر ہیں لیکن وہاں بھی اور دوسرے بڑے بڑے ملکوں کی بہ نسبت ملک اطالیہ اور جزیرہ نماے اسپین و پرتگال میں زلزلے اکثر واقع ہوتے ہیں اور آتش فشاں مادوں کا خروج اکثر ہوا کرتا ہے اور ٹھیک یہی وہ مقام ہیں جہاں توہمات بیجا بہت دائر سائر رہتے ہیں۔ اور وہم پرست گروہوں کو بہت رسوخ و اقتدار حاصل رہا ہے۔ یہی ملک وہ تھے جہاں علماء ملت نے سب سے پہلے اپنے سکے بٹھائے جہاں مذہب عیسوی میں بدترین خرابیاں پیدا ہوئیں اور جہاں سب سے زیادہ عرصۂ ممتد تک توہمات باطلہ نہایت مضبوطی سے قدم جمائے رہے۔ اسی کے ساتھ ایک حالت اور اضافہ کیجا سکتی ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آثار طبیعی کو قوت تخیلیہ کے غلبہ و تفوق سے کیا تعلق ہے۔ عام طور سے کہا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ فنون لطیفہ زیادہ تر قوت تخیلیہ سے سروکار رکھتے ہیں اور علوم تجربیہ (سائنس) عقل سے۔ اس جگہ یہ بات قابل تذکرہ ہے کہ کل اعلیٰ درجے کے باکمال مصور اور قریب قریب کل بڑے بڑے نقاش جو زمانۂ حال کے یورپ نے پیدا کیے ہیں وہ سب یا تو جزیرہ نماے اسپین کے تھے یا جزیرہ نماے اطالیہ کے۔ اب بلحاظ علوم تجربیہ کے بھی اسمیں شک نہیں کہ اطالیہ میں بعض اشخاص ممتاز قابلیت کے گذرے ہیں لیکن جب وہاں کے مصوروں اور نقاشوں اور شاعروں کے ساتھ وہاں کے علماے علوم عقلیہ کا مقابلہ کیا جاتا ہے تو اُن لوگوں کی تعداد اتنی کم ٹھہرتی ہے کہ دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں معلوم ہوتی۔ اب اسپین و پرتگال کو لیجیے تو ان دونوں ملکوں کی ادب و انشا نمایاں طور سے شاعرانہ ہے اور وہاں کے مدرسوں سے بعض ایسے مصور نکلے ہیں جو دُنیا میں یگانۂ روزگار تھے۔ برعکس اسکے انھیں مقامات میں نرے کھرے قواے استدلالیہ کی ترقی دینے میں ایسی بے التفاتی کی گئی کہ کل جزیرہ نما نے ازل سے لیکر اسوقت تک کوئی ایک نام بھی

علوم طبیعی میں کمال پیدا کرنے والے کا تاریخ میں ایسا یادگار نہیں چھوڑا جو اعلیٰ درجے کا شمار
ہوا ہو اور کوئی ایک آدمی بھی وہاں ایسا نہ نکلا جس نے معلومات یورپ کی ترقی میں کوئی
عصر جدید شروع کیا ہو۔

جس طور سے مناظر فطرت (جبکہ وہ نہایت ہولناک ہوتے ہیں) قوت تخیلہ کو برانگیختہ
کرتے اور توہمات باطلہ کو پیدا کر کے علم کی سدِّراہ ہوتے ہیں وہ دو ایک مزید واقعات سے
اور زیادہ واضح ہو سکتا ہے۔ ایک جاہل گروہ میں براہِ راست ایک ہیجان اس جانب ہوتا ہے
کہ کل سنگین خطرات و مصائب کو ما فوق الفطرۃ مداخلت پر محمول کرے اور جب اس طرح سے
ایک مضبوط مذہبی خیال بھڑک اُٹھتا ہے تو متواتر یہ واقع ہوتا ہے کہ نہ صرف وہ مصیبت جھیل
لیجاتی ہے بلکہ حقیقت میں اُس مصیبت کی پرستش کیجاتی ہے۔ ملابار کے جنگل کے بعض ہندؤوں
کی یہی حالت ہے اور جس شخص نے وحشی جرگوں کے حالات مطالعہ کیے ہیں اُسکو اسی قسم کی اکثر
مثالیں نظر آئی ہونگی۔ حقیقت میں اسکا یہاں تک اثر ہے کہ بعض ملکوں میں باشندگانِ مُلک عظمت
آمیز خوف و دہشت کے خیال سے وحوش صحرائی اور خوفناک حشرات الارض کو مارنے سے
احتراز کرتے ہیں اور جس قدر ایذارسانی ان موذی جانوروں کے ہاتھوں ہوتی ہے وہ اُنکے اِس
بقا و تحفظ کی بدولت ہوتی ہے جسکی وجہ سے وہ بے دغدغہ مارے مارے پھرتے ہیں۔

اِس طریق پر اگلے منطقۂ حارّہ والے تمدنوں کو ایسی بعید و بیشمار مشکلات سے سابقہ پڑا ہے
جس سے منطقۂ معتدلہ کے رہنے والے خبر بھی نہیں ہیں کہ جہاں یورپ کا تمدن عرصے سے پھل پھول
رہا ہے منطقۂ حارّہ والے تمدنوں میں دشمن انسان جانوروں کی خونخواریاں۔ ابر و باد کے
طوفان۔ زلزلوں۔ اور اسی قبیل کی دیگر آفات و بلیّات کی دست درازیاں علی التواتر وہاں کے
باشندوں کے نقش خاطر ہوتی رہتی ہیں اور اُن سے قوم کی سیرت و خصلت میں ایک خاص شان
پیدا ہو گئی ہے کیونکہ اُن لوگوں کو جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اُن میں جان جوکھم کا ادنیٰ
مرتبہ یہ تھا کہ زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ اور اصلی خرابی یہ تھی کہ طبیعتوں میں وہ نظام سما گیا تھا

کہ جس نے قوت تخیلیہ کو عقل پر فائق کر دیا تھا اور لوگوں میں بجائے تحقیق و تفتیش کی کُرید کے تقدس کا خیال دلنشیں اور اُن کے نفوس میں یہ میلان پیدا کر دیا تھا کہ اسباب طبیعی کی تحقیق و جستجو کو تو نظر انداز کریں اور کُل حوادث کو مافوق الفطرۃ دست اندازی کے عمل سے منضم کر دیں۔

جس قدر حال اُن ملکوں کا ہمکو معلوم ہے اُسکی ہر بات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ رجحان کتنا کارگزار ہوگا۔ چند نہایت شاذ مستثنیات سے قطع نظر کر کے دیکھو تو بمقابلۂ منطقۂ معتدلہ کے منطقۂ حارہ کے موسموں میں صحت و تندرستی نہایت نازک حالت میں ہوتی ہیں اور بیماریاں عام۔ پھر۔ اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے اور بیشک یہ ایک کُھلی ہوئی بات ہے کہ انسان جتنا موت کے خوف سے مافوق الفطرۃ امداد کا خواہاں و جویاں ہوا کرتا ہے اتنا اور کسی بات سے نہیں ہوتا۔ عالم آخرت کے بارے میں ہماری جہالت ایسی تام ہے کہ یہ کوئی عجیب بات نہیں اگر مضبوط سے مضبوط دل میں اُس تاریک اور بے جانے بوجھے مستقبل کے یکایک سر پر آجانے سے سکتے میں ہو جائے۔ اس معاملے میں عقل بالکل ساکت ہے اور اسی وجہ سے قوت تخیلہ حد سے زیادہ اپنی بلند پروازی دکھاتی ہے۔ جب اسباب فطری کا عمل ختم ہو چکتا ہے اُسوقت (یہی خیال کیا جاتا ہے کہ) مافوق الفطرۃ اسباب کا دورہ شروع ہوتا ہے۔ اِسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جس شے سے کسی ملک میں مہلک بیماریوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے اُس میں فی الفور ایک میلان توہمات باطلہ کے استوار کرنے اور عقل کو زیر کر کے قوت تخیلہ کو بالا کر دینے کا ہوتا ہے۔ یہ اصول اسقدر عالمگیر ہے کہ دنیا کے ہر حصے میں وہ بیماریاں جو مخصوص طور سے مہلک ہیں اور علی الخصوص وہ جن کا ظہور یکایک اور بے نشان و گمان ہوتا ہے اُن کو عوام الناس ایزدی مداخلت پر محمول کرتے ہیں۔ اگلے زمانے میں یورپ والے یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ہر ایک وباء عام قہر ایزدی کی ایک شان ظہور ہوتی ہے اور اگرچہ یہ رائے اب عرصے سے مٹ رہی ہے لیکن نہایت متمدن ملکوں میں بھی ہنوز بالکل معدوم نہیں ہو گئی ہے۔ بیشک اس قسم کا توہم وہیں زیادہ قوی ہوتا ہے جہاں یا تو علم طب کی معلومات نہایت پچھڑی ہوئی حالت میں ہونگی

یا بیماریاں زیادہ کثرت سے ہوں گی۔ جن ملکوں میں یہ دونوں شرطیں پائی جائیں گی وہیں توہمات باطلہ کے ڈنکے بجتے ہونگے اور جہاں کہیں کوئی ایک شرط بھی پائی جائیگی وہاں بھی یہ رجحان ایسا ہی بے پناہ ہوگا۔ میری دانست میں کوئی وحشی گروہ ایسا نہیں ہے کہ جو نہ صرف غیر معمولی بیماریوں کو بلکہ اکثر معمولی بیماریوں کو بھی (جن میں وہ مبتلا ہوتے رہے ہیں) اپنے نیک یا بد معبودوں پر محمول نہ کرتا ہو۔

اب اِس مقام پر ہم ایک اور نمونہ اُس ناموافق تاثیر کا پاتے ہیں جو اگلے تمدنوں میں عالم خارجی نے نفس انسانی پر کی تھی کیونکہ ایشیا کے ملکوں میں اعلیٰ درجے کی شائستگی تک نوبت پہونچگئی تھی وہی ملک مختلف اسباب طبیعی کی وجہ سے یورپ کے اکثر متمدن حصص سے بڑھ چڑھ کے مضر صحت و تندرستی ہیں اور تنہا اسی واقعہ نے قومی سیرت و خصلت پر معتد بہ اثر ڈالا ہوگا۔ زیادہ تر اس لیے کہ اُسکی تائید اُن دیگر حالات سے ہوئی ہو گی جنکو میں بیان کر چکا ہوں اور جو سب کے سب ایک ہی رُخ پر مائل ہیں۔ اس میں اتنا اور اضافہ کیا جا سکتا ہو کہ وہ بڑی بڑی وبائیں جن سے متعدد قرون میں یورپ تباہ ہوا کیا ہے بیشتر ممالک مشرقیہ سے شروع ہوئی تھیں کیونکہ وہی مقامات اُسکے فطری مولد و منشا ہیں اور وہیں اکثر جانستاں ثابت ہوتی ہیں۔ حقیقت میں جس قدر سخت بیماریاں فی الحال یورپ میں موجود ہیں اُن میں مشکل کوئی ایک ایسی ہو گی جو وہیں پیدا ہوئی ہو اور اُن میں سے جتنی بد ترین علالتیں ہیں وہ منطقۂ حارہ کے ملکوں سے پہلی صدی عیسوی میں اور اُسکے بعد آکے پھیلی ہیں۔

ان واقعات کا خلاصہ بیان کرتے وقت اتنا اور کہا جا سکتا ہے کہ یورپ کے باہر کے تمدن میں کُل فطرت نے بالاتفاق سازش کر لیا تھا کہ قوائے تخیل کے اقتدار کو بڑھائیں اور قوائے استدلالیہ کے زور کو گھٹائیں۔ جو مواد اور مصالحہ فی الحال موجود ہو اُس سے یہ ہو سکتا ہو کہ اُس وسیع قانون کے انتہائی نتائج تک تتبع کیا جائے اور یہ دکھایا جائے کہ یورپ میں اس قانون کی مخالفت ایک اور قانون کر رہا ہے جو اُسکا بالکل عکس ہے اور اُسی کی

وجہ سے یورپ میں آثار فطری کا میلان بحالت مجموعی اس جانب ہے کہ قوت تخیلہ کو محدود اور قوائے عقلی کو زوردار کرے اور اس طور سے انسان میں خود اپنے دسترس کے سامانوں پر اعتقاد کا خیال منقش کیا جائے۔ اور اُسکی معلومات کے بڑھنے میں سہولت پیدا کرکے اُس دلیرانہ۔ محققانہ اور حکیمانہ شوق کی ہمت افزائی کی جائے جو برابر بڑھ رہا ہے اور جس پر کل آئندہ ترقی کا دار ومدار ہونا چاہیے۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ میں تفصیل کے ساتھ اُس طریقہ پر بحث کرسکوں گا جس طریقے سے بوجہ اِن خصوصیات کے تمدن یورپ نے اپنے پیشینہ تمدنوں سے ایک جداگانہ روش اختیار کی ہے۔ اس کے واسطے اسقدر علم اور دماغ کی اتنی رسائی درکار ہوگی کہ جس کا مشکل سے کوئی ایک شخص ادعا کرسکتا ہے۔ کیونکہ کسی بڑے اور عام امر واقعی کا تصور کرلینا اور بات ہے اور اُس امر واقعی کی سراغرسانی اُسکے کل فروعات میں کرنا اور اسے شہادت سے ایسا ثابت کردکھانا کہ جس سے معمولی ناظرین کی بھی تسکین خاطر ہو جائے بالکل اور بات ہے۔ وہ لوگ جو اس قسم کے غور وفکر کے عادی ہیں اور اتنی قابلیت رکھتے ہیں کہ یہ سمجھ سکیں کہ تاریخ انسان میں محض واقعات کی سلسلہ بندی کے علاوہ کچھ اور بھی ہے وہ بے شک سمجھ جائیں گے کہ ان پیچیدہ مباحث میں جس قدر وسیع تر کوئی کلیہ قائم کیا جائیگا اُسی قدر زیادہ اُسمیں ظاہری مستثنیات نکلنے کا موقع ہوگا اور یہ کہ کسی تھیوری (نظریہ) کے تحت میں جسقدر وسعت ہوگی اُسیقدر بیشمار مستثنیات اُس میں ہوں گے اور پھر بھی وہ نظریہ بالکل صحیح اور واقعہ کے مطابق رہے گا۔ پس۔ جن دو اصولی قضایا کو (مجھے امید ہے کہ) میں نے ثابت کردیا ہے وہ یہ ہیں کہ اولاً کچھ آثار فطری ایسے ہیں جو قوت تخیلہ کو برانگیختہ کرکے طبیعت انسانی پر عمل کرتے ہیں ثانیاً یہ کہ وہ آثار فطری یورپ سے باہر اُس سے بہت زیادہ اور متعدد ہیں جتنے کہ یورپ میں ہیں۔ اگر یہ دونوں قضایا مسلم ہوگئے ہیں تو بداہتہً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جن ملکوں میں قوت تخیلہ کو اشتعال لگ پہونچی ہے وہاں (بشرطیکہ دیگر اسباب سے درحقیقت اُن میں اعتدالی

کیفیت نہ پیدا ہوئی ہو) بعض معین اثر ضرور پیدا ہوے ہوں گے - اب یہ بات کہ یہ تناقض اسباب موجود تھے یا نہ تھے یہ اصل نظریہ کی صحت وصداقت کے بارے میں قابل لحاظ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اُن دو قضایا پر مبنی ہے جو ابھی بیان ہو چکے ہیں - اگر حکیمانہ طور سے نظر ڈالی جائے تو (معلوم ہو کہ) یہ کلیہ جو بنا ہے وہ کامل ہے اور بجاے اسکے کہ یہ کوشش کیجائے کہ مزید توضیحات سے وہ اور مصدق کیا جائے یہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنی حالت پر قائم رہنے دیں کیونکہ جتنے واقعات جزئیہ ہیں وہ غلط طور سے بیان کیے جاسکتے ہیں اور یہ یقینی ہے کہ انکی تردید وہ لوگ ضرور کریں گے جو اُن نتائج کو (جن کی تصدیق وہ کرتے ہیں) پسند نہیں کرتے - لیکن اس غرض سے کہ پڑھنے والا اُن اصول سے مانوس ہو جائے جنھیں میں نے پیش کیا ہے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اُنکے واقعی عمل کی بعض مثالیں دیدی جائیں اور اسی بنا پر میں مختصر طور سے اُن تاثیرات پر نظر ڈالتا ہوں جو انھوں نے تین بڑے صیغوں یعنی علوم وفنون - مذہب اور صنعت وحرفت پر ڈالی ہیں ان سب صیغہ جات میں سے ہر ایک میں یہ دکھانے کی کوشش کروں گا کہ اُنکی خاص خاص شاخیں مناظر فطرت ہی سے متاثر ہوئی ہیں اور تحقیقات کی سہولت کی غرض سے میں ہر ایک جہت کی دو سب سے زیادہ نمایاں مثالیں لے لوں گا اور یونان کے مظاہر عقلی کا مقابلہ ہندوستان کے مظاہر عقلی سے کرونگا کیونکہ یہ دونو ملک وہ ہیں جنکی بابت کافی ووافی سامان موجود ہے اور جنمیں طبیعی تقابل بہت ہی حیرت خیز ہے۔

اب اگر ہم ہندوستان کے قدیم ادب انشا کو دیکھتے ہیں تو ہم اُس کے بہترین زمانے میں بھی نہایت یادگار شہادت قوت تخیلہ کی بے انداز بلند پروازی کے پاتے ہیں - سب سے پہلے ہمکو اس واقعہ پر حیرت ہوتی ہے کہ وہاں نثر نگاری پر مشکل ہی سے کچھ توجہ صرف کیگئی ہے اور کل اعلیٰ درجے کے انشا پرداز نظم ہی کی تالیف وتصنیف میں اپنی ہمت صرف کرتے رہے کیونکہ قومی طرز خیال کے واسطے نظم ہی زیادہ موروں تھی - اُنکے قریب قریب کل تصانیف فنون متعدد یعنی نحو وصرف - قانون - تاریخ - طب - ریاضی - جغرافیہ اور ما بعد الطبعیات

میں منظوم ہیں اور اُنکی نظم ایک باقاعدہ عروض کی تابع ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ وہاں نثرنگاری کو بالکل متروک و مردود کر کے شعر گوئی میں کمال پیدا کرنے پر تمام تر ہمت صرف کی گئی اور انجام یہ ہوا کہ زبان سنسکرت اس قدر متعدد اور پیچیدہ اوزان و بحور پر ناز کر سکتی ہے کہ جتنی شاید یورپ کی کسی زبان میں کبھی نہ ہوئی ہوں گی۔

ہندوستان کے ادب انشا کی ہر نوعیت خاص کے ساتھ ہی مضمون کے لحاظ سے بھی ایک خاص حالت ہے کیونکہ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہیں ہے کہ اُس ادب انشا میں ہر شے ایسی ہی جو بر ملا موقع پر عقل کو جھنکائیاں دیتی ہے۔ وہ تخیل جو اس درجہ مضمون خیز ہے کہ گویا ایک روگ ہو رہی ہے ہر موقع پر عقل کو راستہ بتاتی ہے۔ اور یہ بات خاص کر کے اُن تصنیفات میں پائی جاتی ہی جو امتیاز کے ساتھ (نفس الامر میں) قومی ہیں جیسے رامائن۔ مہابھارت اور پوران۔ لیکن ہم اُن کی تصانیف فن جغرافیہ اور فن پنچانگ (فن سنین وشہور و تاریخ) میں بھی یہی اقعات دیکھتے ہیں حالانکہ یہ ایسی ہیں جن میں اوروں کی بہ نسبت قوت تخیلہ کی بلند پروازی کی گنجایش کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ نہایت مستند کتابوں سے بعض بیانات بطور مشتے نمونہ از خروارے اس ضرورت سے پیش کیے جا سکتے ہیں کہ اُن سے یورپ کی عقل و فراست کی بالکل جداگانہ حالت کا تقابل کیا جا سکے اور پڑھنے والے کو اس کا کچھ کچھ اندازہ ہو جائے کہ ایک متمدن قوم میں بھی سریع الاعتقادی کس حد تک بڑھ سکتی ہے۔

جن مختلف طریقوں سے قوت تخیلہ نے حقیقت و واقعیت سے رُدگردانی کی ہے اُن سب میں سے کسی نے اتنا نقصان نہیں پہونچایا ہے جتنا زمانۂ سلف کی بابت ایک مبالغہ آمیز تعظیم و تکریم نے پہونچایا ہے۔ قدامت کے بارہ میں یہ تقدس و عظمت آبائی کا خیال ایسا ہے جو دانشمندی کے ہر ایک اصول مسلمہ کے بالکل بر خلاف ہے اور یہ صرف اُس شاعرانہ تخیل کا ایک ظہور ہے جو کسی نامعلوم اور بعید شے کی بابت گلکاریاں کیا کرتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ ایک قدرتی بات ہی کہ جن زمانوں میں عقل انسانی نسبتہً بالکل بیکار تھی اُن وقتوں میں یہ تخیل شاعرانہ اسی کہیں

قوی ہوگی جتنی وہ اب ہے اور اس میں بھی بہت کم شک ہو سکتا ہے کہ یہ تخیل روز بروز کمزور ہوتی چلی جائے گی اور یہ کہ جس قدر وہ کمزور ہوتی جائیگی اُسی قدر ترقی کا خیال جڑ پکڑتا جائے گا اور زمانہ گذشتہ کی بابت تعظیم و تکریم کے خیال کے عوض زمانہ آیندہ کی نسبت اسید و یقین کا خیال پیدا ہوگا۔ لیکن زمانۂ سابق میں یہ تعظیم و تکریم کا خیال بہت غالب تھا اور اُسکے بشمار آثار و یادگار ہر ایک مُلک کے ادب و انشا اور مطبوع خاطر عقائد میں نظر آ سکتے ہیں۔ مثلاً یہی خیال تھا جس میں شاعروں میں ایک عہد زریں (ست جگھ) کا تصور پیدا کیا کہ جس میں مُلک امن و امان کی برکتوں سے مالا مال تھا جس میں بُرے جذبات انسانی رُکے تھمے ہوے تھے اور جرائم و معاصی کو کوئی جانتا ہی نہ تھا۔ پھر۔ یہی خیال تھا جس نے اہل مذاہب میں انسان کے ابتدائی زمانہ کی نکو صفاتی اور سادہ مزاجی کا اور اس بلند حالت سے پھر تنزل ہو جانے کا تصور پیدا کیا۔ اور پھر۔ یہی اصول تھا جس نے یہ عقیدہ پھیلا دیا کہ اگلے وقتوں میں انسان نہ صرف زیادہ نکوکار یا شاد و خرم رہتے تھے بلکہ جسمانی حیثیت سے بھی اُن کے قُوائے بہت مضبوط ہوتے تھے۔ یہ کہ اسی ذریعہ سے وہ بہت تنومند اور طویل القامت ہوتے اور اس سے کہیں زیادہ عمریں پاتے تھے جتنی ہم لوگوں کو میسّر ہو سکتی ہیں جو اُنکی مسخ شدہ اولادیں ہیں۔

اس قسم کی رائیں ہیں جنھیں عقل کے علی الرغم قوتِ تخیلہ نے قبول کر لیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسی رایوں کی قوت ہر مُلک میں وہ معیار ہے جس کے ذریعے سے ہم قوتِ تخیل کے غلبہ و تفوق کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اب جو ہم ہندوستان کے ادب و انشا کو اس معیار پر کستے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو نتائج استخراج کیے گئے ہیں وہ حیرت انگیز طور سے صحیح اُترتے ہیں۔ زمانۂ قدیم کے عجائب و غرائب کارہاے نمایاں جن کے ذکر سے ادب سنسکرت مالا مال ہے ایسے طول طویل اور پیچیدہ ہیں کہ اگر اُنکا صرف مجمل خاکہ بھی بیان کیا جائے تو صفحہ کے صفحہ رنگنا پڑیں۔ لیکن اِن نادرِ زمانہ قصص و حکایات کی ایک صنف ایسی ہے جو قابل توجہ ہے اور جس کو مختصر طور پر بیان کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میری مُراد اُن

غیر معمولی عمروں سے ہے جو (یہ خیال کیا جاتا ہے کہ) اگلے وقتوں کے لوگ پاتے تھے۔ دُنیا کے ابتدائی زمانے میں نسل انسانی کے بڑی بڑی عمریں پانے کا عقیدہ محض ایک لازمی نتیجہ اُن خیالات کا ہے جنکی رُو سے اگلے زمانے والے عام طور سے اپنے زمانے والوں سے افضل و فائق تھے اور اسکی مثالیں بعض عیسائی اور اکثر عبرانی تصانیف میں بھی ہم پاتے ہیں لیکن ان تصانیف میں جو بیانات ہیں اُنکا مقابلہ جب اُن بیانات سے کیا جاتا ہے جو ہندوستان کے ادب انشا میں محفوظ ہیں تو وہ بالکل مصنوعی اور حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ اِس معاملے میں (اسی طرح جیسے اور ہر ایک معاملے میں) ہندوؤں کی قوت تخیلہ اس قدر آگے بڑھ گئی ہے کہ اور کوئی اُنکی گرد پا کو بھی نہیں پہونچ سکتا۔ چنانچہ یکسان قسم کے بیشمار واقعات میں ہم یہ لکھا ہوا پاتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں نوع انسانوں کی مدت حیات اسّی ہزار برس ہوتی تھی اور یہ کہ مقدس و برگزیدہ لوگ ایک لاکھ برس سے زیادہ کی عمر پاتے تھے۔ ان میں سے بعض کچھ پہلے اور بعض کچھ پیچھے مرتے تھے لیکن زمانۂ قدیم کی نہایت خوشحالی و شادمانی کے اوقات میں اگر ہم سب طبقے والوں کو ایک میں شمار کر لیں تو ایک لاکھ بیس برس کی عمر کا اوسط پڑتا تھا۔ ایک بادشاہ جس کا نام یودھشٹر تھا اُسکی بابت اتفاقیہ طور سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ اُس نے ستائیس ہزار برس حکومت کی۔ اور ایک بادشاہ جس کا نام الارکا تھا اُس نے چھیاسٹھ ہزار برس حکومت کی۔ لیکن ان لوگوں نے عنفوان شباب ہی میں شربت مرگ نوش کیا کیونکہ اگلے شاعروں کی متعدد مثالیں ایسی موجود ہیں جنھوں نے پانچ پانچ لاکھ برس کی عمریں پائی تھیں لیکن سب سے زیادہ تعجب انگیز اور یادگار رسالت تاریخ ہندوستان کے اُس نہایت درخشاں جوہر کی ہے جس کی ذات میں شاہی اور درویشی شانین ایک ساتھ جمع ہوگئی تھیں۔ یہ سربرآوردہ شخص نہایت عمدہ اور معصوم زمانے میں پیدا ہوا تھا اور اُس نے اپنے ملک میں بہت ہی بڑی عمر پائی کیونکہ جس وقت اُسکے سر پر تاج شاہی رکھا گیا تھا۔ اُس وقت اُسکی عمر بیس لاکھ برس کی تھی پھر اُس نے چھ لاکھ تیس ہزار برس سلطنت کی اور پھر سلطنت کو چھوڑ کے ایک لاکھ برس اور زندہ رہا۔

زمانۂ قدیم کی بابت جو بیحد و بے نہایت تقدس تابی کا خیال ہے اُسی کی وجہ سے ہندو لوگ ہر عمدہ اور ہر اہم بات کو نہایت ہی قدیم زمانے سے منسوب کرتے ہیں اور اُسکا زمانۂ وقوع ایسا بتاتے ہیں جو بالکل محوِ حیرت کر دینے والا ہوتا ہے۔ اُنکا مجموعۂ نظم قوانین جو منو کے قوانین (یعنی منو سمرتی) کے نام سے موسوم ہے وہ تین ہزار برس سے بھی کم زمانے کا ہے لیکن ہندوستان کا مورخ (سنین و شہور بتانے والا) بجائے اس کے کہ اِس سے راضی ہو اُس کو ایسے عہد سے منسوب کرتا ہے جس کا تصور کرنا بھی یورپ کے ایک باشندے کی طبیعت کے واسطے نہایت دشوار ہوگا۔ کیونکہ اعلیٰ ترین مُلکی (یعنی ہندی) مصنفین کے قول کے بموجب یہ مجموعۂ قوانین (یعنے منو سمرتی) آب سے دو ارب برس پیشتر انسان پر الہام کیا گیا تھا۔

جو محبت اہل ہند کو زمانۂ قدیم سے ہے یا ایک غیر متناہی ہستی مطلق کی جو دھن انکو لگی ہوئی ہے اور زمانۂ حال سے جو لاپروائی اُنکی طبیعتوں میں پائی جاتی ہے اُسی کے یہ سب کرشمے ہیں اور وہی اُن کی عقل و فراست کے ہر شعبے میں جلوہ دکھا رہی ہے۔ نہ صرف اُنکے علوم و فنون (ادب انشا) میں بلکہ اُنکے مذہب اور اُنکی صنائع و بدایع میں بھی یہ رجحان سب پر غالب ہے اور جس اصول کا اُنکے یہاں دَور دورہ ہے وہ یہی ہے کہ عقل زیر اور قوتِ تخیلہ بالا رہے۔ اُنکے احکام فقہی ہیں۔ اُن کے دیوتاؤں کی خصلتوں میں۔ حتیٰ کہ اُنکے شوالوں اور مندروں کی تعمیر میں ہم کو یہ نظر آرہا ہے کہ عالمِ خارجی کی عظیم الشان اور ہولناک مظاہر نے کس طرح باشندگانِ مُلک کے قلوب میں اُن شاندار اور خوفناک بتوں کا تصور راسخ کر دیا تھا جن کو انھوں نے ایک نمایاں شکل سے ہویدا کرنا چاہا اور جن کے سبب سے اُنکی قومی تہذیب و شائستگی میں سربرآوردہ خصوصیات قائم ہوئے۔

اس وسیع طرز عمل کو جس نگاہ سے ہم دیکھتے ہیں اُسی طرح اگر ہم یونان کی بالکل برعکس حالت کو بھی دیکھیں گے تو دونوں کے تقابل سے اصلی حالت زیادہ واضح ہو جائیگی۔ یونان کو ہم ایسا مُلک پاتے ہیں جو بالکل ہندوستان کا عکس ہو یعنی قدرت کے وہی کام جو ہندوستان

ہیں محو حیرت کر دینے والے اور عظیم الشان ہیں وہ یونان پر کہیں زیادہ چھوٹے۔ کمزور اور
ہر صورت سے انسان کے لیے کم باعث عروت و خطر ہیں۔ ایشیائی تمدن کے بڑے مرکز (یعنے
ہندوستان) میں نسل انسانی کی ہمت و قوت گرد و پیش کے آثار سے محدود بلکہ سہمی ہوئی ہے
اور علاوہ اُن خطرات کے جو کل ممالک متحدہ میں ہیں وہاں ایسے بلند و بالا پہاڑ ہیں جنکی چوٹیاں
آسمان سے باتیں کرتی معلوم ہوتی ہیں اور اُن کے پہلوؤں سے ایسے قہار دریا نکلے ہیں
جن کو کوئی صنعت و حرفت اُن کے بہاؤ کی راہ سے پلٹا نہیں سکتی اور اُن کے پاٹ اتنے بڑے
ہیں کہ اُنھیں کوئی پل سمیٹ نہیں سکتا۔ پھر وہاں دشوار گزار بن بھی ہیں اور ملک کے ملک
لق و دق جنگل پڑے ہوئے ہیں اور اُنکے علاوہ بعید خشک اور بے نہایت دشت و بیابان
ہیں اور یہ سب انسان کو اُسکی اپنی کمزوری اور فطری قوتوں کو قابو میں لانے کی بابت اُسکی
اپنی نالائقی اور ہیچمیرزی کا سبق دیتی ہیں۔ ملک سے باہر اور ہر جانب بڑے بڑے سمندر
ہیں جن میں ایسے بلا کے طوفان اُٹھتے ہیں کہ جو طوفان یورپ میں اُٹھتے ہیں وہ اُن سے
کہیں زیادہ تباہ کُن ہوتے ہیں اور اُن کا زور و شور ایسا فوری ہوتا ہے کہ اُنکی تباہی سے بچاؤ
کی صورت نکالنا محال ہو جاتا ہے اور جیسے اُن ملکوں میں سب چیزیں انسان کی چستی و چالاکی کو
غارت کرنے پر تلی ہوئی تھیں گنگا کے دہانے سے لیکے جزیرہ نمائے ہند کی انتہائی حد جنوبی تک پورے
سلسلۂ ساحلی میں نہ کوئی ایک بھی وسیع اور محفوظ بندرگاہ تھا نہ چھوٹا بندر کہ جس میں پناہ ملتی
حالانکہ یہ وہ چیز ہے جسکی ضرورت دُنیا کے کسی دوسرے حصّے سے زیادہ وہاں تھی۔

لیکن یونان میں مظاہر فطرت اسقدر بالکل مختلف ہیں کہ وہاں زندگی کی حالتیں بھی بالکل
بدلی ہوئی ہیں۔ ہندوستان کی طرح یونان بھی ایک جزیرہ نما ہے لیکن در انحالیکہ ہندوستان
میں (جو ایشیائی ملک ہے) ہر شے بڑی مہیب ہے یونان میں (جو یورپی ملک ہے)
ہر شے چھوٹی اور کمزور ہے۔ تمام یونان کی وسعت اتنی ہے جتنی سلطنت پرتگال
کی ہے۔ یعنی اب جسے ہندوستان کہتے ہیں اُس کا تقریباً چالیسواں حصہ یونان ہے چونکہ

وہ ایسے مقام پر واقع ہے جہاں ایک پتلے سے سمندر کے ذریعہ سے پہنچ ہو سکتی تھی اسلیے
وہاں مشرق میں ایشیائے کوچک سے مغرب میں اطالیہ سے اور جنوب میں مصر سے آسانی
رسل و رسائل ہو سکتی تھی۔ وہاں ممالک حارہ کے تمدنوں کی بہ نسبت ہر قسم کے خطرات کہیں کم
تھے۔ وہاں آب و ہوا زیادہ صحت بخش۔ زلزلے نادر الوقوع اور طوفان کم برباد کرنیوالے
تھے اور جنگلی جانور بھی کچھ زیادہ نہ تھے۔ اور دوسرے اعظم امور کے لحاظ سے بھی یہی قانون
جاری تھا۔ چنانچہ یونان میں جو پہاڑ سب سے اونچا ہے وہ کوہ ہمالیہ کے ایک ثلث بھی کم بلند ہے
اور اسی وجہ سے وہاں کے پہاڑ اتنے اونچے نہیں کہ اُن پر برف جمی رہے۔ دریاؤں کے لحاظ
سے نہ صرف اسی قدر ہے کہ وہاں کوئی بڑے بڑے چوڑے چکلے دلچسپ دریا ایسے نہیں ہیں جیسے
ایشیا میں پہاڑوں سے بہ رہے ہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہاں فطرت اس قدر ضعیف و سُست
ہے کہ چند نالوں ندیوں کے سوا نہ شمالی یونان میں کوئی دریا ملتا ہے نہ جنوبی میں اور یہ نالے
ندیاں ایسی ہیں جنھیں آسانی سے عبور کر سکتے ہیں اور اکثر اوقات گرمی کے موسم میں وہ
بالکل ہی خشک ہو جاتے ہیں۔

آثار مادی کے ان حیرت انگیز اختلافات ہی نے جو دونوں ملکوں میں ہیں دونوں ملکوں
کے تصورات ذہنی کے سلسلے میں بھی اختلافات پیدا کر دیے۔ کیونکہ جس وقت کل تصورات
جو ذہن انسانی میں پیدا ہوتے ہیں اُن میں سے کچھ تو اُن فوری اور برمحل تحریکات سے پیدا
ہوتے ہیں جو نفس انسانی میں ہوتی رہتی ہیں اور کچھ اس طور سے پیدا ہوتے ہیں کہ عالم خارجی
اُنھیں طبیعت انسانی کو سوجھا دیتا ہے۔ تو اب یہ بالکل ایک قدرتی بات ہے کہ جب ایک
علت (یعنی عالم خارجی) میں اتنا بڑا تغیر ہوگا تو وہ نتائج (یعنی اُن تصورات میں جنھیں عالم خارجی
سجھاتا ہے) میں بھی تغیر پیدا کرے گا۔ ہندوستان میں گرد و پیش کے آثار طبیعی (کا میلان
اس طرف تھا کہ ہول اور دہشت پیدا ہو۔ لیکن یونان میں (انھیں آثار طبیعی کا) میلان اس
جانب تھا کہ اعتبار و اطمینان پیدا ہو۔ ہندوستان میں انسان سہما ہوا تھا۔ یونان میں اُسکی ہمت

بڑھی ہوئی تھی - ہندوستان میں ہر طرح کی مزاحمتیں اس قدر متعدد- ایسی سہناک اور بظاہر اتنی غیر موجہ (یا سمجھ سے باہر) تھیں کہ زندگی کے مراحل صرف اسی صورت سے حل ہو سکتے تھے کہ علی التواتر ما فوق الفطرۃ اسباب ذرائع کی براہ راست وساطت سے استمداد کی جائے۔ اور چونکہ یہ (ما فوق الفطرۃ) اسباب عقل کے حدود اختیارات سے باہر تھے اس لیے قوت تخلیہ کے کل سروسامان اکثر اوقات اُن (اسباب) کے مطالعے میں صرف کر دیے جاتے تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے خود قوت تخلیہ پر کثرت کار سے بے حد دباؤ پڑا ہوا تھا۔ اُسکی پوری رفتار اندیشہ ناک ہو گئی۔ اُس نے عقل و خرد پر چھاپہ مارا تھا اور کوئی شے اعتدال پر باقی نہ رہی تھی۔ یونان میں اسکے برعکس حالات و اسبابنے برعکس نتائج بھی پیدا کیے تھے۔ وہاں ہندوستان کے بہ نسبت فطرت بہت کم خطرناک۔ بہت کم خلل انداز اور بہت کم پُر اسرار تھی - لہذا۔ یونان میں طبیعت انسانی پر بہت کم رعب چھایا ہوا تھا۔ اور وہ بہت ہی کم وہمی و وسواسی تھی۔ اسلیے وہاں اسباب فطری کا مطالعہ شروع کیا گیا۔ اور طبعیات کی پہلی بنیاد پڑی۔ پھر رفتہ رفتہ جب انسان کو خود اپنی قوت کا احساس و ادراک ہونے لگا تو اُسنے حوادث روزگار کی تحقیقات کی فکر اس جرأت و دلیری سے کی کہ جس کا اُن ملکوں میں کہیں پتہ نشان بھی نہ تھا۔ جہاں فطرت کا دباؤ انسان کی آزادی کو اُبھرنے نہیں دیتا تھا اور ایسے تصورات سمجھاتا تھا جن سے علم میل نہیں کھاتا تھا۔

اِن اختلافِ خیالات کا جو اثر قومی مذہب پر پڑا وہ ہر ایسے شخص پر نہایت واضح ہوگا جس نے ہندوستان کے مروجہ عقائد کا مقابلہ یونان کے مروجہ عقائد سے کیا ہوگا۔ ہندوستان کے قصص الاصنام (دیو بانی) دیگر ممالک حارہ کی طرح خوف و دہشت اور نہایت مبالغہ آمیز دہشت پر مبنی ہیں اور اس خوف و دہشت کے عالمگیر ہونے کی شہادت ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں اُنکی روایات و حکایات مذہبی میں۔ بلکہ اُن کے دیوتاؤں کی شکل و صورت میں بھی بکثرت ملتی ہے۔ اور یہ سب چیزیں طبیعت انسانی پر ایسا گہرا نقش بناتی ہیں کہ نہایت ہی مقبول اور مطبوع خاطر دیوتا (جن کا عام طور سے چلن ہے) علی العموم وہی ہیں جن سے بیم و ہراس کی شکلیں

بہت قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً شیوجی کی پرستش اور دیوتاؤں کے بہ نسبت زیادہ رواج پائے ہے۔ اور اس بات کے یقین ماننے کی وجہ موجود ہے کہ شیوجی کی پرستش اتنے قدیم زمانے سے مروّج ہے کہ برہمنوں نے اُسے اصلی باشندگان ہند سے وراثتہً پایا تھا۔ ہر نوع یہ دیوتا نہایت قدیم اور نہایت مقبول خاص عام ہیں حتیٰ کہ برہما اور وشنو کے ساتھ ملکے خود شیوجی ہندوؤں کا ترسول قائم کرتے ہیں۔ پس۔ اب ہمکو اس امر پر متعجب نہ ہونا چاہیے کہ اسی دیوتا (یعنی شیوجی) کے ساتھ خوف ودہشت کی ایسی شکلیں وابستہ ہیں کہ جن کا تصور بھی ممالک حارہ کی تخئیل کے سوا اور کسی کو ہو نہیں سکتا۔ ہندوستانی طبیعت کے سامنے شیوجی ایک نہایت مہیب دیو ہیں جنکے گرد سانپوں کی ایک کنڈلی بنی ہوئی ہے۔ اُنکے ہاتھ میں انسان کی کھوپڑی ہے اور وہ گلے میں آدمیوں کی ہڈیوں کا ایک مالا پہنے ہوے ہیں۔ اُن کی تین آنکھیں ہیں اور اُنکے مزاج کی خشمناکی اس سے ظاہر ہوتی ہو کہ وہ چیتے کی کھال اوڑھے ہوے ہیں۔ وہ ایک پاگل آدمی کی طرح آوارہ وسرگرداں پھرتے ہوے ثابت کیے جاتے ہیں۔ اُنکے بائیں شانے پر ایک خونخوار ناگ پھن پھیلائے ہوے پڑا ہے۔ ایک مرعوب وہیبت زدہ تخیل کی اس بھیانک اختراع (یعنی شیوجی) کی ایک بیوی دُرگا نام ہے جو کبھی کالی کے نام سے اور کبھی کسی اور نام سے موسوم کیجاتی ہے۔ اُسکا بدن گہرے نیلے رنگ کا ہے۔ اُسکی ہتیلیاں لال ہیں کہ جو جلادی اور خون آشامی کی کبھی نہ بجھنے والی خواہش پر دلالت کرتی ہیں۔ اُسکے چار ہاتھ ہیں جنمیں سے ایک ہاتھ میں کسی دیو کی کھوپڑی ہے۔ اُسکی زبان باہر نکلی ہوئی اور منھ سے لٹکی پڑتی ہے۔ اُسکی کمر میں اُسکے مقتولین کے ہاتھ ہیں۔ اور اُسکے گلے کی آرایش کے لیے ایک بھیانک قطار میں آدمی کی کھوپڑیاں برابر لٹکی ہوئی ہیں۔

اب اگر ہم یونان کی طرف مڑتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ وہاں مذہب کے عالم طفلی میں بھی اس قسم کے امور کی کہیں ہوا نہیں لگی تھی کیونکہ یونان میں اسباب ہیبت کے کمتر ہونے کی وجہ سے اظہار خوف ودہشت بھی کمتر مروج تھا۔ اسی سبب سے اہل یونان کسی طور سے اپنے مذہب میں

بیم و ہراس کے وہ خیالات طاقفے پر ائل نہ ہوے جو اہل ہند کے واسطے بالکل قدرتی تھے۔ ایشیائی تمدن کا رجحان اس طرف تھا کہ انسان اور اُسکے معبودوں کے درمیان فاصلے کو اور بڑھادے اور یونانی تمدن کا رجحان اس جانب تھا کہ اس فاصلۂ درمیانی کو گھٹا دے اور عابد و معبود کو ایک دوسرے سے قریب کردے۔ اسی سبب سے ہندوستان میں جتنے دیوتا تھے اُن سب کے ساتھ سطوت و جلال بھی لگا ہوا تھا مثلاً وشنو کے چار ہاتھ تھے۔ برہما کے چار سر تھے۔ وقس علےٰ ہذا۔ لیکن یونان کے دیوتا ہمیشہ ایسی شکلوں میں ظاہر کیے جاتے تھے جو بالکل انسانی شکلیں ہوتی تھیں۔ اُس ملک میں ایسے مصور کی بھی پرستش نہ ہوتی جو دیوتاؤں کو کسی اور شکل میں ظاہر کرنا چاہتا۔ وہ اُنھیں انسانوں سے زیادہ تنومند اور قوی ہیکل زیادہ حسین اور خوبصورت بنا سکتا تھا لیکن بناتا اُنھیں انسان ہی تھا۔ پس جو مشابہت درمیان دیوتا اور انسان کے یونانیوں کے مذہبی خیالات کو جوش میں لاتی تھی۔ وہ ہندوؤں کے خیالات کے لیے سم قاتل تھی۔ کیونکہ یہاں دیوتا اور انسان میں کوئی مناسبت یا مشابہت ہوتی ہی نہ تھی۔

اِن دونوں مذہبوں کے صنعتی مظاہر میں جو اختلاف وتبائن تھا اُسی کے پاشنہ کوب ٹھیک اُسی قسم کا اختلاف وتباین دونوں کے مذہبی روایات و حکایات میں بھی تھا۔ ہندوستان کی کتابوں میں تخیل کا سارا زور دیوتاؤں کے خوارق عادات اور کرامات کے بیان میں صرف کردیا گیا تھا اور جس قدر زیادہ کوئی کارنمایاں کھلا کھلا محال تھا اُسی قدر زیادہ مسرت کے ساتھ وہ اُنکی طرف منسوب کیا جاتا تھا لیکن یونانی دیوتا صرف انسان کی شکل و صورت ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ صفات انسانی سے بھی متصف ہوتے۔ انسانی کاروبار میں مصروف رہتے۔ اور انسانی مذاق رکھتے تھے۔ ایشیائی لوگ جنھیں فطرت کی ہر شے موجب ہراس و دہشت تھی۔ تعظیم و بندگی کے ایسے خوگر ہوگئے تھے کہ اُنھیں اپنے کاموں کو اپنے دیوتاؤں کے کاموں سے ملا سکنے کی کبھی جرأت نہ پڑتی تھی۔ یورپ والے مادی دنیا کو بے خوف اور بے ضرر (بلکہ معطل) سمجھ کے ایسی ہمسری کا دم بھرتے تھے کہ جس سے اگر وہ ممالک حارّہ کے کسی ملک میں ہوتے

تو ضرور باز رہتے۔ یہی سبب ہے کہ یونانی دیوتا اس قدر ہندو دیوتاؤں سے متغائر ہیں کہ جب ہم ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے گویا ہم ایک دنیا سے دوسری دنیا میں پہونچ گئے ہیں۔ یونانیوں نے طبیعت انسانی پر غور و فکر کر کے کلیات اخذ کیے اور اُنھیں کو اپنے دیوتاؤں پر چسپاں کر دیا۔ مثلاً عورتوں کی سنہری دیانا میں متشکل کی گئی۔ عورتوں کا حسن اور اُن کی ہیبت وینس میں۔ عورتوں کا غرور و نخوت جونو میں اور عورتوں کے باطنی کمالات و ہنرمندی منروا میں۔ پھر دیوتاؤں کے معمولی مشاغل زندگی میں بھی اسی اصول کا تتبع کیا گیا نیچون ایک جہازراں تھا۔ ولکن ایک لوہار تھا۔ اپالو کبھی ایک بانسری بجانے والا تھا کبھی ایک شاعر اور کبھی چرواہا۔ اب کیوپڈ کو لیجیے تو وہ ایک لاابالی (یا آشفتہ سر) چھوکرا تھا جو اپنے تیر و کمان سے کھیلا کرتا تھا۔ جوپیٹر (عطارد) ایک عاشق مزاج اور نیکدل بادشاہ تھا اور مرکری (مریخ) بے امتیازی سے یا تو ایک معتبر قاصد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے یا ایک معمولی اور مشہور چور کی طرح۔

ٹھیک یہی رجحان قوائے انسانی کو مافوق انسانی قوتوں سے ہمسر کر دینے کا ایسا ہے جو یونانی مذہب کی ایک ادر خصوصیت میں ہویدا ہوا ہے۔ میرا یہ مطلب ہے کہ ہم یونان ہی میں پہلے پہل مشاہیر پرستی یعنی فانی انسانوں میں الوہیت کی شان پیدا کرنے کا سامان دیکھتے ہیں جو اصول بیان ہو چکے ہیں اُن کے بموجب ممالک حارہ کے کسی تمدن میں یہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ وہاں مناظر قدرت نے انسان کے دل میں اُس کی اپنی قابلیت کا خیال بار بار جما دیا تھا۔ پس۔ یہ ایک قدرتی بات تھی کہ ہندوستان کے قدیم مذہب کا جزو وہ (یعنے مشاہیر پرستی) ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ نہ یہ بات مصریوں کے علم میں تھی نہ اہل فارس کے نہ (جہانتک میں واقف ہوں) عربوں کے۔ لیکن یونان میں چونکہ انسان عالم خارجی سے کم زیر ہوا تھا اور اسے بہت کم کسی نے اپنے پنجے میں دبوچا تھا اس وجہ سے اپنی قوتوں کو زیادہ خیال کیا کرتا تھا اور جس طرح دوسرے مقام پر اُس کا بھرم جاتا رہا تھا ویسا وہاں نہیں ہوا۔ مآل کار یہ تھا کہ تاریخ

یونان کے بہت ابتدائی حصہ میں فانیوں (یا فانی ذاتوں) کی الوہیت (یا مداومت) کی کوشش وہاں کے ملکی مذہب کا ایک مسلمہ جزو تھی - اور اہل یورپ کے نزدیک یہ کوشش اس قدر قدرتی معلوم ہوئی کہ بعد ازاں رومی کلیسا نے اسی رسم کو نہایت کامیابی سے تازہ کیا - اور اگرچہ اب بالکل جدا گانہ قسم کے حالات و اسباب بت پرستی کی اس شکل خاص کو بتدریج مٹا رہے ہیں لیکن اس کا وجود اس حیثیت سے قابل لحاظ ہے کہ منجملہ اُن متعدد مثالوں کے ہے جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ کس طور سے یورپ کے تمدن نے اُن سب ملکوں کے تمدن سے الگ راہ اختیار کی ہے جو اُس سے پیشتر گزرے ہیں -

یہ صورت تھی جس سے یونان میں ہر شے اُسی طرف مائل تھی کہ انسان کا بول بالا ہے اور ہندوستان میں ہر شے انسان ہی کو نیچا دکھانے پر تلی ہوئی تھی - اب اگر ان سب باتوں کا خلاصہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یونان والے تو انسان کی قوتوں کی بابت زیادہ عظمت کا خیال رکھتے تھے - اور ہندوستان والے مافوق انسانی قوتوں کے بابت - یونان والے اُن اشیا سے سروکار رکھتے تھے جو جانی بوجھی اور ممکن الحصول تھیں اور ہندوستان والے اُن چیزوں سے وابستہ تھے جو بے جانی بوجھی اور پُر اسرار تھیں - اور اسی طرح کی متوازی دلیل سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ قوت تخیلہ جسے ہندو لوگ فطرت کی شان وتجمل سے مرعوب ہوکے اپنے قابو میں نہ لاسکے اُس کے سارے کس بل قدیم یونان کے چھوٹے سے جزیرہ نما میں نکل گئے - دنیا کی تاریخ میں اول اول یونان ہی میں قوت تخیلہ کسی حد تک عقل سے محدود اور معتدل کی گئی تھی - کچھ یہ بات نہ تھی کہ اسکی مضبوطی و استواری میں خلل ڈالا یا اُسکا زور گھٹایا گیا تھا بلکہ اسے بے بال و پر کرکے عقل کا مسخر اور تابع فرمان کر لیا تھا - اُسکی بے اعتدالی روک دیگئی تھی اور اُسکی حماقتوں کی تشہیر کر دی گئی تھی لیکن اس کا یہ جوش قائم رہا تھا - اس کے کافی و وافی ثبوت اہل یونان کے اُن طبعزادوں اور اختراعات سے مل سکتے ہیں جو ہمارے وقتوں تک قائم و برقرار چلی آتی ہیں - بس - وہاں جس قدر نفع اُٹھانا چاہیے تھا وہ بدرجۂ کمال حاصل ہوا

کیونکہ عقل انسانی کی تفحص اور تحقیق کی قوتوں کی نشوونما اچھی طرح کی گئی اور اسی طرح قوت تخیل کی پرعظمت اور شاعرانہ جذبات بھی برباد نہ کیے گئے۔ اب یہ بات کہ میزان مستوفی برابر اُتری تھی یا نہیں یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے لیکن یہ تو یقینی امر ہے کہ یونان میں جیسی میزان ٹھیک اُتری تھی اتنی کسی سابق تمدن میں نہ اُتری تھی۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس میں بہت کم شبہ ہو سکتا ہے کہ باوجود اُس سب کے جو ہو چکا تھا پھر بھی قوائے تخیل کے لیے بہت کچھ قدرت و اقتدار باقی رہا تھا اور یہ کہ نرے عقلی قوائے پر کافی توجہ جب کی گئی تھی نہ کبھی اور کی گئی۔ باایں ہمہ۔ یہ بات اس واقعۂ عظمیٰ پر مؤثر نہیں ہے کہ یونانی علوم و فنون اس بارے میں سب سے اول ہیں کہ وہاں یہ نقص کسی قدر رفع کیا گیا تھا اور وہاں بالقصد اور مسلسل طور سے یہ کوشش جاری رہی تھی کہ ہر قسم کی رائیں اس طرح کسوٹی پر لگا کے دیکھی جائیں کہ وہ عقل انسانی کے مطابق ہیں یا نہیں اور اس طریقے سے اُنھوں نے انسان کی اس حق (ہما ہی) کو پایۂ ثبوت پر پہونچا دیا تھا کہ جو معاملات اہم اور بیحد مہتم بالشان ہیں اُنکا تصفیہ بطور خود کرے۔

میں نے ہندوستان اور یونان کو مندرجہ بالا تقابل کے دو ارکان کے طور پر منتخب کیا ہے اور یہ اس وجہ سے کہ ان ملکوں کی بابت ہماری معلومات نہایت وسیع ہیں اور اُن کی تدوین بہت ہی ہوشیاری سے کی گئی ہے۔ لیکن ممالک حارّہ کے دیگر تمدنوں کی بابت جو کچھ بھی ہم کو معلوم ہے وہ اُن خیالات کی تائید و تصدیق کرتا ہے جو میں نے مناظر فطرت سے منسوب کیے ہیں وسطی امریکہ میں بہت کچھ کھود کھاد کی گئی ہے اور جو چیزیں وہاں برآمد ہوئی ہیں وہ ثابت کرتی ہیں کہ ہندوستان کی طرح وہاں بھی ملکی مذہب ایک سلسلہ تھا کامل اور بے پناہ خوف و دہشت کا۔ نہ وہاں نہ مکسیکو میں۔ نہ پیرو میں۔ اور نہ مصر میں۔ لوگوں نے اپنے دیوتاؤں کو انسانی شکلوں میں متشکل کرنا یا اُنھیں صفات انسانی سے متصف بنانا چاہا۔ اُنکے مندر بھی بڑی بڑی عمارتیں ہیں جو اکثر اعلیٰ درجے کی صنعت و ہنرمندی سے تعمیر کی گئی ہیں۔ لیکن اُنسے صاف صاف یہ خواہش ٹپک رہی ہے کہ وہ طبیعتِ انسانی کو مرعوب اور ہیبت زدہ بنانا چاہتی ہیں اور

یہ عجیب حیرت انگیز تقابل اُن چھوٹی چھوٹی اور سبک عمارتوں سے پیش کرتی ہیں جو اہل یونان نے اپنے اغراض مذہبی کے لیے تعمیر کی تھیں۔ اس طور سے ہم دیکھتے ہیں کہ طرز تعمیر میں بھی یہی اصول اپنا جلوہ دکھا رہا ہے۔ یعنی ممالک حارّہ کے تمدن کے مہیب خطرات ایک نا محدود شے کا تصور پیدا کرتے تھے اور یورپ کے تمدن کا خطرات سے خالی ہونا ایک محدود شے کا تصور پیدا کرتا تھا۔ اگر اس بڑے اختلاف و تبایُن کے نتایج کا کھوج لگا یا جائے تو اس بات کا بیان کرنا ضروری ہوگا کہ ایک نا محدود۔ ایک خیالی ایک ترکیبی۔ اور ایک قیاسی شے کے تصورات کس طرح سے ملے ہوے ہیں اور وہ کس قدر عکس ہیں ایک محدود۔ ایک تشکیکی۔ ایک تحلیلی اور ایک استقرائی شے کے تصورات سے۔ لیکن اگر میں اِس کی کامل تشریح کرنا چاہوں گا تو مجھے اِس مقدمہ کتاب کی حد سے تجاوز کرنا پڑے گا اور غالباً یہ کوشش میرے اپنے مبلغ علم سے آگے بڑھ جائے گی۔ اور اب مجھے لازم ہے کہ یہ جو ایک نا مکمل خاکہ میں نے کھینچا ہے اُسے پڑھنے والے کی عقل سلیم پر چھوڑ دوں مجھے یقین ہے کہ اس نا مکمل خاکہ سے آیندہ غور و خوض کرنے کا مواد معلوم ہو جائیگا اور (اگر میں یہ اُمید کر سکوں تو) شاید مورخوں کے واسطے ایک نیا میدان سامنے ہو جاے گا کیونکہ اُنھیں (تاریخ لکھتے وقت) یہ بات یاد آجاے گی کہ ہر مقام پر قدرت کا ہاتھ ہمارے اوپر ہے اور یہ کہ طبیعتِ انسانی کی تاریخ صرف اسی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ اُسے مادّی دُنیا کی تاریخ اور اُس کے مظاہر سے مربوط اور پیوند کرتے رہیں۔

مقدمات الطبیعات - مولفہ عالیجناب مرزا مہدی خاں صاحب کوکب - ایم - آر - ایس - ایم - ایم - آر - اے - ایس ای - ایف - جی - ایس، سابق ناظم محکمۂ مردم شماری ریاست حیدر آباد دکن - مرزا صاحب موصوف کو دولت آصفیہ نے خاص علوم طبیعیہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کیلیے یورپ بھیجا تھا یہ لاجواب تالیف جو اُردو زبان میں اپنی صنف کی پہلی ہی کتاب ہے - تکمیل تعلیم کے بعد عرصہ تک اس فن کے مطالعے اور کامل غور و خوض کا نتیجہ ہے جس کی اہل ملک کو پوری قدر کرنا چاہیے - محترم مؤلف چونکہ قدیم اور جدید علوم و السنہ کے یکساں طور پر ماہر ہیں اس وجہ سے اصطلاحات علمیہ کا ترجمہ نہایت خوبی ہی کیا ہے اور اُن اصطلاحات کی ایک فرہنگ بھی کتاب کے آخر میں دے دی گئی ہے - قیمت عہ مجلد عا،

فلسفۂ اجتماع - مسٹر عبد الماجد بی اے مصنف فلسفۂ جذبات نے علم النفس کی یہ دوسری کتاب لکھی ہے فلسفۂ جذبات میں جہاں افراد انسانی کے نفسیاتی ادراک اور اس کے زیر اثر جو افعال سرزد ہوتے ہیں اُن سے بحث کی گئی تھی وہاں فلسفۂ اجتماع میں اُن کیفیات و حیات نفس کا بیان ہے جو مجامع اور اُن کے اثرات سے پیدا ہوتی ہیں - اسمیں فاضل مصنف نے بڑی خوبی و امثال کے ساتھ ان تعلقات کا ذکر کیا ہے جو لیڈروں اور عوام میں پایا جاتا ہے قیمت عہ،

البیرونی - اس میں مسٹر سید حسن برنی بی - اے (علیگ) نے بڑی کوشش و جستجو سے علامہ ابو ریحان بیرونی کے حالات جمع کیے ہیں اور اس علامۂ اجل کی سوانحعمری مرتب کر کے اہل ملک کو کتاب الہند کے مصنف کی زندگی کے اہم واقعات اور اُسکے کمال ذوق علمی اور طالبعلمانہ تجسس و تلاش سے آشنا کر دیا ہے جسکے مطالعہ سے اس بات کا کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ کسی علم و فن کے حاصل کرنے کے لیے کس درجہ استقلال، ہمت، اور جفاکشی کی ضرورت ہے - بیرونی کی حقیقی عظمت کا زیادہ احساس اُردو خواں اصحاب کو اُسوقت ہو سکے گا جب کتاب الہند کا ترجمہ ہماری زبان میں ہو جائیگا مگر نسبتہً اس مختصر سوانحعمری اور تبصرہ سے بھی ایک حد تک اس جلیل القدر محقق کے مرتبے اور مدارج کمال کا اندازہ ہو جائیگا - قیمت مجلد عہ

مشاہیر یونان و رُومہ - یعنی حکیم پلوٹارک یونانی کی شہرۂ آفاق و لاجواب کتاب ہے لل لایوز کا اُردو ترجمہ (جلد اول) جس میں یونان و روما کے اولوالعزم مدبرین کے سوانحی حالات اور اُن کے بیش بہا خیالات درج کر کے ازراہ تبصرہ ایک سے دوسرے کا مقابلہ کر کے دکھایا گیا ہے - یورپ میں یہ کتاب اس درجہ عظمت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے کہ بڑے بڑے فلسفی، شاعر اور مدبرین سلطنت اس سے استفادہ کرنے پر فخر و ناز کا اظہار کرتے ہیں - انگریزی زبان میں جس شخص نے اس کا ترجمہ کیا اُسے برٹش گورنمنٹ نے اسکے صلے میں نائٹ کا خطاب عطا کیا - اور حقیقت میں یہ کتاب ہے بھی اسی قابل کہ اسکی عزت و عظمت کی جائے کیونکہ یہ منجملہ اُن چند کتابوں کے ہے جنھوں نے مغرب کو قعر مذلت سے نکال کر اوج کمال پر پہونچا دیا - آپ اس کتاب میں حب وطن، کامل ایثار بے نفسی جاں نثاری اور اولوالعزمی کی ایسی زندہ اور سچی تصویریں دیکھیں گے کہ اُنکو پڑھ کر انسان بیخود ہو جاتا ہے اور اُسکا دل بے اختیار سچے جذبات سے اُبلنے لگتا ہے" "دُنیا میں سیکڑوں آدمی ایسے گزرے ہیں کہ اس کتاب نے اُنپر جادو کا اثر کیا ہے اور اسکی بدولت اُنھیں حیاتِ جاودانی حاصل ہوئی ہے" - سید ہاشمی صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ جس جانکاہی، شوق و محنت سے کیا ہے اُسکے لحاظ سے فاضل ادیب جناب مولوی عبد الحق صاحب بی اے کی رائے ہے کہ "یہ ترجمہ بلحاظ طرز بیان، سلاست، اظہار مطالب انگریزی ترجمے پر فوقیت رکھتا ہے" - لایق مترجم نے کتاب کے شروع میں ایک تاریخی مقدمہ بھی اضافہ کیا ہے جو گویا یونان و روما کی قدیم تاریخ کا ملخص ہے اور یونان و روما کی قدیم سلطنتوں کے رنگین نقشوں سے بھی کتاب مزین کی گئی ہے - قیمت عما مجلد سے،

دار الاشاعت انجمن ترقی اُردو - چوک - لکھنؤ سے طلب فرمائیے

دریاے لطافت - یہ لاجواب کتاب مشہور استادانِ فن سید انشاء اللہ خاں انشا اور مرزا قتیل کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے جو ایک دفعہ پہلے بھی مطبع آفتاب عالمتاب مرشدآباد میں طبع ہوئی تھی مگر اب نہیں ملتی تھی۔ انجمن ترقی اُردو نے اب مناسب ترمیمات و اختصار کے بعد اسے پھر شایع کرایا ہے۔ اُن تمام اصحاب کے لیے جن کو اُردو زبان کے متعلق تحقیقات یا اپنی معلومات میں اضافہ کرنا ہو یہ نہایت عمدہ رہنما ہوگی اور اُردو کے کسی کتب خانے کو اس کتاب سے خالی نہ رہنا چاہیے قیمت ۱۲؍ مجلد عہ

تاریخ تمدن - یعنی سرہنری طامس بکل کی مشہور تصنیف ہسٹری آف سویلزیشن کا اُردو ترجمہ۔ فلسفۂ تاریخ کی یہ بہترین کتاب ہے جس میں تاریخ کے اصول اسی طرح مرتب کیے گئے ہیں جیسے طبعیات کے اصول مرتب ہو چکے ہیں۔ قیمت عہ

خلافت اندلس - یعنی عربوں کی ہشت صدسالہ حکومت اندلسی کی تاریخ مولفۂ عالیجناب نواب ذوالقدر جنگ بہادر ایم اے بیرسٹرایٹ لا سابق جج ہائی کورٹ ریاست حیدرآباد دکن۔ جس کے دو سو سیٹ موصوف نے ازراہ ہمدردی انجمن ترقی اُردو کو عنایت فرمائے ہیں قیمت ہر سہ جلد للعہ مجلد صہ

ڈومیسٹک اکانومی - اس کی چھوٹی چھوٹی چار جلدوں میں مفتی انوار الحق صاحب ایم اے منشی فاضل ڈائرکٹر صیغۂ تعلیم ریاست بھوپال نے وہ سب اصول زندگی اور متعلقہ ضروریات بیان کردی ہیں جو لڑکیوں کو ابتدائے زمانۂ تعلیم میں اگر پڑھادی جائیں تو ہنرمند بیٹی۔ سلیقہ شعار بیوی - اور شفیق ماں بننے کی اُن میں پوری قابلیت پیدا ہو جائے گی۔ ہر گھر میں اس کتاب کا پڑھانا ضروری ہے۔ قیمت ہر حصہ کی ۳؍ مجموعًا ۱۲؍

اُردو کا نیا قاعدہ - انجمن ترقی اُردو کی طرف سے ایک کمیٹی اس غرض سے منعقد ہوئی تھی کہ موجودہ قاعدوں میں جو نقایص ہیں اُن کو رفع کرکے ایک ایسا قاعدہ ترتیب دیا جائے جس کا پڑھانا ہر طرح طلبا کی ذہنی و دماغی ترقی و تعلیم کے لیے مفید ہو۔ چنانچہ کئی سال کی محنت اور بہت سے اصحاب کی منفردہ و متحدہ مساعی کا اب نتیجہ ظاہر ہوا ہے۔ جو آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ تمام بہی خواہان ملک و قوم کو چاہیے کہ رائج الوقت قاعدوں کے بجائے اس قاعدہ کو اپنے یہاں ذریعۂ تعلیم بنائیں جس کے بیش بہا منافع سے اُنکی آئندہ نسلیں متمتع ہو سکیں گی۔ قیمت ۲؍

کلید قاعدہ - انجمن کا جدید قاعدہ جن اصولوں پر مرتب کیا گیا ہے اس کی توضیح کے لیے اور نیز معلمین کی اس بارے میں رہنمائی کرنے کی غرض سے کہ اس قاعدہ میں کن باتوں کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے یہ ’کلید‘ مدون کی گئی ہے - جو انجمن کا قاعدہ پڑھانے والوں کے لیے نہایت کارآمد ہوگی قیمت ۴؍

علم المعیشت - یعنی اصول اکنامکس یا پولٹیکل اکانومی (اقتصادیات) پر اُردو میں سب سے پہلی اور مستند کتاب مصنفہ مسٹر محمد الیاس برنی ایم اے ایل ایل بی (علیگ) پروفیسر اکنامکس علی گڑھ کالج - اقتصادیات کی واقفیت یوں تو ہر صورت میں نہایت ضروری اور کارآمد ہے، مگر مفلس و درماندہ قوم و ملک کے باشندوں کے واسطے دنیا کے تمام علوم سے زیادہ اسی کا مطالعہ لازمی اور سودمند ہوگا کیونکہ وقت - فکر اور روپے کا مصرف صحیح بتانے کے سوا موجودہ دور مسابقت میں اس بات کا مناسب معیار قائم کرنے میں بھی اسی سے مدد ملتی ہے کہ دنیا کے مختلف شعبہ جات میں کم سے کم صرف سے زیادہ سے زیادہ آمدنی کیسے حاصل ہو سکتی ہے، اور نیز یہ سکھاتی ہے کہ دولت مندی کا حقیقی مفہوم کیا ہے - حجم زائد از ۵۰۰ صفحے خوشنما جلد - قیمت سے

(محصول ڈاک ہر صورت میں ذمۂ خریدار)

دارالاشاعت انجمن ترقی اُردو چوک - لکھنؤ سے طلب فرمائیے